داستان خواجہ بخارا کی

لیونید سولوویف

ترجمہ: حبیب الرحمن

داستان خواجہ بخارا کی

لیونید سولوویف

ترجمہ: حبیب الرحمن

دارالاشاعت ترقی ماسکو

ڈیزائن: کراسنی

بشکریہ اردو ویب

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گزار ہو گا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔۔۔

اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔۔۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱ ماسکو، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard Moscow, USSR

فہرست

ہمیں یہ کہانی ابو عمر احمد ابن

محمد سے ملی جس کو اس نے محمد

ابن علی ابن رفع سے سنا تھا جو علی

ابن عبد العزیز کا حوالہ دیتا ہے جو

ابو عبید القاسم ابن سلام کا حوالہ دیتا

ہے جس نے اس کو اپنے اُستادوں کی

زبانی سن کر بیان کیا تھا جن میں سے

آخری استاد عمر ابن الخطاب اور ان

کے بیٹے عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو

سند کے طور پر پیش کرتا ہے

ابن حزم ”قمری کا ہار“

اقتباس

میں اس کتاب کو اپنے دوست مومن عادلوف کی پاکیزہ اور لافانی یاد سے موسوم کرتا ہوں جو ۱۸ اپریل ۱۹۳۰ کو ایک دشمن کی مہلک گولی کا شکار ہوئے۔

ان میں خواجہ نصر الدّین کی بہت سی خصوصیات تھیں۔ عوام کے لیے بے لوث ایثار، ہمت، شریفانہ فراست اور ایماندارانہ ذکاوت۔ میں نے یہ کتب لکھتے وقت رات کے سناٹے میں کئی بار ایسا محسوس کیا کہ جیسے عادلوف کا سایہ میرے پاس کھڑا ہے اور میرے قلم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ پہاڑی قشلاق (گاؤں) نانائی میں ان کا انتقال ہوا اور کانی بادم میں وہ

آرام کر رہے ہیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے میں ان کی قبر پر گیا تھا۔ بہار کی گھاس اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر کے چاروں طرف بچے کھیل رہے تھے اور وہ ابدی نیند سو رہے تھے۔ وہ میرے دل کی پکار نہیں سن رہے تھے۔۔۔

حصّہ اوّل

کہتے ہیں کہ ایک بیوقوف اپنے گدھے کی باگ ڈور سنبھالے چلا جارہا تھا۔ گدھا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

(شہرزاد کی ۳۸۸ویں رات)

۱

خواجہ نصرالدّین کی ۳۵ویں سالگرہ سڑک ہی پر ہوئی۔

دس سال سے زیادہ انہوں نے جلاوطنی میں گزارے تھے، شہر شہر، ملک ملک کی سرگردانی کرتے، سمندروں اور ریگستانوں کو پار کرتے۔ جہاں رات آجاتی سو جاتے۔ ننگی زمین پر کسی گڈریے کے چھوٹے سے الاؤ کے پاس کسی کھچاکھچ بھری ہوئی سرائے میں، جہاں تمام رات گرد آلود دُھندلکے میں اونٹ لمبی لمبی سانسیں لیتے، اپنے کو کھجلاتے اور گھنٹیاں بج اٹھتیں یا کسی دھوئیں اور کالک سے بھرے چائے خانے میں اِدھر اُدھر

لیٹے ہوئے سقوں، بھک منگوں، ساربانوں اور اسی طرح کے غریب لوگوں کے پاس جو پُو پھٹتے ہی شہر کے بازاروں اور تنگ سڑکوں کو اپنی پُر شور ہانک پکار سے بھر دیتے ہیں۔

بہت سی راتیں انہوں نے کسی امیر ایرانی عہدے دار کے حرم میں نرم ریشمی گدّوں پر دادِ عیش دے کر بھی گزاری تھیں جبکہ گھر کا مالک اپنے برقندازوں کو ساتھ لے کر سارے چائے خانوں اور کارواں سراؤں میں ملحد اور آوارہ گرد خواجہ نصرالدّین کی تلاش میں سرگرداں ہوتا تھا تاکہ اس کو پکڑ کر نوکیلے تیز چوبی ستون پر بٹھا سکے۔۔۔ کھڑکی کی جھلملی سے آسمان کی تنگ پٹّی دکھائی دیتی، ستارے مرجھا جاتے، نرم اور نم بادِ صبا صُبح کی آمد آمد کا اعلان کرتی ہوئی پتّیوں میں سرسراتی اور کھڑکی کی کگر پر قُمریاں خوشی سے کوکو کر کے چونچوں سے پَر صاف کرتیں۔ خواجہ نصرالدّین تھکی ہوئی حسینہ کو بوسہ دے کر کہتے:

"میرے دُرِّ بے بہا، الوداع۔ اب جانے کا وقت آ گیا۔ مجھے فراموش نہ کر دینا۔"

حسینہ اپنے سڈول بازوؤں کو اُن کی گردن میں حمائل کر کے التجا کرتی:

"ٹھہرو! کیا تم ہمیشہ کے لیے جُدا ہو رہے ہو؟ لیکن کیوں؟ اچھا سنو، آج رات کو میں اندھیرا پھیلتے ہی بڑھیا کو تمہیں لانے کے لیے پھر بھیجوں گی۔"

"نہیں، میں مدّتوں ہوئے یہ بات بھول چکا ہوں کہ ایک چھت کے نیچے دو راتیں کیسے گزاری جاتی ہیں۔ مجھے جانا ہی ہے۔ بڑی عجلت ہے۔"

"جانا کہاں ہے؟ کیا کسی دوسرے شہر میں تم کو ضروری کام ہے؟ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں نہیں جانتا۔ لیکن روشنی کافی پھیل چکی ہے۔ شہر کے پھاٹک کھُل چکے ہیں اور پہلے کارواں باہر نکل رہے ہیں۔ سن رہی ہو نا، اونٹوں کی

گھنٹیوں کی آواز؟ جب میں یہ آواز سنتا ہوں تو جیسے کوئی جن میرے پیروں میں سنیچر پیدا کر دیتا ہے اور میں نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔"

"اگر ایسا ہے تو جاؤ۔" ملول ہو کر حسینہ کہتی ہے۔ وہ اپنی لمبی لمبی پلکوں پر آنسوؤں کو چھپا نہیں پاتی۔ "لیکن جانے سے پہلے کم از کم اپنا نام تو بتاتے جاؤں۔"

"میرا نام؟ اچھا تو سُنو، تم نے یہ رات خواجہ نصر الدّین کے ساتھ بتائی ہے۔ میں خواجہ نصر الدّین ہوں، بے چینی پھیلانے اور نفّاق کے بیج بونے والا، ایسی ہستی جس کے سر پر بڑا انعام ہے۔ ہر روز نقیب عام جگہوں اور بازاروں میں میرے بارے میں اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ کل وہ تین ہزار تومان دے رہے تھے اور مجھے لالچ لگا کہ میں اس قیمت پر خود اپنا سر بیچ دوں۔ تم ہنس رہی ہو، میری پیاری۔ اچھا مجھے آخری بار اپنے ہونٹ چومنے دو۔ اگر میں تم کو تحفہ دے سکتا تو زمرّد دیتا لیکن زمرّد تو میرے پاس نہیں ہے۔ لو یہ ایک حقیر سا سفید پتھر بطور نشانی ہے!"

وہ اپنی پھٹی ہوئی قبا پہنتے ہیں جو الاؤں کی چنگاریوں سے جا بجا جلی ہوئی ہے اور چپکے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ دروازے پر کاہل اور بیوقوف خواجہ سرا پگڑی باندھے اور اوپر اٹھی ہوئی خمدار نوکوں والی جوتیاں پہنے، پڑا خرّاٹے لے رہا ہے۔ وہ محل کے سب سے بیش بہا خزانے کا لاپروا نگہبان ہے۔ آگے چل کر بھی قالینوں اور نمدوں پر پہرے دار خرّاٹے بھر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ننگے خنجروں کے تکئے بنا رکھے ہیں۔ خواجہ نصر الدّین پنجوں کے بل رینگتے اس طرح صاف بچ نکلتے ہیں جیسے ذرا دیر کے لیے وہ کوئی نظر نہ آنے والا چھلاوہ بن گئے ہیں۔

اور پھر ایک بار سفید پتھریلی سڑک ان کے گدھے کے تیز رفتار سموں کے نیچے گونجتی اور چنگاریاں دیتی ہے۔ نیلے آسمان سے سورج دنیا کو منوّر کر رہا ہے۔ خواجہ نصر الدّین اس سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔ شبنم آلود کھیتوں، ویران ریگستانوں میں جہاں ریت کے تودوں کے درمیان اونٹوں کی سفید ہڈیاں چمکتی ہیں، ہرے بھرے باغوں اور جھاگ دار دریاؤں، بے برگ

وبے گیاہ پہاڑیوں اور مُسکراتے ہوئے سبزہ زاروں میں خواجہ نصر الدّین کے نغمے گونجتے ہیں۔ وہ پیچھے ایک نظر ڈالے بغیر، جو کچھ پیچھے چھٹ گیا ہے اس پر افسوس کئے بغیر اور پیش آنے والے خطرے سے ڈرے بغیر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن جو شہر انہوں نے ابھی ابھی چھوڑا ہے اس میں ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ ملا اور عمائدین کے چہرے ان کا نام سنتے ہی غصّے سے سُرخ ہو جاتے ہیں۔ سقّے، ساربان، جولاہے، ٹھٹھیرے اور گھوڑوں کی کاٹھیاں بنانے والے راتوں کو چائے خانوں میں جمع ہو کر خواجہ نصر الدّین کے بارے میں ایسی کہانیوں سے ایک دوسرے کا دل بہلاتے ہیں جن میں ہمیشہ خواجہ کی جیت ہوتی ہے۔ حرم کی افسردہ حسینہ سفید پتھر کو غور سے دیکھتی رہتی ہے اور اپنے مالک کی آواز سنتے ہی اس کو ایک سیپ کے صندوقچے میں چھپا دیتی ہے۔

”اف!“ ہانپتا اور غرّاتا ہوا موٹا عہدے دار اپنی زربفت کی قبا اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”اس کمبخت بدمعاش خواجہ نصر الدّین نے تو ہم سب کو عاجز کر دیا ہے۔ اس نے سارے ملک میں ہنگامہ اور تہلکہ مچا رکھا ہے۔ آج ہی مجھے اپنے پرانے دوست صوبہ خراساں کے لائق گورنر کا خط ملا ہے۔ سوچو تو ذرا، اس بد ذات خواجہ نصر الدّین نے ان کے شہر میں مشکل سے قدم رکھا ہی ہو گا کہ آہن گروں نے یک دم محاصل دینا بند کر دیے، سرائے والوں نے پہرے داروں کو مُفت کھلانے سے انکار کر دیا۔ اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اسلام کو ناپاک کرنے والے، اس چور، ولد الزنا نے یہ جرأت کی کہ گورنر کے حرم میں داخل ہو کر اُن کی محبوب بیوی کو ورغلایا۔ سچ مچ دنیا میں ایسا شریر آدمی کبھی نہیں ہوا تھا! افسوس کہ ناہنجار نے میرے حرم کا رُخ نہیں کیا ورنہ اس کا سر اس وقت بڑے چوک پر کسی بانس سے لٹکتا ہوتا۔“

حسینہ پُراسرار انداز سے مُسکراتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

اس دوران میں خواجہ نصر الدّین کے گدھے کے تیز رفتار سموں سے سڑک گونجتی اور چنگاریاں دیتی ہے اور خواجہ کے نغموں کی آواز اس میں گھل مل جاتی ہے۔

اس دس سال میں نہ جانے کہاں کہاں سر گرداں رہے۔ بغداد، استنبول، طہران، بخشی سرائے، اچمی ادزین، طفلس، دمشق اور ترپیبزوند۔ وہ ان شہروں سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے شہروں کو جانتے تھے اور ہر جگہ اپنی ناقابلِ فراموش یادگاریں چھوڑی تھیں۔

اب وہ اپنے شہر، بخارا شریف واپس جا رہے تھے۔ ان کو اُمّید تھی کہ وہ اپنی لامحدود آوارہ گردی ترک کر کے کسی دوسرے نام سے سُکھ چین سے وہاں رہ سکیں گے۔

۲

انہوں نے سوداگروں کے ایک بڑے کارواں کے ساتھ جس میں وہ شامل ہو گئے تھے بخارا کی سرحد میں قدم رکھا اور سفر کے آٹھویں دن بہت دور سامنے دُھندلکے میں اس بڑے اور مشہور شہر کے جانے پہچانے مینار دیکھے۔

پیاس اور گرمی سے پریشان ساربانوں نے ایک زور دار نعرہ بلند کیا اور اونٹوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور جلدی کی ضرورت تھی تاکہ پھاٹک بند ہونے سے پہلے بخارا میں داخل ہوا جا سکے۔ خواجہ نصر الدّین کارواں میں سب سے پیچھے، گرد کے گھنے اور بھاری بادل

میں لپٹے چل رہے تھے۔ یہ تو ان کی اپنی پاک گرد تھی جس کی مہک دوسرے دور دراز ملکوں کی گرد سے کہیں اچھی تھی۔ چھینکتے کھانستے ہوئے وہ اپنے گدھے سے برابر کہہ رہے تھے:

"دیکھ، ہم آخر کار گھر پہنچ گئے نا! خدا کی قسم یہاں کامیابیاں اور مسرتیں ہماری منتظر ہیں۔"

کارواں ٹھیک اس وقت شہر کی فصیل کے قریب پہنچا جب پہرے دار پھاٹک بند کر رہے تھے۔ "خدا کے لیے ٹھہریے!" کارواں کا سردار ایک طلائی سِکّہ دکھا کر دور ہی سے چلّایا۔ لیکن پھاٹک بند ہو چکے تھے، زنجیریں جھنکار کے ساتھ چڑھا دی گئیں اور میناروں پر نگہ بانوں نے توپوں کے مورچے سنبھال لیے۔ تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے، دُھندلکے آسمان میں گلابی شفق مرجھا گئی، باریک ہلال بہت صاف اُبھر آیا اور شام کی خاموشی میں بے شمار میناروں سے مؤذنوں کی تیز اور پُرسوز آوازیں مومنوں کو مغرب کی نماز کی دعوت دینے لگیں۔

سوداگر اور ساربان نماز کے لیے جھک گئے اور خواجہ نصرالدّین چپکے سے اپنے گدھے کو لے کر ایک کنارے چلے گئے۔

"یہ سوداگر تو بجا طور پر خدا کے شکر گزار ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "انہوں نے آج دن میں ڈٹ کر کھانا کھایا ہے اور رات کو بھی کھائیں گے لیکن میں نے اور تو نے، میرے وفادار گدھے، نہ تو دن کو کھانا کھایا ہے اور نہ رات ہی کو کھائیں گے۔ اگر اللہ ہمارے شکرانے کا خواہاں ہے تو وہ مجھ کو ایک قاب پلاؤ اور تجھ کو ایک گٹھا گھاس بھیج دے۔"

انہوں نے سڑک کے کنارے ایک درخت سے گدھے کو باندھ دیا اور خود بھی اس کے برابر ننگی زمین پر پتھر کا تکیہ بنا کر لیٹ گئے۔ آسمان کی اندھیری وسعتوں میں جھانکتے ہوئے انہوں نے ستاروں کا جھلملاتا ہوا جال دیکھا۔ وہ ستاروں کے ہر جھرمٹ سے بخوبی واقف تھے۔ ان دس برسوں میں انہوں نے نہ جانے کتنی بار کھلے آسمان کو دیکھا تھا۔ ان کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خاموش غور و فکر کے ان دانش مندانہ

خیالات نے ان کو امیروں سے بھی زیادہ امیر بنا دیا ہے۔ چاہے امیر آدمی سونے کے ظروف میں ہی کھانا کیوں نہ کھاتا ہو پھر بھی وہ لازمی طور پر رات چھت کے نیچے گزارتا ہے۔ اس لیے وہ نصف شب کے سنّاٹے میں خنک، نیلگوں، ستاروں سے بھرے ہوئے دُھندلکے کے درمیان زمین کی پرواز سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

اس دوران میں شہر کی دندانے دار فصیل کے باہر کارواں سراؤں اور چائے خانوں میں بڑے بڑے کڑاہوں کے نیچے آگ روشن ہو چکی تھی اور بھیڑیں جو ذبح ہونے کے لیے کھینچی جا رہی تھیں بے حد غم آلود آواز میں ممیا رہی تھیں۔ تجربہ کار خواجہ نصر الدّین نے پہلے ہی سے سوچ کر اپنے رات کے آرام کا انتظام ایسی جگہ کیا تھا جو ہوا کے رُخ کے خلاف تھی تا کہ کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو اُن کو نہ چھیڑ سکے۔ بخارا کے قوانین کو اچھی طرح جانتے ہوئے انہوں اپنی تھوڑی سی جمع پونجی بچا لی تھی تا کہ کل وہ شہر کے پھاٹک پر محصول ادا کر سکیں۔

کافی دیر تک وہ کروٹیں بدلتے تھے لیکن ان کو نیند نہ آئی۔ اس بے خوابی کا سبب بھوک نہ تھی بلکہ تلخ خیالات تھے جو اُن کو بے چین اور پریشان کر رہے تھے۔

ان کو اپنے وطن سے محبّت تھی۔ وہ اس کو سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ یہ سانولے تپے ہوئے چہرے پر سیاہ داڑھی رکھنے والا چالاک اور زندہ دل انسان جس کی صاف آنکھوں سے شرارت کی جھلک تھی، اپنی پھٹی پرانی قبا، داغ دھبّوں سے بھری ٹوپی اور خستہ حال جوتے پہنے بخارا سے جتنا ہی زیادہ دور آوارہ گردی کرتا رہا اتنا ہی زیادہ وطن سے اس کا پیار بڑھتا چلا گیا اور وطن اس کو یاد آتا گیا۔ جلاوطنی کے زمانے میں اس کو ان تنگ سڑکوں کی یاد آتی جہاں دونوں طرف کی کچی دیواروں سے رگڑ کھائے بغیر ارابے نہیں گزر سکتے تھے، ان بُلند میناروں کی جن کی روغن کی ہوئی اینٹوں کی ڈیزائن دار چوٹیاں طلوع و غروب آفتاب کے وقت عکس سے شعلہ ور ہو جاتی تھیں اور ان قدیم اور متبرّک چنار کے درختوں

کی جن کی شاخوں میں سارسوں کے بڑے بڑے کالے گھونسلے جھولتے تھے۔ اس کو حور کے سرسراتے ہوئے درختوں کے سائے میں نہروں کے کنارے چہل پہل والے چائے خانے، بہت زیادہ گرم باورچی خانوں میں دھوئیں اور کھانے کی خوشبو اور بازاروں کی رنگین گہما گہمی یاد آتی۔ اس کو اپنے وطن کی پہاڑیاں اور جھرنے، گاؤں، کھیت، چراگاہیں، ریگستان ایک ایک یاد آتے اور بغداد یا دمشق میں جب وہ اپنے کسی ہم وطن کو دیکھتا تو وہ اس کی ٹوپی یا لباس کی وضع قطع سے پہچان لیتا اور ایک لمحہ کے لیے خواجہ نصر الدّین کے دل کی دھڑکن اور سانس کی آمد رفت رک جاتی۔

واپسی پر خواجہ نے اپنے ملک کو اس سے زیادہ بدحال پایا جیسا کہ چھوڑا تھا۔ بُڈّھے امیر کا زمانہ ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ پچھلے آٹھ سالوں میں نئے امیر نے بخارا کو تقریباً تباہ کر دیا تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے ٹوٹے پھوٹے پُل، سورج سے جھلسی، بری طرح سے بوئی ہوئی گیہوں اور جَو کی کمزور فصلیں

اور آبپاشی کی خشک نالیاں دیکھیں جو گرمی سے سوکھ کر چٹخ گئی تھیں۔ کھیتوں میں جھاڑ جھنکار اُگے تھے اور ویران تھے۔ پانی کی کمیابی سے باغات خشک پڑے تھے۔ کسانوں کے پاس نہ تو اناج تھا اور نہ مویشی، سڑکوں پر فقیروں کی قطاریں ان لوگوں سے بھیک مانگتی نظر آتی تھیں جو خود انہی کی طرح محتاج تھے۔

نئے امیر نے ہر گاؤں میں سپاہیوں کا ایک ایک دستہ تعینات کر دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس کے مُفت کھانے پینے کی ذمّہ داری گاؤں والوں پر ہے۔ اس نے بہت سی مسجدوں کی بنیاد ڈلوادی اور پھر حکم دیا کہ عام لوگ ان کو تکمیل تک پہنچائیں۔ نیا امیر بہت زاہد و پاکباز تھا اور سال میں دو بار انتہائی مقدس اور پاکیزہ بزرگ شیخ بہاالدّین کے مزار کی زیارت میں ناغہ نہیں کرتا تھا جو بخارا کے قریب ہی تھا۔ چار رائج ٹیکسوں میں اس نے تین اور محصولوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس نے ہر پُل پر چُنگی ناکہ بنوادیا تھا، تجارتی اور قانونی کاروائیوں کے لیے ٹیکس پر اضافہ کر دیا تھا اور گھٹیا سِکّے بنوائے

تھے۔۔۔ حرفتیں تباہ ہو رہی تھیں اور تجارت پر زوال آیا ہوا تھا۔ خواجہ نصر الدّین کے لیے اپنے پیارو طن کو واپسی خوش کُن نہ تھی۔

صُبح سویرے مؤذنوں کی اذان پھر تمام میناروں سے گونجی۔ پھاٹک کھل گئے اور کارواں گھنٹیوں کی گونج میں آہستہ آہستہ شہر میں داخل ہوا۔

پھاٹک سے گزر کر کارواں ٹھہر گیا۔ سڑک کو پہرے داروں نے روک رکھا تھا۔ وہ بڑی تعداد میں تھے۔ کچھ تو اچھے کپڑے اور جوتے پہنے تھے اور کچھ جن کو ابھی تک امیر کی ملازمت میں موٹے ہونے کا موقع نہیں ملا تھا ننگے پیر اور نیم عریاں تھے۔ وہ شور مچا کر ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے اور لوٹ مار کی تقسیم کے لیے پہلے سے جھگڑنے لگے تھے۔ آخر کار ٹیکس کلکٹر صاحب ایک چائے خانے سے بر آمد ہوئے، لحیم شحیم، چہرے پر نیند کے آثار، ریشمی قبا پہنے جس کی آستینوں پر چکنائی کے داغ تھے، ننگے پیر سلیپروں میں ڈال لیے تھے۔ پھولا ہوا چہرہ بد اعتدالیوں اور بد

کاریوں کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس نے سوداگروں پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالی اور بولا:

"خوش آمدید، سوداگرو! اللہ آپ کو کاروبار میں کامیاب کرے! یہ جان لیجئے کہ امیر کا حکم ہے کہ اگر کوئی بھی اپنے سامان کی چھوٹی سی چیز بھی چھپائے گا تو اس کو ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔"

حیران و پریشان سوداگروں نے خاموشی سے اپنی خضاب لگی ہوئی داڑھیوں کو سہلایا۔ ٹیکس کلکٹر پہرے داروں کی طرف مڑا جو بے چین ہو رہے تھے اور اپنی موٹی انگلیوں سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی پہرے دار ہانکتے پکارتے اونٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ بھیڑ بھاڑ اور عجلت میں ایک دوسرے سے دھکم دھکا کر کے انہوں نے اپنی تلواروں سے بالوں کے رسے کاٹ دیے اور شور مچاتے ہوئے گانٹھوں کو کاٹ کر کھول دیا۔ سڑک پر زربفت، ریشم اور مخمل کے کپڑے، مرچ، چاء، عنبر کے باکس، گلاب کے قیمتی عطر کے کنٹر اور تبّت کی دوائیں پھیل گئیں۔

خوف نے سوداگروں کی زبان میں قفل لگا دیا تھا۔ دو منٹ میں معائنہ ختم ہو گیا۔ پہرے دار اپنے افسر کے پیچھے صف آرا ہو گئے، ان کی قبائیں پھولی ہوئی تھیں۔ اب سامان اور شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت کے لیے ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔ خواجہ نصر الدّین کے پاس کوئی تجارتی سامان نہ تھا اور ان کو صرف داخلے کا ٹیکس ادا کرنا تھا۔

"تم کہاں سے آ رہے ہو اور کس کام سے؟" ٹیکس کلکٹر نے دریافت کیا۔

محرّر نے کلک کا قلم دوات میں ڈبویا اور خواجہ نصر الدّین کا بیان رجسٹر میں قلم بند کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"حضور عالی، میں ایران سے آ رہا ہوں۔ یہاں بخارا میں میرے کچھ عزیز رہتے ہیں۔"

"اچھا۔" ٹیکس کلکٹر بولا۔ "تو تم اپنے عزیزوں سے ملنے آئے ہو۔ اس صورت میں تمہیں ملاقاتی کا محصول ادا کرنا ہو گا۔"

"لیکن میں ان سے ملاقات کرنے تھوڑی ہی آیا ہوں۔" خواجہ نصر الدّین نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"کام سے!" ٹیکس کلکٹر نے زور سے کہا اور اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ "تب تو تم ملاقات اور کام دونوں کے لیے آئے ہو۔ ملاقاتی کا ٹیکس ادا کرو، کام کا ٹیکس ادا کرو اور اس خدا کی راہ میں مسجدوں کی آرائش کے لیے عطیہ دو جس نے تم کو راستے میں رہزنوں سے محفوظ رکھا۔"

"اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ اب مجھے محفوظ رکھتا کیونکہ رہزنوں سے بچنے کی تدبیر تو میں خود کر سکتا تھا۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا لیکن اپنی زبان کو روکے رہے کیونکہ انہوں نے حساب لگایا کہ اس بات چیت کا ہر حرف ان کو دس تانگے سے زیادہ کا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی پیٹی کھولی اور پہرے داروں کی گھورتی ہوئی حریصانہ آنکھوں کے سامنے شہر میں داخلے کا ٹیکس، مہمان ٹیکس، کاروباری ٹیکس اور مسجدوں کی آرائش کے لیے عطیہ

کی رقم گنی۔ ٹیکس کلکٹر نے گھور کر پہرے داروں کو دیکھا جو ہٹ گئے۔ محرّر اپنی ناک رجسٹر میں گھسیڑے کلک کے قلم سے لکھتا رہا۔

تمام محاصل ادا کرنے کے بعد خواجہ نصر الدّین روانہ ہی ہونے والے تھے کہ ٹیکس کلکٹر نے دیکھ لیا کہ کچھ سکے ان کی پیٹی میں باقی رہ گئے ہیں۔

"ٹھہرو!" اس نے حکم دیا۔ "اور تمہارے گدھے کا ٹیکس کون ادا کرے گا؟ اگر تم اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہے ہو تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ گدھا بھی اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہا ہے۔"

"دانا افسر، آپ بجا فرماتے ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے اپنی پیٹی پھر سے کھولتے ہوئے بڑی خاکساری سے کہا۔ "واقعی، بخارا میں میرے گدھے کے عزیزوں کی بڑی اکثریت ہے ورنہ جیسا انتظام یہاں ہے اس سے تو آپ کے امیر کو کب کا تخت سے اتار دیا گیا ہوتا اور آپ، حضور، اپنے حرص کی وجہ سے بہت دن پہلے ہی چوبی ستون پر نظر آتے۔"

قبل اس کے کہ ٹیکس کلکٹر حواس مجتمع کر سکے خواجہ نصر الدّین اُچک کر اپنے گدھے پر آئے اور اس کو سرپٹ بھگاتے ہوئے قریب ترین گلی میں رفو چکر ہو گئے۔

"اور تیز، اور تیز۔" وہ برابر گدھے سے کہتے جا رہے تھے۔ "اور تیز، میرے وفادار گدھے، اور تیز ورنہ تیرے مالک کو ٹیکس میں اپنا سر دینا پڑ جائے گا۔"

خواجہ نصر الدّین کا گدھا بڑا سمجھدار تھا۔ وہ ہر بات سمجھتا تھا۔ اس کے لمبے کانوں نے شہر کے پھاٹک کا غل غپاڑہ اور پہرے داروں کی ہانک پکار سن لی تھی اس لیے وہ سڑک سے بے نیاز بھاگتا رہا اور اتنی تیز رفتاری سے کہ اس کا مالک کاٹھی سے چمٹا ہوا تھا، اس کے بازو گدھے کی گردن میں حمائل تھے اور اس کے پیر اوپر کھنچے ہوئے تھے۔ زور زور بھونکتے ہوئے کتّے ان کے پیچھے دوڑتے، مرغیاں چاروں طرف بکھر جاتیں اور راہی

دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو جاتے، اپنا سر ہلاتے اور ان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے۔

اس دوران میں شہر کے پھاٹک پر پہرے داروں نے مجمع میں اس بے دھڑک آزاد خیال کی تلاش کر رہے تھے۔ سوداگر مُسکرا رہے تھے اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہہ رہے تھے:

"یہ جواب تو بس خواجہ نصر الدّین ہی دے سکتے تھے۔"

دوپہر ہوتے ہوتے یہ قصّہ سارے شہر میں پھیل گیا۔ بازار میں تاجر چپکے چپکے گاہکوں سے بیان کرنے لگے جو اس کو دوسروں تک پہنچاتے اور سب ہنستے اور ہمیشہ یہ کہتے:

"یہ الفاظ تو خواجہ نصر الدّین ہی کو زیب دیتے ہیں۔"

کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ الفاظ خود خواجہ نصر الدّین کے ہیں، کہ وہی مشہور و معروف لاثانی خواجہ نصر الدّین اس وقت شہر میں بھوکا پیاسا، خالی

جیب آوارہ گردی کر رہا ہے اور اپنے عزیزوں اور پرانے دوستوں کو تلاش کر رہا ہے جو اس کو کھلاتے پلاتے اور پناہ دیتے۔

۳

خواجہ نصر الدّین کو بخارا میں نہ تو عزیز ملے اور نہ پرانے دوست ہی۔ ان کو اپنے باپ کا گھر تک نہ ملا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے، نہ تو وہاں وہ سایہ دار باغ تھا جہاں خزاں کے صاف دنوں میں سنہری پتّیاں ہوا میں سرسراتی تھیں اور پھل بھدا بھد زمین پر گرتے تھے، جہاں چڑیاں چہچہاتی تھیں اور سورج کی کرنیں خوشبودار گھاس پر ناچتی تھیں، جہاں شہد کی مکھیاں مُرجھاتے ہوئے پھولوں سے آخری خراج وصول کرتے ہوئے بھنبھناتی تھیں اور جہاں نہر گنگناتی ہوئی بہتی تھی اور لڑکے سے اپنی نہ ختم ہونے والی پراسرار کہانیاں کہتی رہتی

تھی۔۔۔ اب یہ جگہ ویران تھی، کوڑے کرکٹ، خاردار جھاڑیوں سے بھری ہوئی، آگ سے جلی ہوئی اینٹوں، گرتی ہوئی دیواروں اور سڑتی ہوئی چنائی کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ خواجہ نصر الدّین کو ایک چڑیا، ایک شہد کی مکھی تک نظر نہ آئی۔ صرف پتھروں کے ڈھیر کے نیچے سے جہاں انہوں نے ٹھوکر کھائی تھی اچانک ایک چکنی سی رسّی بر آمد ہوئی، سورج کی روشنی میں ہلکی سی چمکی اور پھر پتھروں کے نیچے غائب ہو گئی۔ یہ تھا سانپ، ایسی ویران جگہوں کا تنہا اور ڈراؤنا باسی جن کو ہمیشہ کے لیے انسان ترک کر دیتا ہے۔

خواجہ نصر الدّین بڑی دیر تک سر جھکائے کھڑے رہے۔ ان کے دل پر غم کے بادل چھا گئے تھے۔

سخت کھانسی کی آواز سے چونک کر وہ مڑے۔

ایک بڈھا غربت و فکر سے جھکا ہوا اس ویرانے کے پار راستے پر چلا آتا تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے اس کو روکا:

"بڑے میاں، رحمت ہو تم پر، خدا تم کو صحت و خوشحالی کا طویل زمانہ عطا کرے۔ مجھے بتاؤ کہ اس ویران جگہ پر کس کا مکان تھا؟"

"یہ کاٹھی بنانے والے شیر محمد کا گھر تھا۔" بُڈّھے نے جواب دیا۔ "میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ شیر محمد مشہور خواجہ نصر الدّین کا باپ تھا جس کے بارے میں، اے مسافر، تو نے یقیناً بہت کچھ سنا ہو گا۔"

"ہاں میں نے کچھ تو اس کے بارے میں سنا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ یہ کاٹھی بنانے والا شیر محمد جو مشہور خواجہ نصر الدّین کا باپ تھا کہاں چلا گیا اور اس کا خاندان کہاں ہے؟"

"اتنے زور سے نہیں، میرے بیٹے۔ بخارا میں لاکھوں جاسوس ہیں۔ اگر انہوں نے کہیں ہماری بات سُن لی تو بس مصیبتوں کا ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ شاید تم بہت دور سے آئے ہو اور نہیں جانتے کہ ہمارے شہر میں خواجہ نصر الدّین کا نام لینا سخت منع ہے۔ یہ بات آدمی کو جیل میں ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ ذرا قریب آجاؤ۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔"

اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے خواجہ نصر الدّین اس کے قریب جھک گئے۔

"یہ بُڈّھے امیر کے زمانے کی بات ہے۔" بُڈّھے نے کھانستے ہوئے شروع کیا۔ "خواجہ نصر الدّین کی جلاوطنی کو ڈیڑھ سال ہوئے تھے کہ بازار میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ ناجائز طور پر چھُپ کر بخارا واپس آ گئے ہیں اور یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور امیر کے خلاف ہجویہ نظمیں لکھ رہے ہیں۔ یہ افواہ امیر کے محل تک پہنچی اور پہرے داروں نے خواجہ نصر الدّین کی تلاش شروع کر دی لیکن وہ نہیں ملے۔ تب امیر نے حکم دیا کہ ان کے باپ، دو بھائیوں، چچا اور دور کے رشتے داروں اور دوستوں کو پکڑ لیا جائے۔ ان کو اس وقت تک اذیت پہنچانا تھی جب تک وہ خواجہ نصر الدّین کا پتہ نہ بتائیں۔ الحمد للہ ان کو اتنا ہمّت و استقلال حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنی زباں بند رکھی اور ہمارے خواجہ نصر الدّین امیر کے ہاتھ نہ آئے۔ لیکن ان کے باپ، کاٹھی بنانے والے شیر محمد اذیتوں سے چُور ہو کر جلد ہی اس دُنیا سے چل بسے اور ان کے عزیزوں اور دوستوں نے

امیر کے غیض و غضب سے بچنے کے لیے بخارا چھوڑ دیا اور پتہ نہیں کہ اب کہاں ہیں۔ پھر امیر نے حکم دیا کہ ان کے گھر تباہ کر دیے جائیں اور ان کے باغ تہس نہس کر دیے جائیں تا کہ خواجہ نصرالدّین کی یاد لوگوں کے ذہن سے یکسر محو ہو جائے۔"

"لیکن ان پر ظلم و ستم کیوں ڈھایا گیا؟" خواجہ نصرالدّین نے چیخ کر کہا۔ ان کے رُخساروں پر آنسو بہہ چلے لیکن بُڈّھے نے یہ آنسو نہیں دیکھے کیونکہ اس کی نگاہ کمزور تھی۔ "ان پر کیوں ظلم و ستم ڈھایا گیا؟ خواجہ نصر الدّین تو اس وقت بخارا میں تھے ہی نہیں۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں!"

"کوئی نہیں کہہ سکتا۔" بُڈّھے نے کہا۔ "خواجہ نصرالدّین کا جب جی چاہتا ہے آتے ہیں اور جب دل چاہتا ہے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہر جگہ ہیں اور کہیں نہیں ہیں، ہمارے خواجہ نصرالدّین کا جواب نہیں ہے!"

یہ کہہ کر بُڈّھا کراہتا اور کھانستا ہوا اپنے راستے پر ہو لیا۔ خواجہ نصر الدّین نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا اور گدھے کے پاس چلے گئے۔

انہوں نے گدھے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنا بھیگا ہوا چہرہ اس کی گرم اور بساہندی گردن سے دبا دیا۔

"آہ، میرے اچھے، سچّے دوست۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "دیکھو اب میرا اعزیز و قریب کوئی نہیں باقی رہ گیا۔ صرف تُو اس آوارہ گردی میں میرا مستقل اور وفادار ساتھی ہے۔"

جیسے گدھے نے اپنے مالک کے رنج و غم کو سمجھ لیا ہو، وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ بلکہ ایک تنکے کو جو اس کے ہونٹوں سے لٹک رہا تھا چبانا بند کر دیا۔

بہر حال ایک گھنٹے بعد خواجہ نصر الدّین اپنے غم پر قابو پا چکے تھے اور آنسو چہرے پر خُشک ہو گئے تھے۔

"کوئی پرواہ نہیں!" انہوں نے گدھے کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"کوئی پرواہ نہیں! مجھے بخارا میں ابھی تک فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ لوگ مجھ کو ابھی تک جانتے اور یاد کرتے ہیں۔ ہم کچھ دوست پا ہی لیں گے۔ اور امیر کے بارے میں ایسی نظمیں لکھیں گے کہ وہ اپنے تخت پر غصّے سے پھُول کر پھٹ ہی جائے گا اور اس کی گندی آنتیں محل کی آراستہ دیواروں کو داغ دار بنادیں گی۔ آ! میرے وفادار گدھے، آگے بڑھ!"

۴

سہ پہر کا سناٹے کا وقت تھا اور بڑی امس تھی ۔ گرد آلود سڑک، پتھروں، کچّی دیواروں اور باڑوں سے امس پیدا کرنے والی گرمی نکل رہی تھی اور خواجہ نصر الدّین کے چہرے کا پسینہ پونچھنے سے پہلے ہی خُشک ہو جاتا تھا۔

وہ جانی پہچانی سڑکوں، چائے خانوں اور میناروں کو دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے۔ دس سال کے اندر بخارا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کچھ خارشتئے کُتّے پانی کے حوضوں کے کنارے پڑے سو رہے تھے، اور ایک عورت ادا کے ساتھ جھُکی ہوئی اور اپنے نقاب کو سانولے ہاتھ

سے جس کے ناخون رنگے ہوئے تھے ایک طرف ہٹا کر تنگ گلے کی قلقل کرتی ہوئی صراحی میلے پانی میں ڈال رہی تھی۔

کھانا کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جائے، یہ ایک مسئلہ تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے کل سے تیسری بار اپنا پٹکا زور سے کسا۔

"کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا چاہیے۔" انہوں نے کہا۔ "آ، میرے وفادار گدھے، ذرا رُک کر سوچیں اور یہاں خوش قسمتی سے ایک چائے خانہ بھی ہے۔"

انہوں نے اپنے گدھے کی لگام کھول دی اور گھوڑے باندھنے کی جگہ کے پاس جو گھاس پڑی تھی چرنے کے لیے اسے چھوڑ دیا۔ پھر اپنی قبا کے دامنوں کو سمیٹتے ہوئے وہ نہر کے کنارے بیٹھ گئے جہاں گدلا پانی موڑوں پر قلقل کرتا اور جھاگ دیتا ہوا بہہ رہا تھا۔

"کہاں، کیوں اور کہاں سے یہ پانی بہتا ہے پانی اس کی بابت نہ تو جانتا ہے اور نہ سوچتا ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے افسردگی کے ساتھ سوچا۔ "میں بھی آرام اور گھر سے بیگانہ ہوں اور نہ تو یہ جانتا ہوں کہ کہاں جا رہا ہوں۔۔۔ میں بخارا کیوں آیا؟ میں کل کہاں جاؤں گا؟ اور میں اپنے کھانے کے لیے آدھا تانگا کہاں سے لاؤں؟ کیا مجھے اب بھی بھُوکا رہنا پڑے گا؟ لعنت ہو اس ٹیکس کلکٹر پر! اس نے تو مجھے صاف ہی کر دیا۔ اور پھر دیدہ دلیری تو دیکھو کہ مجھ سے رہزنوں کا ذکر کر رہا تھا!"

اسی لمحے انہوں نے اس آدمی کو دیکھا جو ان کی مصیبتوں کا باعث بنا تھا ٹیکس کلکٹر گھوڑے پر سوار چائے خانے آ رہا تھا۔ اس کے خوبصورت عرب سرنگ گھوڑے کو دو پہرے دار لگاموں سے تھامے ہوئے تھے۔ گھوڑے کی سیاہ آنکھوں میں شریفانہ سی چمک تھی۔ اس کی گردن کمان کی طرح کشیدہ تھی اور وہ اپنے نازک پیروں پر اس نزاکت اور چھل بل

سے چل رہا تھا کہ اس کے اُوپر مالک کا پھُولا پھالا بدن قابلِ نفرت بار معلوم ہو رہا تھا۔

پہرے داروں نے ادب کے ساتھ اپنے افسر کو گھوڑے سے اُترنے میں مدد دی۔ وہ چائے خانے میں چلا گیا جہاں انتہائی غلامانہ ذہنیت رکھنے والا چائے خانے کا مالک اس کو ریشمی گدّوں تک لے گیا اور وہ بیٹھ گیا۔ پھر چائے خانے کے مالک نے اپنی بہترین چاء تیار کی اور ایک نفیس پیالے میں جو چینی دستکاری کا نمونہ تھا ٹیکس کلکٹر کے سامنے چاء پیش کی۔

"یہ سب میرے خرچ سے خاطر مدارات ہو رہی ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا۔

ٹیکس کلکٹر نے خوب چاء پی اور جلد ہی گدّوں پر ڈھیر ہو گیا۔ چائے خانہ اس کی غرّاہٹ، اور ہونٹ چاٹنے کے چٹخاخوں سے گونجنے لگا۔ دوسرے لوگوں نے اپنی آوازیں مدہم کر دیں کہ کہیں اس کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ پہرے دار اس کے دونوں طرف بیٹھے ٹہنیوں سے مور چھل کر

رہے تھے تاکہ مکھیاں اس کو پریشان نہ کر سکیں۔ جب ان کو یقین ہو گیا کہ ٹیکس کلکٹر گہری نیند سو رہا ہے تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھ ماری، گھوڑے کی لگام اُتار دی، اس کے سامنے گھاس کا ایک گٹھ کھول دیا اور ایک حقّہ اُٹھا کر چائے خانے کے اندر والے تاریک حصّے میں چلے گئے۔ ذرا دیر بعد خواجہ نصر الدّین نے حشیش کی بھینی بُو محسوس کی۔ پہرے دار آزادی کے ساتھ اپنے مشغلے میں پڑے ہوئے تھے۔

"اچھا، اب یہاں سے چلتے پڑنا چاہیے۔" شہر کے پھاٹک پر صُبح کا واقعہ یاد کر کے یہ ڈرتے ہوئے کہ کہیں پہرے دار انہیں پہچان نہ لیں خواہ نصر الدّین نے فیصلہ کیا۔ "پھر بھی مجھے آدھا تانگا کہاں سے ملے گا؟ اے مسبب الاسباب تو نے نہ جانے کتنی بار خواجہ نصر الدّین کی مدد کی ہے، اس پر ایک نظر کرم اور!"

ٹھیک اسی وقت کسی نے ان کو پکارا۔ "ارے، تم!"

خواجہ نصر الدّین نے مُڑ کر دیکھا تو سڑک پر ایک بہت سجی ہوئی بند گاڑی دیکھی۔ اس کے پردوں سے ایک آدمی بڑا عمامہ اور قیمتی خلعت پہنے جھانک رہا تھا۔ قبل اس کے کہ یہ اجنبی، جو کوئی امیر سوداگر یا عہدے دار تھا کچھ کہے، خواجہ نصر الدّین سمجھ گئے کہ ان کی دُعا رائگاں نہیں گئی۔ حسبِ معمول قسمت نے ان کی طرف مشکل کے دوران مُسکرا کر دیکھا ہے۔

"مجھے یہ گھوڑا پسند ہے۔" امیر اجنبی نے عرب گھوڑے کو تعریف کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے غرور سے کہا۔ "کیا یہ گھوڑا بکاؤ ہے؟"

"دنیا میں کوئی ایسا گھوڑا نہیں جو بکاؤ نہ ہو۔" خواجہ نصر الدّین نے مبہم سا جواب دیا۔

"غالباً تمہاری جیب بالکل خالی ہے۔" اجنبی کہتا گیا۔ "میری بات غور سے سُنو۔ مجھے نہیں معلوم یہ گھوڑا کس کا ہے، کہاں سے آیا ہے اور اس کا پہلا مالک کون تھا۔ میں تم سے یہ سب نہیں پوچھتا۔ تمہارے گرد آلود کپڑوں

کو دیکھ کر میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کہیں دور سے بخارا آئے ہو۔ بس یہی میرے لیے کافی ہے۔ سمجھتے ہو نا؟"

خواجہ نصر الدّین نے خوشی سے سر ہلا دیا۔ ان کی سمجھ میں فوراہی آگیا کہ یہ امیر آدمی کیا کہنا چاہتا ہے۔ بس وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی احمق مکھی ٹیکس کلکٹر کی ناک یا گلے میں نہ رینگ جائے اور اس کو نہ جگا دے۔ ان کو پہرے داروں کی زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ جو گھنا سبز دھواں چائے خانے کے اندرونی حصے سے نکل رہا تھا وہ پتہ دیتا تھا کہ پہرے دار اپنے مشغلے میں مست ہیں۔

"تمہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔" امیر اجنبی نے غرور اور شان کے لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔ "اس پھٹی پرانی قبا میں تم کو اس گھوڑے کی سواری زیب نہیں دیتی بلکہ یہ بات خطرناک بھی ہو گی کیونکہ ہر ایک کو تعجّب ہو گا کہ اس بھک منگے کے پاس اتنا عمدہ گھوڑا کہاں سے آیا؟ تم کو آسانی سے جیل کا دروازہ دیکھنے کو مل سکتا ہے۔"

"حضور، آپ بجا فرماتے ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے خاکساری سے ہاں میں ہاں ملائی۔ "یہ گھوڑا یقیناً میرے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ میں اپنے پھٹے پرانے لباس میں ساری عمر گدھے کی سواری کرتا رہا ہوں۔ میں اس گھوڑے پر سواری کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

اس کا جواب امیر اجنبی کو پسند آیا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ تم غریب ہوتے ہوئے غرور سے اندھے نہیں ہو۔ غریب آدمی کو خاکسار اور مسکین ہونا چاہیے کیونکہ خوبصورت پھول حسین بادام کے درخت کو زیب دیتے ہیں، ویرانے کی خاردار جھاڑیوں کو نہیں۔ اب بتاؤ، تمہیں یہ تھیلی چاہیے؟ اس میں پورے پورے چاندی کے تیس سو تانگے ہیں۔"

"مجھے چاہیے!" خواجہ نصر الدّین نے جلدی سے کہا اور اس کی سانس یک دم رُک گئی کیونکہ ایک مکھی ٹیکس کلکٹر کی ناک میں رینگ گئی تھی جس سے اس کو چھینک آ گئی تھی اور اس نے کروٹ لی تھی۔ "میرا خیال یہ تو

یہی ہے! چاندی کے تین سو تانگوں سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے سڑک پر تھیلی پڑی مل جائے!"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم کو کوئی اور چیز سڑک پر ملی ہے۔" اجنبی نے اس طرح مُسکراتے ہوئے کہا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ "لیکن سڑک پر جو کچھ تمہیں ملا ہے، میں اس سے اس تھیلی کا تبادلہ کرنے کو تیار ہوں۔ یہ رہے تین سو تانگے۔"

اس نے تھیلی خواجہ نصر الدّین کو دے دی اور اپنے نوکر کو اشارہ کیا، جو خاموشی سے کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا اور اپنی پیٹھ چابک سے کھجلا رہا تھا۔ جب نوکر گھوڑے کی طرف جا رہا تھا تو خواجہ نصر الدّین نے اس کی ہنسی اور اس کے چپٹے، چیچک سے داغدار چہرے اور تھرکتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگایا کہ وہ بھی اپنے مالک سے کم بدمعاش نہیں ہے۔

"ایک ہی سڑک پر تین مکّار، ذرا زیادہ ہوئے۔ بس مجھے یہاں سے چلتا بننا چاہیے۔" خواجہ نے فیصلہ کیا۔

امیر اجنبی کی شرافت اور فیاضی کو سراہتے ہوئے وہ اُچک کر اپنے گدھے پر بیٹھے اور اس کو اتنی زور کی ایڑ لگائی کہ گدھا اپنی تمام کاہلی کے باوجود ہوا ہو گیا۔

جب خواجہ نصر الدّین نے مُڑ کر دیکھا تو نوکر عرب گھوڑے کو گاڑی میں باندھ رہا تھا اور جب دوبارہ وہ مڑے تو امیر اجنبی اور ٹیکس کلکٹر ایک دوسرے کی ریش مبارک نوچ رہے تھے اور پہرے دار ان دونوں کو الگ کرنے کی بے سُود کوشش کر رہے تھے۔

عقلمند آدمی دوسروں کے جھگڑوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتا۔ خواجہ نصر الدّین گلی کوچوں کا چکر لگاتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اب تعاقب کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور انہوں نے گدھے کی لگام کھینچ کر رفتار کم کر دی۔

"رُک، ارے رُک جا۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "اب کوئی جلدی نہیں ہے۔۔۔"

اچانک انہوں نے بالکل قریب ہی تیز اور خطرناک ٹاپوں کی آواز سنی۔

"ارے، بھاگ میرے وفادار گدھے! بھاگ! مجھے یہاں سے جلدی لے چل!" انہوں نے للکار کر کہا۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک موڑ سے گھڑ سوار کود کر سڑک پر آ گیا۔

یہ وہی چیچک رو نوکر تھا۔ وہ گاڑی سے کھولے ہوئے گھوڑے پر سوار تھا۔ اپنے پیر جھلاتے ہوئے وہ خواجہ نصر الدّین سے آگے نکل گیا اور اچانک گھوڑے کو سڑک پر روک کر راستہ روک دیا۔

"بھلے آدمی، مجھے نکل جانے دو۔" خواجہ نصر الدّین نے خاکساری سے التجا کی۔ "ایسی تنگ سڑکوں پر گھوڑا سیدھا لے چلنا چاہیے، آرا بیڑا نہیں۔"

"اچھا۔" نوکر نے طنزیہ ٹھٹھا لگا کر کہا۔ "اب تم کال کوٹھڑی سے نہیں بچ سکو گے! جانتے ہو اس عہدے دار نے جو گھوڑے کا مالک ہے، میرے مالک کی آدھی داڑھی نوچ لی ہے اور میرے مالک نے اس کی ناک لہو

لہان کر دی ہے؟ کل امیر کی عدالت میں تمہاری پیشی ہو گی۔ سچ مچ، تمہارے بُرے دن آ گئے!"

"تم کہہ کیا رہے ہو؟" خواجہ نصر الدّین نے حیرت سے کہا۔ "یہ معزّز لوگ کیوں اس بُری طرح لڑ پڑے؟ اور تم نے مجھے کیوں روکا؟ میں نے کے جھگڑے میں ثالث نہیں بن سکتا۔ وہ خود جس طرح چاہیں اس کا فیصلہ کریں۔"

"اچھا، بس چپ کرو۔" نوکر نے کہا۔ "لوٹو، تمہیں گھوڑے کے لیے جواب دہی کرنی ہو گی۔"

"کیسا گھوڑا؟"

"تم پوچھتے ہو؟ وہی گھوڑا جس کے لیے تم کو میرے مالک نے چاندی کے سکوں کی تھیلی دی ہے۔"

"خدا کی قسم تم غلطی کر رہے ہو۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "اس معاملے سے گھوڑے کا کوئی سروکار نہیں۔ خود فیصلہ کرو۔ تم نے تو ساری گفتگو سُنی ہے۔ تمہارے مالک شریف اور فیاض آدمی ہیں۔ وہ ایک غریب کی مدد کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں چاندی کے تین سو تانگے لینا چاہتا ہوں اور میں نے کہا کہ ضرور۔ لیکن رقم دینے سے قبل انہوں نے میرے انکسار اور خاکساری کی یہ معلوم کرنے کے لیے آزمائش کی کہ آیا میں اس انعام کے لائق ہوں یا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ میں یہ نہیں پوچھتا کہ یہ گھوڑا کس کا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ دیکھو نا، وہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا جھوٹے غرور میں اس کو میں اپنا گھوڑا بتا دوں گا۔ میں چُپ رہا اور یہ فیاض اور شریف انسان خوش ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ایسا گھوڑا میرے لیے ایک بہت بڑی چیز ہو گا اور میں نے ان سے اتّفاق کیا۔ اس سے بھی وہ خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں نے سڑک پر وہ چیز پائی ہے جس کا تبادلہ چاندی سے کیا جا سکتا

ہے، ان کا اشارہ اسلام کے لیے میرے جوش اور مضبوط عقیدے کی طرف تھا، جو میں نے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے سفر کر کے حاصل کیا تھا۔ اور اس کے بعد انہوں نے مجھے انعام دیا، اس نیک کام میں ان کی نیّت یہ تھی کہ جنّت میں ان کے داخلے کے لیے میں اس پُل کے ذریعہ آسانی ہو جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے، جیسا کہ قرآن شریف ہم کو بتاتا ہے۔ میں اپنی سب سے پہلی دُعا میں اللہ سے یہ درخواست کروں گا کہ اس کار خیر کی وجہ سے تمہارے مالک کے لیے اس پُل پر کٹہرا لگوا دیا جائے۔"

نوکر نے یہ لمبی تقریر غور سے سُنی اور چابک سے اپنی پیٹھ کھجلاتا رہا۔ آخر میں اس نے چالاکی سے دانت نکالتے ہوئے کہا جس سے خواجہ نصرالدّین گھبرا گئے:

"مسافر، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ حیرت ہے کہ میں فوراً ہی یہ کیوں نہیں سمجھ گیا کہ میرے مالک سے تمہاری بات چیت کا کیسا نیک مطلب ہے؟ لیکن

چونکہ تم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تم میرے مالک کو دوسری دنیا میں پُل پار کرنے میں مدد دو گے، تو اگر یہ پُل کے دونوں طرف کٹہرا ہو تو اس سے زیادہ حفاظت ہو گی۔ میں بھی بہت خوشی سے اپنے مالک کے لیے دُعا کروں گا تاکہ اللہ پُل کے دوسری طرف بھی ان کو کٹہرا عطا فرمائے۔"

"تو کرو نا دُعا!" خواجہ نصر الدّین نے زور سے کہا۔ "تمھیں روکتا کون ہے؟ تمہارا تو ایک طرح سے یہ فرض بھی ہے۔ کیا قرآن میں ہدایت نہیں کی گئی ہے کہ غلاموں اور ملازموں کو روزانہ اپنے مالک کے لیے کسی خاص انعام کے مطالبے کے بغیر دُعا کرنی چاہیے؟"

"اپنا گدھا موڑو۔" نوکر نے سختی سے چلّا کر کہا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر خواجہ نصر الدّین کو دیوار تک دبا دیا۔ "اب جلدی کرو، میرا وقت ضائع مت کرو۔"

"رکو!" خواجہ نصر الدّین نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے ابھی اپنی بات نہیں ختم کی ہے۔ میں تانگوں کی تعداد کے مطابق تیس سو الفاظ

کی دُعا پڑھنے والا تھا لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ ڈھائی سو الفاظ کی دُعا کافی ہو گی۔ میری طرف کا کٹہرا ذرا پتلا اور چھوٹا ہو گا۔ اور تم پچاس الفاظ کی دُعا پڑھو گے اور خدا حکیم مطلق ہے، وہ بہتر جانتا ہے کہ تمہاری طرف کا کٹہرا اسی لکڑی سے کیسے بنایا جائے۔"

"کیا۔" نوکر نے کہا۔ "میرا کٹہرا تمہارے کٹہرے سے پانچ گنا چھوٹا کیوں ہو؟"

"لیکن وہ انتہائی خطرناک حصّے میں ہو گا۔" خواجہ نصر الدّین نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔" نوکر نے فیصلہ کُن انداز طور پر کہا۔ "میں ایسے چھوٹے کٹہرے پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پُل کا ایک حصّہ بلا کٹہرے کے ہو گا۔ میں اس خطرے کے خیال سے ہی کانپ اٹھتا ہوں جو میرے مالک کو ہو گا۔ میرے رائے میں ہم دونوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو الفاظ کی دُعا پڑھنی چاہیے تا کہ دونوں طرف کٹہرے کی لمبائی ایک ہی

ہو۔ چاہے وہ پتلا ہی کیوں نہ ہو لیکن دونوں طرف سے حفاظت تو ہو گی۔ اور اگر تم اس پر تیّار نہیں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرے مالک کی برائی کے خواہاں ہو اور چاہتے ہو کہ وہ پُل سے گر پڑیں۔ اچھا، میں لوگوں کو پکارتا ہوں اور تم جلد ہی کال کوٹھری میں ہو گے۔"

"پتلا کٹہرا!" خواجہ نصر الدّین نے گرم ہو کر کہا، ان کو محسوس ہو رہا تھا گویا ان کے پٹکے میں تھیلی کلبلا رہی ہے۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس سے تو یہی اچھا ہے کہ ٹہنیوں کا کٹہرا بنا دیا جائے! تمہاری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ایک طرف کا کٹہرا زیادہ موٹا اور مضبوط ہونا چاہیے تاکہ اگر تمہارے مالک کا پیر لڑکھڑائے اور وہ گرنے لگیں تو ان کو کچھ سہارا لینے کو تو مل جائے۔"

"تمہارے مُنہ سے تو سب سچ ہی سچ نکل رہا ہے۔" نوکر نے خوش ہو کر کہا "میری طرف کا کٹہرا موٹا ہونے دو اور میں دو سو الفاظ کی دُعا پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا کر لوں گا۔"

"شاید تم اس کو تین سو تک لے جانا پسند کرو۔" خواجہ نصر الدّین نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

آخر کار جب وہ ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے تو خواجہ کی تھیلی آدھی ہلکی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اس پر راضی ہو گئے تھے کہ جنّت کو جانے والے پُل کی حفاظت اس آدمی کے مالک کے لیے دونوں طرف ایسے کٹہروں سے ہونی چاہیے جو مضبوطی اور موٹائی دو میں برابر ہوں۔

"خدا حافظ، اے انتہائی مہربان، وفادار اور نیک ملازم جو اپنے مالک کی روح کی بخشائش کے لیے اتنا فکر مند ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بحث و مباحثے میں تم خواجہ نصر الدّین سے مات نہیں کھاؤ گے۔"

"اس کا ذکر تم نے کیوں کیا؟" نوکر نے پوچھا، اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"کچھ نہیں۔۔۔بس خیال آ گیا۔" خواجہ نصر الدّین نے اپنے آپ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ معمولی آدمی نہیں ہے۔"

"ممکن ہے کہ تم اس کے دُور کے رشتے دار ہو؟" نوکر نے پوچھا۔ "یا شاید تم اس کے خاندان کے کسی فرد کو جانتے ہو؟"

"نہیں، میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور میں خواجہ نصر الدّین کے کسی عزیز کو بھی نہیں جانتا۔"

"سنو، میں تمہیں کان میں ایک بات بتاؤں۔" نوکر نے کاٹھی سے جھکتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا رشتے دار ہوں۔ دراصل اس کا چچیرا بھائی۔ ہم نے اپنا بچپن ساتھ ساتھ گزارا ہے۔"

خواجہ نصر الدّین کے شبہے کی تصدیق ہو گئی اور انہوں نے اپنی زبان روک لی۔ نوکر اور قریب جھک آیا:

"اس کا باپ، دو بھائی اور چچا تو مر چکے ہیں۔ شاید تم نے اس کی بابت سنا ہو، مسافر؟"

لیکن خواجہ نصر الدّین اب بھی چپ رہے۔

"امیر نے ایسا ظلم ڈھایا!" نوکر نے مکّاری سے کہا۔

پھر بھی خواجہ چپ ہی رہے۔

"بخارا کے تمام وزیر احمق ہیں!" نوکر نے غیر متوقع طور پر کہا۔ وہ لالچ سے بالکل بے صبر ہو رہا تھا کیونکہ حکومت آزاد خیال لوگوں کی گرفتاری کے لیے کافی انعام دیتی تھی۔ لیکن خواجہ نصر الدّین نے زبان پر مہر سکوت لگا لی۔

"اور ہمارا معزّز امیر بھی احمق ہے!" اس آدمی نے کہا۔ "اور یہ بھی یقینی نہیں ہے کہ اللہ کا وجود ہے!"

لیکن خواجہ نصر الدّین نے اپنا مُنہ نہیں کھولا حالانکہ ایک تیز و تلخ جواب ان کی زبان پر تھا۔ نوکر کو بڑی نا اُمّیدی ہوئی۔ اس نے زور سے کوستے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دو چھلانگوں میں موڑ پر غائب ہو گیا۔ اب سنّاٹا ہو گیا۔ صرف ساکن ہوا میں گھوڑے کے سموں سے اٹھنے والی گرد سنہرے دُھند کی طرح معلق تھی جس کو گرم اور ترچھی کرنیں چیر رہی تھیں۔

"اچھا، لیجئے مجھے رشتہ دار بھی مل گیا۔" خواجہ نصر الدّین خود سوچ کر مسکرائے۔ "بُڈّھے نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ بخارا میں جاسوس مکھیوں کی طرح بھرے ہوئے ہیں۔ ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ مجرم زبان کے ساتھ سر بھی کٹ جاتا ہے۔"

اس طرح وہ گدھے پر کافی دیر تک آگے چلتے تھے، کبھی اپنی تھیلی کی آدھی کائنات کھونے کے بارے میں سوچتے اور کبھی ٹیکس کلکٹر اور مغرور اجنبی کے درمیان جھگڑے کو یاد کر کے ہنستے۔

۵

جب خواجہ نصر الدّین شہر کے دوسرے سِرے پر پہنچ گئے تو وہ رُکے، اپنا گدھا ایک چائے خانے کے مالک کے سپرد کیا اور تیزی کے ساتھ ایک طعام خانے پہنچے۔

وہاں بڑی بھیڑ تھی، کھانے کی مہک ہر طرف پھیلی تھی۔ تندور روشن تھے اور شعلے لپک رہے تھے جو باورچیوں کی پسینے سے تر پیٹھوں کو اور چمکا دیتے تھے۔ باورچی کمر تک ننگے کام کر رہے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، شور کر رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے اور باورچی خانے میں کام کرنے والے چھوکروں کی گدی پر دھپ بھی جما

دیتے تھے۔ گھبرائی گھبرائی آنکھوں والے چھوکرے اِدھر اُدھر بھاگ بھاگ دھکا پیل، غل اور ہنگامے میں اضافہ کر رہے تھے۔ لکڑی کے ناچتے ہوئے ڈھکنوں والے بڑے بڑے دیگچوں سے کھدبدانے کی آواز آ رہی تھی۔ چھت کے قریب بھاپ کے گھنے بادل جمع تھے جہاں لاتعداد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس دُھندلکے میں گھی زوروں سے سنسنا اور اُبل رہا تھا، انگیٹھیوں کی دیواریں لال بھبھوکا ہو کر چمک رہی تھیں اور سیخوں سے چربی ٹپک کر کوئلے پر ِگر رہی تھی اور نیلگوں دھوئیں دار شعلے بھڑ کا کر جل جاتی تھی۔ یہاں پلاؤ پک رہا تھا، بوٹی کے کباب بھونے جا رہے تھے، اوجھڑی اُبل رہی تھی اور پیاز، مرچ، گوشت اور دُنبے کی دُم کی چربی سے بھرے ہوئے سموسے سینکے جا رہے تھے۔ چربی تندور میں پگھل کر سموسوں سے نکل پڑتی تھی اور چھوٹے چھوٹے بلبلے بناتی تھی۔

بڑی مشکل سے خواجہ نصر الدّین کو ایک جگہ ملی جہاں اُن کو اس طرح کسمسا کر بیٹھنا پڑا کہ جن لوگوں کو انہوں نے اپنی پیٹھ اور پہلو سے دبایا تھا

وہ چیخ اٹھے۔ لیکن کوئی ناراض نہیں ہوا، کسی نے ایک لفظ بھی ان کو نہیں کہا اور نہ وہ خود ہی بڑبڑائے۔ ان کو ہمیشہ سے بازار کے طعام خانوں کی ایسی گرما گرم بھیڑ بھکڑ، یہ تمام چیخ پکار، ہنسی مذاق، قہقہے، غل غپاڑہ، دھکم دھکا، زور دار کھانس کھنکار اور ان سینکڑوں آدمیوں کے کھانا کھانے کی آوازیں جو دن بھر کی شدید محنت کے بعد کھانے میں انتخاب کی تاب نہیں رکھتے اور ان کے طاقتور جبڑے ہر چیز کو چبا ڈالتے ہیں، خواہ وہ گوشت ہو یا ہڈّی۔ ہر سستی اور افراط سے ملنے والی چیز کو سخت معدہ قبول کر لیتا ہے۔ خواجہ نصر الدّین نے بھی خوب جی بھر کر کھایا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ کر تین پلیٹ شوربہ، تین پلیٹ پلاؤ اور دو درجن سموسے کھا گئے۔ سموسے ختم کرنے میں ذرا کوشش کرنی پڑی پھر بھی کھا لیا کیونکہ خواجہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جس چیز کی قیمت ادا کرتے تھے اس کو پلیٹ میں نہیں چھوڑتے تھے۔

آخر کار انہوں نے دروازے کا رُخ کیا اور جب کسی طرح کہنیوں سے راستہ بنا کر وہ کھلی ہوا میں پہنچے تو پسینے سے نہائے ہوئے تھے۔ ان کے بازو اور پیر ایسے کمزور اور نرم ہو رہے تھے جیسے وہ کسی حمام میں ابھی ابھی کسی ہٹے کٹے غسّال کے ہاتھ سے چھٹکارا پا کر نکلے ہوں۔ کھانے اور گرمی سے بھاری پن محسوس کرتے ہوئے وہ اس چائے خانے تک پیر گھسیٹتے پہنچے جہاں انہوں نے اپنا گدھا چھوڑا تھا۔ انہوں نے چائے لانے کے لیے کہا اور نمدے پر مزے میں دراز ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے دماغ میں پر سکون اور خوشگوار خیالات آنے لگے:

"اس وقت میرے پاس کافی رقم ہے۔ اس کو کسی دُکان میں لگا دینا اچھا رہے گا۔ ساز یا برتن بنانے کی دُکان میں۔ میں دونوں حرفتیں جانتا ہوں۔ اب آوارہ گردی چھوڑ دینا چاہیے۔ کیا میں دوسروں سے کم عقل ہوں؟ کیا میں کسی مہربان اور حسین لڑکی کو بیوی نہیں بنا سکتا؟ کیا میرے بیٹا نہیں ہو سکتا جس کو میں گود میں لے کر کھلاؤں؟ پیغمبر صاحب کی

ریش مبارک کی قسم، ننھا شریر بڑھ کر پکّا بدمعاش ہو گا اور میں اُس کو اپنی سوجھ بوجھ ضرور اس کو عطا کر سکوں گا۔ بس، میں نے طے کر لیا۔ خواجہ نصر الدّین نے اپنی بے سکون زندگی ختم کر دی۔ اب ابتدا کے لیے میں کمہار کا کام کروں یا ساز بنانے والے کا۔۔۔"

انہوں نے حساب لگانا شروع کیا۔ اچھی دُکان کے لیے کم از کم تین سو تانگوں کی ضرورت ہو گی لیکن ان کے پاس تو صرف ڈیڑھ سو تھے۔ انہوں نے چیچک رو ملازم پر لعنت بھیجی:

"اللہ اس لٹیرے کو اندھا کرے۔ اس نے مجھ سے وہ لے لیا جس کی مجھے زندگی شروع کرنے کے لیے ضرورت تھی!"

ایک مرتبہ پھر قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔ "بیس تانگے۔" کسی نے اچانک زور سے کہا۔ پھر ایک تانبے کی تھالی میں پانسے کے گرنے کی آواز آئی۔

برساتی کے نالے کے کنارے اور بالکل اس جگہ کے قریب جہاں گھوڑے باندھے جاتے تھے اور جہاں ان کا گدھا بندھا تھا آدمیوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ بنا ہوا تھا۔ چائے خانے کا مالک ان کے پیچھے کھڑا ان کے سر کے اُوپر سے گردن بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

"جوا ہو رہا ہے!" خواجہ نصر الدّین نے اپنی کہنیوں پر اٹھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ "وہ قطعی جوا کھیل رہے ہیں! ذرا دیکھوں تو دور سے ہی سہی۔ میں کھیلوں گا نہیں۔ میں کوئی احمق ہوں؟ لیکن عقلمند آدمی احمقوں کو کھیلتے تو دیکھ ہی سکتا ہے۔"

وہ اٹھ کر جواریوں کے پاس گئے۔

"احمق ہیں یہ لوگ۔" انہوں نے چُپکے سے چائے خانے کے مالک سے کہا "جیتنے کے لالچ میں اپنی آخری کوڑی تک لگا دیتے ہیں۔ کیا پیغمبر صاحب نے جوئے کی ممانعت نہیں کی ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ میں اس مہلک برائی سے پاک ہوں۔۔۔ لیکن اس لال بالوں والے جواری کی قسمت کتنی

اچھی ہے! اس کو متواتر چار بار جیت ہو چکی ہے۔۔ دیکھو، دیکھو۔ وہ پانچویں مرتبہ بھی جیت گیا! اس کو دولت کے جھوٹے تصوّر نے ورغلایا ہے جبکہ غربت اس کے راستے میں گڑھا کھود چکی ہے۔ ارے کیا؟ اس نے چھٹی مرتبہ بازی مارلی۔ میں نے ایسی قسمت کبھی نہیں دیکھی۔ دیکھو، وہ پھر داؤ لگا رہا ہے۔ سچ ہے، انسان کی حماقت کی کوئی انتہا نہیں۔ آخر کار وہ متواتر کب تک جیتا کرے گا؟ اسی طرح لوگ جھوٹی قسمت پر بھروسہ کر کے تباہ ہوتے ہیں! اس لال بالوں والے آدمی کو سبق دینا چاہیے۔ اگر یہ ساتویں بار بھی جیتا تو میں اس کے خلاف داؤ لگاؤں گا حالانکہ میں دل سے ہر قسم کے جوئے کے خلاف ہوں۔ اگر میں امیر بخارا ہوتا تو بہت دن ہوئے اس کو ممنوع قرار دے چکا ہوتا!"

لال بالوں والے جواری نے پانسہ پھینکا اور ساتویں بار بھی بازی اس کے ہاتھ رہی۔

خواجہ نصر الدّین نے بڑے عزم کے ساتھ قدم بڑھایا۔ کھلاڑیوں کو کندھے سے الگ ہٹا دیا اور حلقے میں کھیلنے کے لیے بیٹھ گئے۔

"میں تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے خوش قسمت جیتنے والے سے کہا۔ انہوں نے پانسے اٹھائے اور ان کا ہر رُخ سے اپنی تجربہ کار نگاہوں سے جائزہ لیا۔

"کتنے سے؟" لال بالوں والے نے بھاری آواز سے پوچھا۔ اس کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ وہ اپنی خوش قسمتی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو تھوڑی دیر کے لیے اس کو نصیب ہو گئی تھی۔

خواجہ نصر الدّین نے جواب میں اپنی تھیلی نکالی۔ شدید ضرورتوں کے لیے پچیس تانگے الگ کر لیے اور پھر تھیلی خالی کر لی۔ تانبے کی تھالی پر چاندی کی جھنکار ہوئی۔ جواریوں نے داؤں کا پر اشتیاق شور سے خیر مقدم کیا۔ اونچے داؤں سے کھیل شروع ہو رہا تھا۔

لال بالوں والے آدمی نے پانسے لیے اور ان کو بڑی دیر تک ہلایا، وہ ان کو پھینکتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ہر ایک سانس روکے تھا، حتیٰ کہ گدھے نے بھی اپنا تھوتھن آگے بڑھا دیا تھا اور کان کھڑے کر لیے تھے۔ صرف جواری کی مٹھی میں پانسوں کی کھنکھناہٹ کی آواز ہو رہی تھی۔ اس خشک کھنکھناہٹ نے خواجہ نصر الدّین کے پیروں اور پیٹ میں ایک تھکن آمیز کمزوری پیدا کر دی۔ آخر کار لال بالوں والے نے پانسہ پھینکا۔ دوسرے کھلاڑیوں نے گردن بڑھا کر دیکھا اور پھر اس طرح پیچھے گر گئے جیسے وہ سب ایک ہی آدمی ہوں، ان کے سینوں سے نکل رہی ہو۔ لال بالوں والے جواری کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے بھینچے ہوئے دانتوں سے ایک آہ نکلی۔ پانسے میں صرف تین نقطے نظر آ رہے تھے یعنی ہار قطعی تھی کیونکہ دو کا پانسہ اسی طرح کم گرتا تھا جیسے بارہ کا۔ باقی ہر پانسہ خواجہ نصر الدّین کے حق میں تھا۔

پانسے کو مٹھی میں ہلاتے ہوئے خواجہ نصر الدّین نے دل ہی میں قسمت کا شکریہ ادا کیا کہ آج وہ اتنی مہربان تھی۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ قسمت بڑی متلوّن مزاج اور من موجی ہے اور اگر اس کو ذرا بھی تنگ کرو تو فوراً دغا دے جاتی ہے۔ قسمت نے یہ فیصلہ کیا کہ خواجہ نصر الدّین کو اس خود اعتمادی کے لیے سبق دے اور ان کے گدھے کو اپنا ہتھیار بنایا یا زیادہ ٹھیک یہ کہنا ہو گا کہ ان کے گدھے کی دم کو جس کا سرا کانٹوں اور گوکھروؤں سے مرصع تھا۔ گدھے نے جواریوں کی طرف سے پیٹھ موڑ کر جو اپنی دم ہلائی، تو اس کے مالک کے ہاتھ میں جا لگی۔ پانسہ ہاتھ سے چھوٹ کر گِرا اور لال بالوں والا جواری ایک زوردار نعرہ لگا کر آناً فاناً تھالی پر گِرا اور ساری رقم پر چھا گیا۔

خواجہ نصر الدّین نے دو پھینکے تھے۔

وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھے اپنے ہونٹ چلاتے رہے۔ ان کی تکتی ہوئی آنکھوں کے سامنے ساری دنیا ڈگمگا اور تیر رہی تھی اور کان عجیب آوازوں سے بج رہے تھے۔

اچانک وہ اُچک کر اُٹھے اور ڈنڈا لے کر بے تحاشہ گدھے کو پیٹنے لگے۔ وہ اسے کھونٹے کے چاروں طرف دوڑا رہے تھے۔

"منحوس گدھا! ولد الزنا! بدبودار جانور، دنیا کی تمام مخلوقات کے لیے لعنت!" خواجہ نصر الدّین گرج رہے تھے۔ "اپنے مالک کے پیسے سے جوا ہی کھیلنا کیا کم تھا نہ کہ اس کو ہار بھی جانا۔ خدا کرے تیری شیطانی کھال پھٹ جائے! اللہ کرے تیرے راستے میں ایسا گڑھا آئے کہ تیرا پیر ٹوٹ جائے! نہ معلوم تو کب مرے گا کہ تیری منحوس صورت سے مجھے چھٹکارا ملے گا!"

گدھا رینکنے لگا۔ جواریوں میں قہقہہ پڑا اور لال بالوں والے نے تو سب سے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کو اپنی خوش قسمتی پر قطعی بھروسہ ہو چکا تھا۔

"آؤ پھر کھیلیں۔" اس نے خواجہ نصر الدّین سے کہا جب تھک کر ان کی سانس پھول چکی اور انہوں نے ڈنڈا اچھینک دیا۔

"آؤ کچھ بازیاں اور ہو جائیں۔ ابھی تو تمہارے پاس پچیس تانگے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بایاں پیر پھیلا کر اس کو ہلایا۔ گویا اس طرح اس نے خواجہ نصر الدّین کے لیے حقارت کا اظہار کیا۔

"کیوں نہیں؟" خواجہ نے یہ سوچتے ہوئے جواب دیا کہ اب ایک بیس تانگے تو ضائع ہو ہی چکے، رہے باقی پچیس تانگے، ان کا جو حشر ہو۔

انہوں نے لاپروائی سے پانسہ پھینکا اور جیت گئے۔

" پوری رقم رہی!" لال بالوں والے نے ہاری ہوئی رقم تھالی میں پھینکتے ہوئے تجویز کی۔

خواجہ نصر الدّین پھر جیت گئے۔

لال بالوں والے کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ قسمت نے اس سے اس طرح مُنہ پھیر لیا ہے۔

"ساری رقم رہی!"

متواتر سات مرتبہ اس نے کہا اور ہر مرتبہ وہ ہارا۔ ساری تھالی رقم سے بھر گئی۔ جواری بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی شعلہ ور آنکھیں صرف اس اندرونی آگ کی آئینہ دار تھیں جو ان کو جلائے ڈال رہی تھی۔

"اگر شیطان تمہاری مدد نہیں کر رہا ہے تو تم ہر بار تو نہیں جیت سکتے!" لال بالوں والے نے چلّا کر کہا۔ "کبھی تو ہارو گے! لو یہ تھالی میں رہے تمہارے ایک ہزار چھ سو تانگے۔ تم پھر ایک بار ساری رقم داؤ پر لگاؤ گے؟ یہ رہی وہ رقم جس سے کل میں اپنی دُکان کے لیے بازار سے سامان خریدنے والا تھا۔ میں تمہارے خلاف یہ ساری رقم داؤ پر لگاتا ہوں!"

اس نے ایک تھیلی نکالی جس میں سونے کے سکے بھرے تھے۔

"اپنا سونا تھالی میں رکھو۔" خواجہ نصر الدّین نے جوش میں آ کر زور سے کہا۔

اس چائے خانے میں اتنا زبردست داؤ کبھی نہیں لگا تھا۔ چائے خانے کا مالک تو اپنی اُبلتی ہوئی کیتلیوں کو بھی بھول گیا۔ جواری زور زور سے ہانپ رہے تھے۔ لال بالوں والے نے پہلے پانسہ پھینکا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں کیونکہ وہ ڈر رہا تھا۔

"گیارہ!" سب ایک ساتھ مل کر چلائے۔ خواجہ نصر الدّین نے سمجھ لیا کہ اب بازی ہاری ہی سمجھو۔ صرف بارہ کا پانسہ ہی اس کو بچا سکتا تھا۔

"گیارہ! گیارہ!" لال بالوں والا جواری خوشی سے بے ساختہ دھرا رہا تھا۔ "دیکھو نا، میرے گیارہ ہیں! تم ہار گئے! تم ہار گئے!"

خواجہ نصر الدّین سر سے پیر تک ٹھنڈے پڑ گئے۔ انہوں نے پانسے لے کر اُن کو پھینکنے کی تیّاری کی۔ پھر یکایک انہوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"گھوم جا۔" اس نے اپنے گدھے سے کہا۔ "تو نے تین کے پانسے کے خلاف ہرایا ہے تو اب گیارہ کے خلاف جتا، نہیں تو میں تجھے قصاب گھر دکھاؤں گا۔"

انہوں نے گدھے کی دُم بائیں ہاتھ سے پکڑ کر دائیں ہاتھ پر ماری جس میں پانسے تھے۔

سارے لوگوں کے غُل سے چائے خانہ گُونج گیا۔ چائے خانے کے مالک نے اپنا دل تھام لیا اور زمین پر گِر گیا، وہ اتنے زبردست دھکے کو نہ برداشت کر سکا۔

پانسے میں بارہ دکھائی دے رہے تھے۔

لال بالوں والے کی آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں اور اس کے بے خون چہرے پر چمک رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ وہ بار بار چلّا رہا تھا۔ "تباہ ہو گیا، تباہ ہو گیا میں!"

کہا جاتا ہے کہ اس دن سے لال بالوں والا پھر شہر میں نہیں دکھائی دیا۔ وہ ریگستان میں بھاگ گیا اور وہاں اس کے بال بڑھ گئے اور صورت وحشت ناک ہو گئی۔ وہ ریت اور کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان مارا مارا پھرتا اور برابر یہی چیختا رہتا، "تباہ ہو گیا میں!" یہاں تک کہ گیدڑوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن کسی نے اس کا ماتم نہیں کیا کیونکہ وہ ظالم اور ناانصاف تھا اور اس نے اعتبار کرنے والے سیدھے سادے لوگوں کو ہرا کر بڑا نقصان پہنچایا تھا۔

جہاں تک خواجہ نصر الدّین کا تعلّق ہے انہوں نے اپنی جیتی ہوئی نئی دولت کو خورجینوں میں ڈالا اور اپنے گدھے کو لپٹا کر اس کے گرم تھوتھن کو زور سے چُوما، اس کو کچھ مزے دار، تازہ نان کھلائی جس پر گدھے کو تعجب ہوا کیونکہ چند منٹ پہلے مالک کا برتاؤ برعکس رہ چکا تھا۔

٦

اس دانشمندانہ اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ ان لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے جو یہ جانتے ہوں کہ تم اپنی پونجی کہاں رکھتے ہو خواجہ نصر الدّین نے چائے خانے میں تضیعِ اوقات نہیں کیا اور بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ بار بار پیچھے مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے کہ کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے کیونکہ جواریوں اور چائے خانے کے مالک کے چہروں پر بدنیتی کے آثار نظر آرہے تھے۔

حالات تو بہت خوشگوار تھے۔ اب وہ کوئی بھی دُکان خرید سکیں گے، دو دُکانیں، تین دُکانیں اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہی کریں گے۔

"میں چار دُکانیں خرید لوں گا، برتن بنانے کی، ساز بنانے کی، درزی اور موچی کی دُکانیں۔ ہر ایک میں دو کاریگر لگا دوں گا، بس میرا کام پیسہ جمع کرنا رہ جائے گا۔ دو سال میں امیر بن جاؤں گا۔ ایک مکان خرید لوں گا جس کے باغ میں فوّارے ہوں گے۔ میں ہر جگہ چہچہاتی ہوئی چڑیوں کے سونے کے پنجرے ٹانگوں گا، اور میرے دو شاید تین بیویاں ہوں گی اور ہر ایک سے تین تین بیٹے۔۔۔"

انہوں نے اپنے کو خیالوں کے خوشگوار سیلاب میں بہنے دیا۔ اس دوران میں گدھے نے لگام کی گرفت نہ محسوس کرکے اپنے مالک کے ہوائی قلعے سے فائدہ اُٹھایا۔ جب وہ ایک چھوٹے سے پُل پر پہنچے تو دوسرے گدھوں کی طرح اسے پار کرنے کی بجائے وہ ایک طرف مُڑا اور سیدھا خندق کے اُوپر سے جست لگا گیا۔

"۔۔۔اور جب میرے بچّے بڑے ہو جائیں گے تو میں ان کو اکٹھا کرکے کہوں گا۔۔۔" خواجہ نصر الدّین خیالات کی دنیا میں اس طرح اُڑے چلے

جا رہے تھے۔ ”لیکن میں ہوا میں اُڑ کیوں رہا ہوں؟ کیا خُدا نے مجھ کو فرشتہ بنا کر پَر عطا کر دیے ہیں؟“

دوسرے لمحے آنکھوں سے نکلتی ہوئی چنگاریوں نے خواجہ نصر الدّین کو یقین دلا دیا کہ ان کے پَر نہیں ہیں۔ کاٹھی سے اُچھل کر اپنی سواری سے کچھ گز آگے وہ سڑک پر دراز تھے۔

جب وہ گرد میں لت پت کراہتے ہوئے سڑک سے اُٹھے تو گدھا ان کے پاس آ گیا۔ وہ اپنے کان دوستانہ انداز میں ہلا رہا تھا اور اس کے چہرے پر انتہائی معصومانہ تاثرات تھے جیسے وہ اپنے مالک کو مدعو کر رہا ہو کہ وہ پھر کاٹھی پر واپس آ جائے۔

”ارے تو، جو میرے پلے پڑا ہے صرف میرے گناہوں کی سزا نہیں بلکہ میرے باپ، دادا، پردادا کے گناہوں کے لیے بھی، کیونکہ اسلامی انصاف کے نقطہ نظر سے ایک آدمی کو صرف اپنے گناہوں کے لیے اتنی بھاری سزا دینا نامنصفانہ بات ہو گی!“ خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ ان کی

آواز غصّے سے کانپ رہی تھی۔ "مکڑے اور لکڑ بگھے کا بچّہ ! ارے تو۔۔۔"

لیکن اب انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ تھوڑی ہی دُور پر ایک تباہ شدہ دیوار کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ چُپ ہو گئے۔

کوسنے اور گالیاں خواجہ نصر الدّین کی زبان پر آ کر رُک گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ ایسے آدمی کو جس کی دیکھنے والوں کی موجودگی میں ایسی مضحکہ انگیز اور بری گت بنی ہو اپنی حالت پر خود سب سے زور سے ہنسنا چاہیے۔ انہوں نے ان آدمیوں کی طرف جو بیٹھے تھے آنکھ ماری اور اپنی پوری سفید بتیسی نکال کر ہنس پڑے۔

"ارے۔" انہوں نے زندہ دلی کے ساتھ زور سے کہا۔ "کتنی زور دار اُڑان رہی میری! اچھا بتاؤ کتنی قلابازیاں میں نے کھائیں۔ مجھے تو ان کے شمار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بد معاش کہیں کے!" وہ خوش دلی کے ساتھ

گدھے کو تھپتھپانے لگے حالانکہ دل تو یہ چاہتا تھا کہ اس کو چار چوٹ کی مار دیں۔ "یہ بڑا شریر ہے! بس ذرا نگاہ چُوکی اور یہ دکھا گیا اپنے ہتھکنڈے!"

خواجہ نصرالدّین زندہ دلی کے ساتھ ہنسے لیکن ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کوئی اور ان کے ساتھ نہیں ہنسا۔ لوگ خاموش سر جھکائے اور اداس بیٹھے تھے اور عورتیں جن کی گود میں بچے تھے چُپکے چُپکے آنسو بہا رہی تھیں۔

"کچھ گڑبڑ ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے سوچا۔

وہ ان آدمیوں کے پاس گئے اور ایک سفید ریش آدمی کو مخاطب کیا جس کا چہرہ مریل سا تھا۔ "معزز بزرگ، مجھے بتایئے کیا بات ہے؟ میں یہاں نہ تو مُسکراہٹ دیکھتا ہوں اور کوئی قہقہہ سُنتا ہوں اور یہ عورتیں کیوں رو رہی ہیں؟ آپ لوگ سڑک کے کنارے اس گرد اور گرمی میں کیوں بیٹھے ہیں؟ کیا آپ لوگوں کو اپنے گھروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنا نہیں سہاتا؟"

"گھروں میں ان لوگوں کے لیے بیٹھنا اچھا ہے جن کے گھر ہوتے ہیں۔"
بُڈّھے نے ملول ہو کر جواب دیا۔ "ارے مسافر، ہم سے مت پوچھ۔ ہم پر بڑی بپتا ہے اور تُو کسی طرح بھی ہماری مدد نہیں کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں بُڑھا اور معزور ہوں اور خُدا سے دُعا کرتا ہوں کہ میرے لیے جلدی موت بھیج دے۔"

"ایسا کیوں کہتے ہیں آپ؟" خواجہ نصر الدّین نے ملامت کرتے ہوئے کہا "انسان کو کبھی اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ مجھے اپنی مصیبت بتایئے اور میری بُری حالت پر مت جایئے۔ شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔"

"میری کہانی مختصر ہے۔ صرف ایک گھنٹہ پہلے جعفر سُود خور ہماری سڑک سے امیر کے دو پہرے داروں کے ساتھ گزرا۔ میں اس کا قرض دار ہوں اور کل اس کو ادا کرنا ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھ کو اس گھر سے نکال دیا ہے جہاں میں نے اپنی پوری زندگی گزاری ہے۔ میرے نہ تو کوئی

خاندان ہے اور نہ سر چھپانے کی کوئی جگہ۔۔۔ اور میری ساری پونجی، میرا گھر، باغ، مویشی اور انگوروں کے چمن کل جعفر نیلام کر دے گا۔"

بُڈّھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔

"اور کیا قرض بہت زیادہ ہے؟" خواجہ نصرالدّین نے پوچھا۔

"بہت زیادہ! میں اس کا ڈھائی سو تانگوں کا قرضدار ہوں!"

"ڈھائی سو تانگے!" خواجہ نصرالدّین نے حیرت سے کہا۔ "اور ان کم بخت ڈھائی سو تانگوں کے لیے آدمی موت کی تمنّا کرتا ہے۔ اچھا، اچھا، اب اپنے کو سنبھالو۔" انہوں نے گدھے کی طرف مُڑ کر کہا اور خورجین کھولی "اچھا، میرے معزّز دوست، یہ رہے ڈھائی سو تانگے، جاؤ، یہ سُود خور کو دو اور لات مار کر اس کو اپنے گھر سے نکال دو، زندگی کے باقی دن امن چین اور ہنسی خوشی سے گزار دو۔"

چاندی کے سکوں کی جھنکار سن کر سارے گروہ میں جان پڑ گئی۔ بُڈّھے کی تو زبان ہی بند ہو گئی۔ اس نے آنسو بھری شکر گزار آنکھوں سے خواجہ کی طرف دیکھا۔

"دیکھو نا؟ اور تم اپنی مصیبت مجھے نہیں بتا رہے تھے۔" خواجہ نصر الدّین نے آخری سِکّہ گنتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہے تھے۔ "کوئی بات نہیں، آٹھ کاریگروں کی بجائے میں صرف سات ہی نوکر رکھوں گا اور وہ بہت کافی ہی ہوں گے۔"

اچانک ایک عورت جو بُڈّھے کے پاس ہی بیٹھی تھی خواجہ نصر الدّین نے پیروں پر گِر پڑی اور ڈاڑھیں مار کر روتے ہوئے اپنا لڑکا ان کی طرف بڑھا دیا:

"دیکھئے۔" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ بیمار ہے۔ اس کے ہونٹ خشک ہیں اور چہرہ جل رہا ہے۔ میرا بے کس ننھا سڑک پر مر جائے گا کیونکہ مجھے بھی گھر سے نکال دیا گیا ہے۔"

خواجہ نصر الدّین نے لڑکے کا دبلا پتلا، زرد چہرہ دیکھا، پھر اس کے شفاف ہاتھ اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ اور ان کے جھرّیوں پڑے، مصیبتوں سے مُرجھائے چہروں اور متواتر گریہ و زاری سے، دُھندلی آنکھوں سے ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جلتی ہوئی چھری ان کے دل میں اُتر گئی ہے۔ اچانک ان کا گلا رندھ گیا۔ غم و غصّے سے خون کی گرم لہر ان کے چہرے پر دوڑ گئی۔ انہوں نے اپنا رُخ موڑ لیا۔

"میں بیوہ ہوں۔" عورت نے اپنی داستان جاری رکھی۔ "میرا شوہر چھ مہینے ہوئے مر گیا۔ وہ سُود خور کا دو سو تانگوں کا قرضدار تھا۔ قانون کے مطابق میں اس قرض کی ذمے دار ہوں۔"

"واقعی لڑکا بیمار ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "یہ رہے دو سو تانگے۔ جلدی سے گھر جاؤ اور اس کے سر پر ٹھنڈی پٹی رکھو اور یہ پچاس تانگے اور ہیں۔ جاؤ کسی حکیم کو بلاؤ اور دوا خریدو۔"

خود انہوں نے سوچا۔ "میں چھ ہی کاریگروں سے کام چلا سکتا ہوں۔"

لیکن اسی لمحے ایک قد آور لمبی داڑھی والا پتھر کٹا ان کے قدموں پر گر پڑا۔ کل اس کا سارا خاندان جعفر کے چار سو تانگوں کے قرض کے لیے غلاموں کی طرح بکنے والا تھا۔

"پانچ کاریگر واقعی کم ہوئے۔" خواجہ نصر الدّین نے ایک بار پھر اپنی خورجین کھولتے ہوئے سوچا۔ ابھی اس کو انہوں نے پھر باندھا ہی تھا کہ دو عورتیں ان کے پیروں پر تھیں۔ ان کی کہانیاں بھی ایسی دل دوز تھیں کہ خواجہ نصر الدّین کا ہاتھ اتنی کافی رقم دینے سے نہ رکا جو سُود خود کا قرض ادا کرنے کے لیے کافی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر کہ باقی جو رقم رہ گئی ہے وہ تین کاریگر رکھنے کے لیے مشکل سے کافی ہو گی، انہوں نے سوچا کہ اب دُکانوں کا خیال بے کار ہے اور انہوں نے فیاضی کے ساتھ جعفر سُود خور کے دوسرے قرض داروں میں رقم بانٹ دی۔

اب خورجین میں پانچ سو سے زیادہ تانگے نہ رہ گئے ہوں گے۔ اس وقت خواجہ نصر الدّین نے ایک طرف ایک ایسا آدمی بیٹھا دیکھا جس نے مدد کی التجا نہیں کی تھی اور وہ دیکھنے سے ہی مصیبت زدہ معلوم ہوتا تھا۔

"ارے تم، سننا تو!" خواجہ نصر الدّین نے پکار کر کہا۔ "اگر تمہارے اوپر مہاجن کا قرض نہیں ہے تو تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"میں اس کا قرض دار ہوں۔" آدمی نے بھاری آواز میں کہا۔ "کل میں پابہ زنجیر غلاموں کے بازار تک جاؤں گا۔"

"تم خاموش کیوں رہے؟"

"اے فیّاض اور مہربان مسافر! میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ مقدس بزرگ بہاؤ الدّین ہوں جو غریبوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے مزار سے اُٹھ کر آئے ہیں یا خود ہارون رشید۔ میں نے آپ کی مدد نہیں مانگی کیوں کہ آپ ابھی تک کافی خرچ کر چکے ہیں اور میرا قرض

سب سے زیادہ ہے یعنی پانچ سو تانگے۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر آپ نے مجھ کو یہ رقم دے دی تو بُڈّھوں اور عورتوں کے لیے کافی نہ بچے گا۔"

"تم حق پرست، شریف اور ایماندار انسان ہو۔" خواجہ نصر الدّین نے بہت متاثر ہو کر کہا۔ "لیکن میں بھی حق پرست، شریف اور ایماندار ہوں اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کل تم پابہ زنجیر غلاموں کے بازار نہیں جاؤ گے۔ اپنا دامن بڑھاؤ۔"

انہوں نے اپنی خورجین کا آخری سِکّہ تک دے دیا۔ یہ آدمی اپنی قبا کا دامن بائیں ہاتھ سے سنبھال کر خواجہ نصر الدّین سے دائیں ہاتھ سے لپٹ گیا اور اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ ان کے سینے میں دبا دیا۔

"واقعی تم نے اپنے گدھے پر سے مزے میں قلابازی کھائی تھی۔" اچانک قد آور لمبی داڑھی والے پتھر کٹے نے زور کا ٹھٹھا مار کر کہا۔ اس پر اور دوسرے لوگ بھی قہقہے لگانے لگے۔ مرد موٹی بھاری آوازوں سے

اور عورتیں اپنی باریک آواز، بچّے مُسکرا کر خواجہ نصر الدّین کی طرف ہاتھ پھیلانے لگے جو سب سے زور سے ہنس رہے تھے۔

"ہاہاہا!" خواجہ ہنس رہے تھے اور خوشی سے دُہرے ہوئے جا رہے تھے۔ "تم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کا گدھا ہے! بڑا کمبخت ہے یہ گدھا!"

"نہیں، نہیں۔" بیمار بچّے والی عورت نے کہا۔ "اپنے گدھے کو ایسا نہ کہو۔ وہ سب سے زیادہ ہوشیار، انتہائی شریف اور دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی گدھا ہے۔ اس کا جیسا گدھا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ میں تو اپنی ساری زندگی اس کی دیکھ بھال کرنا پسند کروں گی، اس کو بہترین اناج کھانے کو دوں گی، اس پر کام کا بوجھ کبھی نہ ڈالوں گی، اس کو کھرارے سے صاف کروں گی اور دم میں کنگھا کروں گی۔ کیونکہ اگر یہ لاجواب گدھا، جو گلاب کی سی خوبیاں رکھتا ہے، خندق کے اوپر سے جست نہ لگاتا اور تم کو کاٹھی سے نہ اُتار پھینکتا تو اے مسافر، تم جو ہمارے لیے تاریکی میں

سورج بن گئے ہو، ہم کو دیکھے بغیر یہاں سے گزر جاتے اور ہم تم کو روکنے کی جرأت بھی نہ کرسکتے۔"

"ٹھیک ہی کہتی ہے۔" بُڈّھے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ہم اپنی نجات کے لیے اس گدھے کے بہت کچھ احسان مند ہیں۔ سچ مچ یہ دنیا کے لیے باعث ناز ہے اور گدھوں کے درمیان ہیرے کی طرح درخشاں۔"

پھر سب نے گدھے کی خوب خوب تعریفیں شروع کر دیں اور اس کے نان، جوار کے لائے، سوکھی خوبانیاں اور شفتالو کھلانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ گدھا اپنے دم کی مورچھل سے پریشان کرنے والی مکھیوں کو اُڑاتا جاتا اور سنجیدگی سے ان لوگوں کے ہدیے قبول کرتا رہا لیکن وہ گھبرا گھبرا کر اس چابک کو بھی دیکھتا جاتا تھا جو خواجہ نصرالدّین چپکے چپکے اسے دکھا رہے تھے۔

دن ڈھل چلا تھا، سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ لال ٹانگوں والی سارسیں غل مچاتی اور پر پھڑپھڑاتی اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہی تھیں

جہاں ان کے بچّے اپنی حریص، کھلی ہوئی چونچیں ان کی طرف بڑھا دیتے تھے۔

خواجہ نصر الدّین ان لوگوں سے رُخصت ہوئے، سب نے جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں، آپ نے ہمارے دکھ درد کو سمجھا۔"

"کیسے نہ سمجھتا؟" خواجہ نے جواب دیا۔ "آج ہی چار دُکانیں اور آٹھ کاریگر جو میرے لیے کام کر رہے تھے، ایک مکان جس کے باغ میں فوّارے اچھلتے تھے اور گانے والی چڑیاں سونے کے پنجروں میں درختوں سے لٹکی تھیں میرے ہاتھ سے جاتے رہے۔ میں تم لوگوں کی بات کیسے نہ سمجھتا!"

بُڈّھے نے اپنے پوپلے مُنہ سے کہا۔ "مسافر، میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک چیز ہے جو میں نے گھر

چھوڑتے وقت ساتھ لے لی تھی۔ یہ ہے قرآن پاک۔ لو اسے لے لو، یہ دنیا میں تمہارے لیے مشعلِ ہدایت بنے گا۔"

خواجہ نصر الدّین کو مقدس کتابوں سے کوئی سرکار نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے اس خیال سے قرآن لے لیا کہ بُڈّھے کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے، اس کو اپنی خورجین میں رکھا اور اُچک کر کاٹھی پر پہنچ گئے۔

"آپ کا نام؟ آپ کا نام؟" سب ایک ساتھ چلّائے۔ "اپنا نام تو بتاتے جایئے تاکہ ہم آپ کے لیے دُعا کر سکیں۔"

"تم لوگوں کو میرا نام جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ حقیقی نیکی کے لیے شہرت نہ چاہیے۔ جہاں تک دُعا کا تعلق ہے تو اللہ کے پاس اچھے کاموں کی خبر پہنچانے کے لیے مقدس فرشتوں کی کثیر تعداد ہے۔ اگر یہ فرشتے سست اور لاپرواہ ہیں اور زمین پر نیک و بد اعمال کے شمار کی بجائے نرم بادلوں پر سوتے رہتے ہیں تو آپ کی دعائیں بھی بیکار ہوں گی کیونکہ اللہ معتبر اشخاص کی تصدیق کے بغیر ان کو نہیں سنے گا۔"

جب خواجہ بول رہے تھے تو ایک عورت نے گھٹی ہوئی آہ سی بھری۔ یہی دوسری عورت نے بھی کیا۔ پھر بُڈّھا چونکا اور خواجہ نصر الدّین کو گھورنے لگا۔ لیکن خواجہ کو جلدی تھی اور انہوں نے کوئی توجّہ نہ کی۔

"خدا حافظ! تم امن چین سے رہو اور خوشحال ہو۔"

لوگوں کی دُعا کے ساتھ وہ سڑک کے موڑ پر غائب ہو گئے۔

باقی لوگ خاموش کھڑے تھے۔ صرف ایک خیال ان کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ اس خاموشی کو بُڈّھے نے توڑا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے متاثر کن لہجے میں کہا:

"دنیا میں صرف ایک ہی آدمی یہ کام کر سکتا تھا۔ ہاں، اور دنیا میں صرف ایک آدمی ایسی باتیں کہہ سکتا تھا اور دنیا میں صرف ایک آدمی کی روح ایسی ہے جس کی روشنی اور گرمی غریبوں اور مظلوموں کے دلوں کو منوّر کرتی ہے اور گرمی بخشتی ہے اور یہ آدمی ہیں ہمارے۔۔۔"

"زبان بند رکھو!" ایک آدمی نے جلدی سے لقمہ دیا۔ "کیا تم بھول گئے کہ دیواروں کی آنکھیں ہوتی ہیں اور پتھروں کے کان، ابھی ہزاروں کتّے ان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" تیسرے آدمی نے کہا۔ "ہمیں اپنی زبانیں بند رکھنی چاہئیں کیونکہ اس وقت ان کی حالت ایسی ہے کہ وہ ایک تنے ہوئے رسّے پر چل رہے ہیں۔ ذرا سا دھکا بھی ان کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔"

"چاہے وہ میری زبان کھینچ لیں میں ان کا نام نہیں بتاؤں گی!" بیمار بچے والی عورت نے کہا۔

"میں بھی خاموش رہوں گی۔" دوسری عورت نے کہا۔ "مجھے موت آ جائے جو میں بھولے سے بھی ان کو رسّے تک پہنچاؤں۔"

غرض سب نے اس طرح کی باتیں کہیں سوائے قد آور لمبی داڑھی والے پتھر کٹے کے جو ذرا زود فہم نہ تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا اس سے نہ

کچھ سمجھ سکا کہ آخر اس مسافر کے پیچھے کتّے کیوں پڑ جائیں گے۔ وہ نہ تو کوئی قصاب ہے اور نہ قورمہ بیچنے والا۔ پھر اگر مسافر تنے ہوئے رسّے پر چلنے والا ہے تو اس کا نام زور سے کیوں نہ لینا چاہیے۔ اور وہ عورت اپنے محسن کو رسّے تک پہنچانے پر مرنے کو کیوں ترجیح دیتی ہے جو ان کے پیشے کے لیے ضروری ہے؟ اب پتھر کٹا بالکل حیران ہو چکا تھا۔ وہ زور سے کھنکارا، ایک گہرا سانس لے کر فیصلہ کیا کہ اس کے بارے میں بالکل نہ سوچے ورنہ وہ پاگل ہو جائے گا۔

اس دوران خواجہ نصرالدّین کافی فاصلہ طے کر چکے تھے لیکن اب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ان غریبوں کے سوکھے ہوئے چہرے پھر رہے تھے۔ ان کو بیمار بچّہ برابر یاد آ رہا تھا، اس کے بخار سے تپتے ہوئے رخسار اور خشک ہونٹ۔ انہوں نے اس سفید ریش بُڈّھے کے بارے میں سوچا جس کو گھر سے نکال دیا گیا تھا اور ان کے دل کی گہرائیوں سے شدید غصّے کا سیلاب امنڈ پڑا۔

"ذرا ٹھہر تو سہی، سُود خور، ذرا ٹھہر!" وہ بڑبڑائے اور ان کی کالی آنکھوں میں ایک خطرناک شعلہ لپکا۔ "میں تمہاری حالت بُری بنا دوں گا۔ اور امیر جہاں تک تیرا تعلق ہے۔" وہ بڑبڑاتے گئے۔ "کانپ کر زرد پڑ جا کیونکہ میں، خواجہ نصر الدّین بخارا آگیا ہوں! میرے بدحال لوگوں کا خون چوسنے والی بد ذات اور ہولناک جونک ہو! او خونخوار حریص بھیڑیو! اے گندے گیدڑو! تم ہمیشہ تو پروان نہیں چڑھو گے اور نہ لوگ ہی ہمیشہ پریشان حالی میں مبتلا رہیں گے! اور جہاں تک جعفر سُود خور تیرا تعلّق ہے، میرا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شرمسار رہے گا اگر میں ان تمام مصیبتوں کا عوض تجھ سے نہ چکالوں جو تو غریبوں پر توڑتا ہے۔"

۷

خواجہ نصر الدّین نے جو دنیا کے بہت سے نرم گرم برداشت کر چکے تھے، اپنے وطن میں پہلا دن بہت بے چینی اور سانحوں سے بھرا ہوا گزارا۔ وہ تھک گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسی الگ تھلگ جگہ مل جائے جہاں آرام کر سکیں۔

"نہیں۔" انہوں نے ایک تالاب کے گرد جمع لوگوں کا مجمع دیکھ کر ایک آہ بھری۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آج میری قسمت میں آرام نہیں ہے! یہاں کچھ ہو گیا ہے۔"

تالاب سڑک سے تھوڑے فاصلے پر تھا اور خواجہ نصر الدّین آسانی سے اس کو چھوڑ کر آگے جا سکتے تھے لیکن وہ ایسے آدمی نہیں تھے کہ کسی لڑائی جھگڑے اور ہنگامے کے موقع کو ہاتھ سے جانے دیں۔

گدھا بھی جوان کے ساتھ مدتوں رہتے رہتے اپنے مالک کے طور طریقوں سے خوب آشنا ہو چکا تھا خود ہی تالاب کی طرف مڑ گیا۔

"کیا معاملہ ہے؟" گدھے کو مجمع میں گھسیڑتے ہوئے خواجہ نے چلّا کر پوچھا۔ "کیا کسی کا قتل ہو گیا ہے؟ کیا کوئی لٹ گیا؟ راستہ دو، راستہ!"

وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے تالاب کے کنارے تک پہنچ گئے جو سبز کائی سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہاں انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کنارے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک آدمی ڈوب رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کے اوپر آتا اور پھر اندر چلا جاتا اور پانی سے بڑے بڑے بلبلے نکلنے لگتے۔

"ارے احمقو!" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "یقیناً تم اس کی قیمتی قبا اور ریشمی عمامے سے دیکھ سکتے ہو کہ یہ آدمی یا تو کوئی ملا ہے یا امیر عہدے دار؟ اور کیا تم کو ملّاؤں اور عمائدین کے طریقے نہیں معلوم ہیں کہ ان کو پانی سے کس طرح گھسیٹا جائے؟"

"تم خود گھسیٹ لو نا اور اگر طریقہ جانتے ہو تو بچا لو۔" مجمع میں شور ہوا "جاؤ، بچاؤ! وہ پھر اوپر آ گیا ہے!"

"ٹھہرو۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "میں نے ابھی اپنی تقریر ختم نہیں کی ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے کبھی کسی ملا یا امیر عہدے دار کو کسی کو کچھ دیتے دیکھا ہے؟ تو اے جاہلو وہ صرف لیتے ہیں۔ اس لیے ان کو ذرا ترکیب سے بچانا چاہیے، یعنی ان کی مزاجی خصوصیات کے لحاظ سے۔ اب ذرا دیکھنا مجھے۔"

"لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے!" مجمع سے آوازیں آئیں۔ "اب وہ اوپر نہیں آئے گا۔"

"کیا تمہارے خیال میں پانی کی دیویاں کسی ملا یا بڑے افسر کو اتنی آسانی سے قبول کر لیں گی؟ نہیں تم غلطی پر ہو۔ پانی کی دیویاں اس سے نجات پانے کی پوری کوشش کریں گی۔"

خواجہ نصر الدّین زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے اور اطمینان سے انتظار کرنے لگے۔ وہ تہہ سے بُلبُلوں کو اوپر آتے اور کنارے تک تیرتے دیکھ رہے تھے جن کو ہلکی ہوا اس طرف دھکیل رہی تھی۔

آخر کار وہ سیاہ شکل آہستہ آہستہ گہرائیوں سے ابھری۔ ڈوبتا آدمی سطح پر دکھائی دیا۔ اگر خواجہ نصر الدّین نہ ہوتے تو وہ آخری بار اوپر آیا ہوتا۔

"ارے، یہ لو!" خواجہ نصر الدّین ہاتھ بڑھا کر چلائے۔ "یہ لو!"

ڈوبتے ہوئے آدمی نے انتہائی بدحواسی میں ہاتھ کو مضبوط پکڑ لیا۔ خواجہ نصر الدّین کا اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے مُنہ بگڑ گیا۔

بچائے ہوئے آدمی نے انگلیاں چھڑانے میں کافی وقت لگ گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ سیوار اور بدبودار کائی سے ڈھکا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ پھر اس کے مُنہ، ناک اور کانوں سے پانی نکلنے لگا۔

"میرا بٹوہ! میرا بٹوہ کہاں ہے؟" وہ کراہ رہا تھا اور اس وقت تک اسے چین نہ آیا جب تک بٹوہ اس کے پاس نہ پہنچ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے گھاس پھونس جھاڑی اور اپنی قبا کے دامن سے چہرہ صاف کیا۔ خواجہ نصر الدّین پیچھے ہٹ گئے۔ چپٹی ٹوٹی ناک، چوڑے چوڑے نتھنوں اور پھلی آنکھ نے اس کا چہرہ خوفناک بنا دیا تھا۔ آدمی کبڑا بھی تھا۔

"یہ رہے!" مجمع نے غل مچایا اور خواجہ نصر الدّین کو آگے بڑھا دیا۔

"ادھر آؤ، میں تم کو انعام دینا چاہتا ہوں۔" آدمی نے اپنے پانی سے بھرے ہوئے بٹوے میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر چاندی کے سکے نکالے "حالانکہ یہ کوئی بہت ہی لاجواب یا غیر معمولی بات نہیں ہے کہ تم نے

مجھ کو نکال لیا۔ میں خود ہی نکل آتا۔" اس نے ناشکرے پن سے اضافہ کیا۔

جب وہ بات کر رہا تھا تو معلوم نہیں کمزوری یا کسی دوسرے سبب سے اس کی مٹھی آہستہ سے کھلی اور سکے اس کی انگلیوں سے پھسل کر ہلکی جھن جھناہٹ کے ساتھ بٹوے میں پھر جا رہے۔ صرف ایک سِکّہ اس کے ہاتھ میں بچ رہا، نصف تانگے کا۔ ایک آہ سرد بھرتے ہوئے اس نے یہ سِکّہ خواجہ نصر الدّین کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو اور بازار جا کر اپنے لیے ایک قاب پلاؤ خرید لینا۔"

"یہ تو ایک قاب پلاؤ خریدنے کے لیے کافی نہیں ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔

"اچھا، کوئی بات نہیں، بلا گوشت کے سادے چاول ہی سہی۔"

"دیکھتے ہو نا۔" خواجہ نصر الدّین نے پاس کھڑے لوگوں کو مخاطب کیا۔ "میں نے تو اس کی فطرت کے مطابق ترکیب سے اس کی جان بچائی۔"

پھر وہ اپنے گدھے کے پاس چلے گئے۔

راستے میں ان کو ایک لمبے، چھریرے اور مضبوط بازوؤں والے آدمی نے روکا، اس کا چہرہ روکھا تھا۔ اس کے بازو کالک اور کوئلے سے سیاہ ہو رہے تھے اور اس کے پٹکے میں لوہار کی سنسی لگی ہوئی تھی۔

"کیا ہے، بھئی لوہار؟" خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔

"دیکھو۔" لوہار نے ان کو ناراضگی کے ساتھ اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ تم نے کس کو بچایا ہے؟ اور وہ بھی آخری وقت، جب اس کو کوئی نہیں بچا سکتا تھا؟ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے اس فعل کی وجہ سے کتنے آنسو بہیں گے؟ پتہ ہے کہ کتنے آدمی اپنے گھر بار، کھیتوں اور انگور کے باغیچوں سے محروم ہو جائیں گے یا

غلاموں کے بازار میں پہنچ جائیں گے اور وہاں سے پابہ زنجیر خیوا کی شاہراہ پر نظر آئیں گے!"

خواجہ نصر الدّین حیرت سے اس کا مُنہ تک رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "بھائی لوہار! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا کوئی انسان کہلانے کا مستحق اور مسلمان ڈوبتے ہوئے آدمی کے پاس سے گزر جائے گا اور اس کی مدد کے لیے ہاتھ نہ بڑھائے گا؟"

"تو تمہارا خیال ہے کہ آدمی کو تمام زہریلے سانپ بچھوؤں اور بھیڑیوں کو بچانا چاہیے؟" لوہار نے زور سے کہا۔ پھر اس کو کچھ خیال آیا اور اس نے کہا "کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں، میں دور دراز سے آیا ہوں۔"

”تو پھر تم نہیں جانتے کہ جس آدمی کی جان تم نے بچائی ہے وہ بہت بد ذات اور خون چوسنے والا ہے اور بخارا کا ہر تیسرا آدمی اس کی وجہ سے نالاں اور گریاں ہے!“

خواجہ نصر الدّین کے دماغ میں ایک ہولناک خیال چمک اٹھا۔

”لوہار!“ وہ یہ ڈرتے ہوئے رک گئے کہ کہیں ان کا خیال صحیح نہ ثابت ہو "اس آدمی کا نام مجھے بتا دو۔“

”تم نے جعفر سُود خور کو بچایا ہے، خدا اس کی زندگی اور عاقبت دونوں خراب کرے! خدا کرے کہ اس کی چودہ نسلوں تک کے سڑے زخم ہوں!“ لوہار نے جواب میں کہا۔

” کیا کہا؟“ خواجہ نصر الدّین چلائے۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہائے افسوس، افسوس! کیسی شرمناک بات میں نے کی! کیا میرے ہاتھوں نے اس

سانپ کو پانی سے نکالا؟ سچ مچ اس گناہ کا کوئی ازالہ نہیں ہو سکتا! افسوس، شرف کی بات ہے!"

اس کی ندامت سے لوہار متاثر ہو کر ذرا نرم پڑا۔

"مسافر، چُپ کرو، اب کیا ہو سکتا ہے۔ تم اس وقت تالاب تک کیوں پہنچے۔ تمہارا گدھا سڑک پر ہی اڑ کر کیوں نہیں رک گیا؟ سُود خور کو ڈوبنے کا موقع مل جاتا۔"

"یہ گدھا!" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "اگر یہ سڑک پر رکتا ہے تو صرف میری خورجینیں پیسے سے خالی کرانے کے لیے کیونکہ اگر وہ بھری ہوں تو اس کے لیے بھاری ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب میری بدنامی کا سوال ہوتا ہے، سُود خور کو بچانے کا، تو یقین کرو کہ یہ گدھا ضرور مجھے وقت پر وہاں پہنچائے گا!"

"ہاں۔" لوہار نے اتّفاق کیا۔ "لیکن جو کچھ ہوا وہ واپس نہیں لیا جا سکتا۔ سُود خور کو اب تالاب میں واپس نہیں دھکیلا جا سکتا۔"

خواجہ نصر الدّین چونک پڑے۔

"مجھ سے ایک بُرا کام ہو گیا لیکن میں اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا! سنو! بھائی لوہار، میں قسم کھاتا ہوں کہ جعفر سُود خور کو میں ڈبوؤں گا۔ میں اپنے والد کی ریش مبارک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ ہاں، میں اس کو اسی تالاب میں ڈبوؤں گا! لوہار! میری قسم یاد رکھنا۔ کیونکہ میں فضول بات نہیں کرتا۔ سُود خور ڈوبے گا! اور جب تم اس کے بارے میں بازار میں سننا تو یہ سمجھ لینا کہ میں نے بخارا شریف کے شہریوں کے سامنے اپنے جرم کا خمیازہ پورا کر دیا ہے!"

۸

جب خواجہ نصر الدّین بازار پہنچے تو شفق کی روشنی ٹھنڈے اور خوشبو دار دُھند کی طرح شہر پر چھاتی جا رہی تھی۔

چائے خانوں میں خوشگوار الاؤ جلنے لگے تھے اور جلد ہی پورے بازار کو روشنیوں نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ کل ایک بڑا بازار ہونے والا تھا۔ اونٹوں کے کارواں جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ جب کوئی کارواں اندھیرے میں غائب ہو جاتا تو اس کی سُریلی، صاف اور اداس گھنٹیوں کی آواز بڑی دیر تک ہوا میں گونجتی رہتی اور جب دُور یہ آواز غائب ہو جاتی تو دوسرا کارواں چوراہے پر آ جاتا اور اس کی گھنٹیاں بجنے لگتیں اور اداس

گیت سنانے لگتیں۔ یہ اس طرح جاری تھا جیسے رات خود دنیا کے کونے کونے سے لائی ہوئی آوازوں سے بھر گئی ہو اور آہستہ آہستہ گنگناتی، تھرتھراتی اور کراہتی ہو۔ ہندوستان، ایران، عرب، افغانستان اور مصر کی اَن دیکھی گھنٹیاں گونج رہی تھیں۔ خواجہ نصرالدّین ان کے نغمے سُن رہے تھے اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ان کو تا ابد سُن سکتے ہیں۔ قریب ایک چائے خانے میں طنبورہ بج رہا تھا اور اس کا ساتھ دوتارے کے تار دے رہے تھے۔ کسی ان دیکھے گائک نے اپنی صاف آواز ستاروں تک پہنچادی تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کے بارے میں گا کر اس کا شکوہ کر رہا تھا۔

اس پُر نغمہ فضا میں خواجہ نصرالدّین رات بھر ٹھہرنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے۔

"میرے پاس اپنے اور گدھے کے لیے آدھا تانگا ہے۔" انہوں نے ایک چائے خانے کے مالک سے کہا۔

"آدھے تانگے میں تم رات تو یہاں گزار سکتے ہو۔" مالک نے کہا۔ "لیکن کمبل نہیں ملے گا۔"

"اور میں اپنا گدھا کہاں باندھوں؟"

"مجھے گدھے سے کیا مطلب؟"

چائے خانے کے قریب کوئی باندھنے کی جگہ نہ تھی۔ خواجہ نصرالدّین نے دیکھا کہ برساتی کے نیچے ایک آنکڑا نکلا ہوا ہے اور یہ بغیر دیکھے کہ آنکڑا کس چیز میں لگا ہے انہوں نے اپنا گدھا اس میں باندھ دیا۔ چائے خانے کے اندر پہنچتے ہی وہ دراز ہو گئے کیونکہ وہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔

وہ ابھی اونگھ ہی رہے تے کہ ان کو اپنا نام سنائی دیا اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

قریب ہی کچھ آدمی جو بازار آئے تھے ایک چھوٹے سے حلقے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں ایک ساربان تھا، ایک گلہ باد اور دو کاریگر۔ ان میں ایک مدہم آواز میں کہہ رہا تھا:

"خواجہ نصر الدّین سے یہ بھی موسوم ہے۔ ایک دن وہ بغداد میں بازار سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک باورچی خانے میں غل غپاڑہ سنا۔ جانتے ہی ہو کہ ہمارے خواجہ نصر الدّین کتنے کھوجی آدمی ہیں وہ اندر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ موٹا، لال چہرے والا باورچی خانے کا مالک ایک فقیر کی گدی میں ہاتھ دے کر اسے ہلا رہا تھا۔ وہ فقیر سے پیسے طلب کر رہا تھا لیکن فقیر کچھ دینے سے انکار کر رہا تھا۔

"یہ ہنگامہ کیوں ہے؟" ہمارے خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔ "تم دونوں کیوں جھگڑ رہے ہو؟"

یہ ہنگامہ کیوں ہے؟ ہمارے خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔ "تم کیوں جھگڑ رہے ہو؟"

"یہ بدمعاش، کمینہ، چور، اس کی آنتیں سڑیں۔" مالک نے چیخ کر کہا۔ "میرے باورچی خانے میں آیا، اپنی بغل سے نان کا ایک ٹکڑا نکالا اور بڑی دیر تک اس کو انگیٹھی کے اُوپر سینکتا رہا یہاں تک کہ نان میں بوٹی کے کبابوں کی خوشبو آ گئی اور وہ زیادہ نرم اور مزے دار ہو گئی۔ پھر یہ روٹی چٹ کر گیا۔ اور اب، اس کے دانت گریں، کھال پھٹ جائے، پیسے نہیں دیتا ہے!"

"یہ سچ ہے؟" خواجہ نصرالدّین نے درشتی سے پوچھا۔ فقیر اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کے مُنہ سے کوئی بات ہی نہ نکلی اور اس نے صرف سر ہلا دیا۔

"جانتے ہو، یہ غلط بات ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے کہا۔ "یہ غلط بات ہے کہ کسی کی ملکیت کا مفت استعمال کیا جائے۔"

"سن رہا ہے نا، یہ معزّز اور لائق صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟" باورچی خانے کے مالک نے خوش ہو کر کہا۔

"تمہارے پاس پیسے ہیں؟" خواجہ نصر الدّین نے فقیر سے پوچھا۔ فقیر نے اپنا ایک ایک پیسہ نکال کر خواجہ نصر الدّین کے حوالے کر دیا۔ باورچی خانے کے مالک نے اپنا چکٹا ہاتھ پیسے لینے کے لیے بڑھایا۔

"حضت، ذرا رُکیے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "پہلے اپنا ذرا اپنا کان ادھر لائیے۔"

"اور کافی دیر وہ سکوں کو مُٹھّی میں لیے مالک کے کان میں بجاتے رہے۔ پھر انہوں نے فقیر کو پیسے واپس دیتے ہوئے کہا۔ "اطمینان سے جاؤ، سائیں جی!"

"کیا!" باورچی خانے کا مالک چلایا۔ "لیکن مجھے تو پیسے ملے ہی نہیں۔"

"اس نے تم کو پورے دام دیے ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "اب تم دونوں برابر ہو۔ اس نے تمہارے بوٹی کے کباب سونگھے اور تم نے اس کے سکوں کی جھنکار سنی۔"

سب سننے والے زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ ان میں سے ایک آدمی نے جلدی سے سب کو روک کر کہا۔ "اتنے زور سے نہیں ورنہ وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم خواجہ نصر الدّین کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔"

"ان کو کیسے پتہ ہے؟" خواجہ نصر الدّین نے مُسکراتے ہوئے سوچا۔ "دراصل یہ بغداد کا نہیں بلکہ استنبول کا واقعہ ہے۔ پھر ان کو کیسے معلوم ہوا؟"

پھر دوسرے آدمی نے، جو گلہ بان کے لباس میں تھا اور رنگین پگڑی باندھے ہوئے تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدخشاں کا رہنے والا ہے اپنا قصّہ مدہم آواز میں شروع کیا:

"کہا جاتا ہے کہ ایک دن خواجہ نصر الدّین ایک ملا کی باڑی کے پاس سے گزر رہے تھے۔ ملا کچھ کدّو ایک بورے میں بھر رہا تھا۔ لالچ میں آکر اس نے بورے میں اتنے کدّو بھر لیے تھے کہ بورے کو لے جانا تو الگ رہا

اس کو اُٹھانا تک ممکن نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر تک رہا تھا کہ بورا گھر کیسے پہنچے۔ اس نے ایک راہ گیر کو دیکھا اور بہت خوش ہوا۔

"سنو بیٹے، کیا تم یہ بورا میرے گھر تک پہنچا دو گے ؟"

اس وقت خواجہ نصر الدّین کے پاس پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے ملا سے پوچھا۔ "تم مجھے کیا دو گے ؟"

"بیٹا، پیسے کیوں مانگتے ہو ؟ بورا لے جاتے وقت راستے میں تم کو میں تین انتہائی حکیمانہ قول بتاؤں گا جن سے تمہیں زندگی میں مسرت نصیب ہو گی۔"

"میں یہ قول ضرور سنوں گا۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا۔ ان کو بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بورے کو کاندھے پر لاد کر چل پڑے۔ راستہ پہاڑی پر تھا اور ڈھلوان کے پاس۔ خواجہ نصر الدّین دم لینے کے لیے رُکے۔ ملا نے بہت سنجیدہ اور پُر اسرار انداز میں کہا۔ "اچھا، پہلا قول سُنو

کیونکہ آدم کے زمانے سے لے کر اب تک اس سے بڑا حکیمانہ قول ساری دنیا میں نہیں پیدا ہوا ہے۔ اگر تم اس کے معنوں تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ گویا الف لام میم کے رمز سے واقف آگاہ ہو گئے جس سے ہمارے پیغمبر اور ہادی حضرت محمدؐ نے قرآن شریف کے دوسرے سورے کی ابتدا کی ہے۔ غور سے سنو! اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ سواری پر چلنے سے پیدل چلنا بہتر ہے تو اس کی بات مت مانو۔ بیٹے میرے الفاظ نہ بھولنا اور برابر دن رات ان پر غور کرنا اور تب تم اس کی دانش مندی کی گہرائیوں تک پہنچ سکو گے۔ لیکن یہ قول تو دوسرے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو میں تمہیں اس درخت کے قریب بتاؤں گا۔ دیکھو، وہ رہا آگے۔"

"ذرا ٹھہرو تو، ملا صاحب۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا اور پسینے سے شرابور وہ بورے کو درخت تک لے گئے۔

ملا نے ایک اُنگلی اٹھا کر کہا۔ "دوسرا قول سنو کیونکہ اس کا انحصار پورے قرآن، نصف شریعت اور ایک چوتھائی طریقت پر ہے۔ جو آدمی اس کو

سمجھ لے گا وہ نیکی اور سچائی کے راستے سے کبھی نہیں ہٹے گا۔ اس لیے بیٹے، اس قول کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہو کہ یہ تمہیں مفت حاصل ہو رہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ غریب کی زندگی امیر سے آسان ہے تو مت یقین کرو۔ لیکن یہ دوسرا قول تو تیسرے کے پاسنگ نہیں، تیسرا قول ایسا منوّر ہے کہ اس کا مقابلہ بس سورج کی چکا چوند کر دینے والی روشنی اور بحر ذخار کی گہرائی سے کیا جاتا ہے۔ میں یہ قول تم کو اپنے گھر کے پھاٹک پر بتاؤں گا۔ آؤ جلدی کریں، کیونکہ اب میں دم لے چکا ہوں۔“

”مولانا ذرا ٹھہریے!“ خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ ”میں آپ کا تیسرا قول بوجھ گیا۔ آپ اپنے گھر کے پھاٹک پر مجھ سے یہ کہیں گے کہ ہوشیار آدمی ہمیشہ بیوقوف آدمی سے اپنے کدّو بھرے بورے مُفت ڈھلوا لیتا ہے۔“

ملا حیرت سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ خواجہ نصر الدّین نے ٹھیک کہا تھا۔

"اب ملا صاحب میرا واحد قول سنئے جو آپ کے تمام قولوں کے برابر ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور قسم ہے پیغمبر صاحب کی کہ میرا قول ایسا چکا چوند کرنے والا اور گہرا ہے کہ اس کا انحصار سارے اسلام، قرآن، شریعت اور طریقت اور بہت سی کتابوں پر ہے، بدھ، عیسائی اور یہودی مذاہب کی کتابوں پر بھی۔ ملا صاحب، سچّے مذہب کی مجھے تعلیم اور ہدایت دینے والے بزرگ، اب میں آپ کے سامنے ایسے ناقابلِ تردید دانش مندانہ قول کا انکشاف کروں گا جس سے بہتر نہ تو پہلے کبھی تھا اور نہ آئندہ ہو گا۔ لیکن ذرا اس کے لیے پہلے سے تیاری کر لیجئے تاکہ آپ بے قابو نہ ہو جائیں کیونکہ اس سے آدمی آسانی سے پاگل بن سکتا ہے۔ یہ قول ایسا ہی متحیّر کُن، عجیب اور اتھاہ ہے۔ ملا صاحب، اپنے دماغ کو فولاد بنا کر اس کو سنئے۔ اگر کوئی آپ سے کہے کہ یہ کدّو ٹوٹے نہیں ہیں تو اس کے مُنہ پر تھوک دیجئے، اس کو جھوٹا کہہ کر اپنے گھر سے نکال دیجئے!"

یہ کہہ کر خواجہ نصر الدّین نے بورا اٹھایا اور اس کو ڈھلوان سے نیچے چھوڑ دیا۔ کدّو بورے سے لڑھک کر باہر آ گئے اور پتھروں سے ٹکراتے، اچکتے اور کھڑکھڑاتے نیچے چلے گئے۔

"ارے ہائے، ہائے۔" ملا فریاد کرنے لگا۔ "کیسا نقصان ہوا، تباہ ہو گیا!" پاگلوں کی طرح وہ چیخنے، گریہ وزاری کرنے اور اپنا چہرہ نوچنے لگا۔

"دیکھئے نا۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرا قول ممکن ہے آپ کو پاگل بنا دے!"

سُننے والوں میں پھر قہقہہ گونجا۔

کونے میں گرد آلود، جوئیں بھری چٹائی پر لیٹے لیٹے خواجہ نصر الدّین نے سوچا:

"اچھا تو انہوں نے یہ بھی سُن رکھا ہے! لیکن کیسے؟ راستے پر تو بس ہم دونوں تھے۔ ملا اور میں اور میں نے کسی سے بھی نہیں کہا۔ شاید جب ملا کو

یہ پتہ چلا ہو گا کہ کون اس کے کدّو لے جا رہا تھا تو اس نے لوگوں سے کہا ہو گا۔“

اب تیسرے نے اپنا قصّہ شروع کر دیا:

”ایک دن خواجہ نصر الدّین شہر سے اس ترکی کے گاؤں لوٹ رہے تھے جہاں وہ رہنے لگے تھے۔ وہ تھک کر ایک چشمے کے کنارے لیٹ گئے اور پانی کی قلقل کی آواز اور بہار کی مہک دار ہوا میں بِلا ارادہ سو گئے۔ انہوں نے خواب میں یہ دیکھا کہ وہ مر گئے ہیں۔ ”اگر میں مر گیا ہوں۔“ انہوں نے فیصلہ کیا۔ ”نہ تو مجھے حرکت کرنی چاہیے اور نہ آنکھیں کھولنی چاہئیں۔“ اس لیے وہ بالکل ساکت نرم گھاس پر پڑے رہے اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ مُردہ ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے کیونکہ اس طرح فانی دنیا کے وجود کی تمام فکروں اور جھگڑوں سے جو متواتر پریشان کرتی رہتی ہیں آزاد ہو کر اطمینان سے لیٹا جا سکتا ہے۔

کچھ مسافروں نے جو اُدھر سے گزر رہے تھے، خواجہ نصر الدّین سے کو دیکھا۔

"دیکھو!" ایک نے کہا۔ "مسلمان ہے۔"

"مر گیا ہے۔" دوسرا بولا۔

"ہمیں اسے قریب ترین گاؤں لے چلنا چاہیے۔" تیسرے نے کہا۔

یہ وہی گاؤں تھا جہاں خواجہ نصر الدّین جا رہے تھے۔

آدمیوں نے کئی شاخیں کاٹ کر ایک اسٹریچر سا بنا لیا اور اس پر خواجہ نصر الدّین کو لٹا دیا۔ وہ ان کو لے کر بہت دیر تک چلتے رہے اور خواجہ صاحب آنکھیں بند کئے ایسے مُردے کی طرح پڑے رہے جس کی روح جنّت کے دروازے تک پہنچ چکی ہو۔

اچانک اسٹریچر رُک گیا۔ راہی ایک دریا پار کرنے کے بارے میں بحث کرنے لگے۔ ایک نے تجویز پیش کی کہ دائیں طرف جانا چاہیے، دوسرے

نے کہا بائیں اور تیسرے نے کہا سیدھے دریا کے پار۔ خواجہ نصر الدّین نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا کہ یہ لوگ دریا کے سب سے گہرے، انتہائی تیز باؤ والے اور بہت ہی خطرناک حصّے کے پاس کھڑے ہیں جہاں بہت سے لاپروالوگ ڈوب چکے تھے۔

"مجھے اپنی پروا نہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا۔ "کیونکہ میں تو مر چکا ہوں اور اب میں چاہے قبر میں لیٹوں یا دریا کی تہہ میں، کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن ان مسافروں کو ضرور آگاہ کر دینا چاہیے کیونکہ وہ میرے اوپر مہربان ہونے کی وجہ سے اپنی جان گنوا سکتے ہیں۔ ان کو آگاہ نہ کرنا میرے لیے بڑی ناشکری کی بات ہو گی۔"

وہ اسٹریچر پر ذرا سا ابھرے اور ندی کی طرف اشارہ کر کے دھیمی آواز میں بولے۔ "مسافرو، جب میں زندہ تھا تو میں دریا کو حور کے ان درختوں کے پاس پار کیا کرتا تھا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر

لیں۔ مسافروں نے خواجہ نصر الدّین کا شکریہ ادا کیا اور بخشائش کی دعائیں کرتے ان کے اسٹریچر کو لے کر پھر آگے بڑھ گئے۔

جب سُننے والے اور کہانی کہنے والا دونوں ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے، خواجہ نصر الدّین ناراض ہو کر بڑبڑا رہے تھے:

"ان لوگوں نے سب گڈ مڈ کر دیا ہے۔ اوّل تو میں نے یہ خواب کبھی نہیں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ میں یہ نہ سمجھ سکوں کہ مردہ ہوں یا زندہ۔ ارے، مجھے یہ تک یاد ہے کہ ایک پسّو مجھے کاٹ رہا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میں کھجلا سکتا۔ یقیناً یہ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ میں زندہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے پسّو کے کاٹنے کا احساس نہ ہوتا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں بہت تھک گیا تھا اور چلنا نہیں چاہتا تھا۔ مسافر مضبوط تھے اور ان کے لیے یہ کوئی بات نہ تھی کہ وہ ذرا اپنے راستے سے ہٹ کر مجھے گاؤں پہنچا دیں۔ لیکن جب انہوں نے دریا کو

ایسی جگہ سے پار کرنا چاہا جہاں تین آدمیوں کے ڈباؤ بھر پانی تھا تو میں نے ان کو روک دیا۔ مجھے تو ان کے خاندانوں کا خیال تھا اپنے خاندان کا نہیں کیونکہ میرا خاندان تو ہے ہی نہیں۔ اور مجھے فوراً اپنی ناشکری کا تلخ پھل چکھنا پڑا کیونکہ میرے بر وقت انتباہ پر شکر گزار ہونے کی بجائے مجھے مسافروں نے اسٹریچر سے نکال پھینکا اور مکّوں سے میری خاطر کی۔ وہ میری خوب مرمّت کرتے اگر میرے تیز رفتار پیروں نے میری مدد نہ کی ہوتی۔ واقعی، عجیب بات ہے، لوگ سچ کو کیسا توڑ موڑ لیتے ہیں!"

اس دوران میں چوتھے آدمی نے اپنا قصّہ چھیڑ دیا:

"خواجہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک بار وہ تقریباً چھ مہینے تک ایک گاؤں میں رہے جہاں وہ اپنی ذہانت اور حاضر جوابی کی وجہ سے کافی مشہور ہو گئے تھے۔۔۔"

خواجہ نصر الدّین کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے یہ آواز کہاں سنی تھی۔ بہت بلند نہیں لیکن صاف اور ذرا بھاری اور حال ہی میں۔۔۔ شاید آج ہی۔۔۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن یاد نہ آیا۔

آدمی نے اپنی داستان جاری رکھی:

"ایک دن صوبے کے گورنر نے اس گاؤں کو اپنا ہاتھی بھیج دیا جہاں خواجہ نصر الدّین رہتے تھے۔ گاؤں والوں کو ہاتھی کی خوراک مہیّا کرنی اور اس کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ ہاتھی بڑا کھاؤ تھا۔ چوبیس گھنٹے میں اس نے پچاس دھرے جَو، پچاس دھرے باجرہ، پچاس دھرے مکئی اور ایک سو گٹھے گھاس ہڑپ کر لی۔ دو ہفتے میں گاؤں والوں کا سارا ذخیرہ ہاتھی کی نذر ہو گیا۔ وہ بالکل تباہ اور سخت پریشان ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خواجہ نصر الدّین کو گورنر کے پاس یہ التجا لے کر بھیجیں گے کہ اپنا ہاتھی واپس بُلا لے۔

اب انہوں نے خواجہ نصر الدّین سے درخواست کی اور وہ اس پر تیّار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے گدھے پر کاٹھی کسی، جس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ ضدّی، بدمزاج اور کاہل ہونے میں وہ گیدڑ، مکڑی، سانپ اور مینڈک کا مجموعہ ہے۔ کاٹھی کس کر خواجہ نصر الدّین گورنر سے ملنے چل دیے لیکن جانے سے پہلے وہ گاؤں والوں سے یہ طے کرنا نہیں بھولے کہ ان کی خدمات کا معاوضہ کیا ہو گا۔ دراصل انہوں نے اتنی بڑی رقم لی کہ بہتوں کو اپنا گھر بار بیچنا پڑا اور خواجہ نصر الدّین کی وجہ سے وہ محتاج ہو گئے۔"

"ہونہہ۔" اس کونے سے آواز آئی جہاں خواجہ نصر الدّین نمدے پر پڑے اپنے غصّے کو ضبط کرنے کے لیے کروٹیں بدل رہے تھے۔

آدمی نے داستان جاری رکھی:

"تو خواجہ نصر الدّین محل پہنچے۔ وہ بڑی دیر تک خدمتگاروں اور ملازموں کے جمگھٹے میں کھڑے رہے جو اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ حضور

گورنر صاحب ان پر بھی وہ نظر ڈالیں جو کسی کے لیے مسرّتیں اور کسی کے لیے تباہی لاتی تھی۔ اور جب گورنر نے خواجہ نصر الدّین کی طرف رُخ کرنے کی عنایت فرمائی تو خواجہ نصر الدّین ان کی شان و شوکت دیکھ کر ایسا ڈرے اور بدحواس ہوئے کہ ان کے پیر گیدڑ کی دم کی طرح کانپنے لگے اور ان کی رگوں میں خون جم سا گیا۔ وہ پسینے میں بالکل شرابور ہو گئے اور رنگ سفید پڑ گیا۔"

"ہونہہ۔" پھر کونے سے آواز آئی لیکن داستان گو نے اس کی پروا کئے بغیر بات جاری رکھی:

"تم کیا چاہتے ہو؟" گورنر نے اپنی بلند اور گونج دار آواز میں جس میں شیر کی گرج تھی، پوچھا۔ ڈر کی وجہ سے خواجہ نصر الدّین کی زبان بند ہو گئی۔ لگڑ بگھے جیسی گھگیائی ہوئی آواز سے انہوں نے کہا۔ "حضورِ عالی، ہمارے صوبے کو منوّر کرنے والے سورج اور چاند، ہمارے صوبے کے تمام باشندوں کو خوشیاں اور مسرّتیں بخشنے والے، اپنے اس ادنیٰ خادم کی، جو

آپ کے محل کی چوکھٹ پر اپنی داڑھی سے جھاڑو دینے کے قابل بھی نہیں ہے، ایک بات سنئے۔ اے آفتاب تاباں! ہمیں آپ نے یہ عزّت بخشی ہے کہ اپنا ایک ہاتھی ہمارے گاؤں کو کھلانے پلانے اور دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا ہے۔ اس لیے ہم لوگ ذرا پریشان ہیں۔۔۔"

گورنر نے غصّے سے ناک بھُوں چڑھائی۔ خواجہ نصر الدّین اس کے سامنے اس طرح جھک گئے جیسے آندھی سے سرکنڈا جھک جاتا ہے۔

"تجھے کیا پریشانی ہے؟" گورنر نے پوچھا۔ "بول، یا تیرے گندے اور ذلیل تالو میں زبان چپک گئی ہے؟"

"آ، آ، آپ۔۔۔ آپ۔" ڈرپوک خواجہ نصر الدّین ہکلا رہے تھے۔ "ہم لوگ پریشان ہیں، اے آفتاب تاباں، کہ ہاتھی تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ بے چارہ بہت رنجیدہ ہے اور سارا گاؤں اس کو غمگین دیکھ کر ملول ہو گیا ہے۔ اے اشرف الاشرافین، زینت ارض اسی لیے میں حاضر ہوا ہوں

کہ آپ ہمارے اوپر مزید عنایات کریں اور ایک ہتھنی بھیج بھی بھیج دیں۔"

"گورنر اس درخواست سے بہت خوش ہوا اور فوراً اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ اپنی مسرّت کا اظہار کرنے کے لیے اس نے خواجہ نصر الدّین کو اپنے جوتے کا بوسہ لینے کی اجازت دی جس کو خواجہ نصر الدّین نے اتنے جوش و خروش سے کیا کہ گورنر کے جوتے کی پالش اُڑ گئی اور خواجہ نصر الدّین کے ہونٹ کالے ہو گئے۔۔۔"

یہاں داستان گو کو خود خواجہ نصر الدّین کی گرجتی ہوئی آواز نے روک دیا۔

"جھوٹا کہیں کا!" خواجہ نصر الدّین چلائے۔ "گندے، خارشئے کتّے، تیرے ہونٹ، تیری زبان اور اندر سے سارا بدن برسرِ اقتدار لوگوں کے جوتے چاٹتے چاٹتے سیاہ ہو گئے ہیں۔ خواجہ نصر الدّین نے کبھی اور کسی

جگہ حاکموں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ تو خواجہ نصر الدّین کو بدنام کرتا ہے۔ مسلمانو، اس کی بات مت سنو! اس کو نکال دو!"

وہ اس افترا پرداز سے نپٹنے کے لیے لپکے لیکن چپٹے، چیچک بھرے چہرے اور زرد تھرکنے والی آنکھوں کو پہچان کر اچانک رُک گئے۔ یہ تو وہی نوکر تھا جس نے گلی میں ان سے جنّت کے پل پر کٹہروں کی لمبائی کے بارے میں تکرار کی تھی۔

"آہا!" خواجہ نصر الدّین نے زور سے کہا۔ "پہچان گیا تجھ کو اپنے مالک کے زر خرید اور خیر خواہ خادم! اور اب یہ بھی جان گیا تیرے ایک اور مالک بھی ہے جس کا نام تو نے چھپا رکھا ہے، بتا خواجہ نصر الدّین کو چائے خانے میں بُرا بھلا کہنے کے لیے تجھ کو امیر سے کتنے پیسے ملتے ہیں۔ کتنے پیسے خبر رسانی کے لیے ملتے ہیں اور ہر آدمی کے لیے جس کے ساتھ تو غدّاری کرتا ہے تجھ کو کیا ملتا ہے؟ ہر سزا پانے والے اور جیل کی کال کوٹھری میں ڈالے جانے والے اور پابہ زنجیر کئے جانے والے اور غلام بنائے جانے

والے کے لیے تجھے کیا دیا جاتا ہے؟ اے امیر کے جاسوس اور خبر رساں میں تجھے پہچان گیا!"

جاسوس نے جو ابھی تک ڈر کے مارے بے حس اور خاموش تھا اچانک تالی بجائی اور زور سے کہا:

"پہرے دارو، اِدھر آؤ!"

خواجہ نصر الدّین نے اندھیرے میں پہرے داروں کے دوڑنے، نیزوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور ڈھالوں کی جھنکار سنی۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ کود کر ایک طرف ہو گئے، انہوں نے چیچک رو جاسوس کو جو ان کا راستہ روکے کھڑا تھا زمین پر گرا دیا تھا۔

لیکن اب انہوں نے چوک کے دوسری طرف سے پہرے داروں کے قدموں کی آواز سنی۔ جس سمت بھی وہ بھاگتے ان کا سامنا پہرے داروں

سے ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا کہ اب بچ کر نکلنا ممکن نہیں ہے۔

"مصیبت آ گئی، پھنس گیا میں۔" وہ زور سے چلّائے۔ "الوداع میرے وفادار گدھے!"

لیکن اسی وقت ایک ایسا غیر متوقع واقعہ ہوا جو بخارا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور کبھی فراموش نہ کیا جائے گا کیونکہ بڑا زبردست ہنگامہ ہوا اور تباہی آئی۔

اپنے مالک کی غم انگیز چیخیں سن کر گدھا ان کی طرف دوڑا لیکن اس کے پیچھے ایک بڑا پیپا بھی صحن میں اُچھلتا کودتا چلا۔ خواجہ نصر الدّین نے لاعلمی میں اپنے گدھے کو اس پیپے کے آنکڑے سے باندھ دیا تھا جو چائے خانے کا مالک بڑے تہواروں پر گاہک بُلانے کے لیے پیٹا کرتا تھا۔ پیپا ایک پتھر سے ٹکرایا اور بھڑ بھڑایا اور گدھے نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، پیپا پھر بھڑ بھڑایا۔ گدھے نے سوچا کہ بھوت پریت اس کے مالک کا خاتمہ کر

کے اب اس کی بھوری کھال کے پیچھے پڑے ہیں۔ وہ دہشت سے رینکا اور اپنی دم اٹھا کر بے تحاشا چوک کے پار بھاگا۔

اسی وقت ایک کارواں کے آخری پچاس اونٹ جن پر چینی کے برتن اور تانبے کی چادریں لدی تھیں چوک میں داخل ہو رہے تھے۔ رینکنے کی دہشتناک آواز اور ایک جانور کی اچھل کود سے جو اندھیرے میں سیدھا ان سے ٹکرا گیا خوفزدہ اونٹ اِدھر اُدھر بھاگے۔ چینی کے برتن اور جھنجھناتی ہوئی تانبے کی چادریں نیچے آرہیں۔

ایک لمحے میں پورے بازار میں اور ساتھ کی سڑکوں پر ایسا زبردست ہنگامہ اور گڑبڑ ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ گرجنے، بجنے، ٹکرانے، چیخنے، بھونکنے، غُرّانے اور ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں سب مل کر ایک ہنگامہ بن گئیں۔ ہر ایک بدحواس ہو گیا۔ سینکڑوں اونٹ، گھوڑے اور گدھے اپنے کھونٹوں سے تڑا کر اندھیرے میں تانبے کی چادروں کے درمیان

شور کرتے بھاگ رہے تھے اور ساربان و سائیس مشعلیں لیے شور و غل کرتے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

لوگ اس ہنگامے سے جاگ پڑے اور نیم عریاں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ان کی رنج و غم اور مایوسی سے بھری ہوئی آوازیں اندھیرے میں گونج رہی تھیں کیونکہ وہ سوچ رہے تھے کہ قیامت آ گئی ہے۔

مُرغ بانگ دے رہے تھے اور اپنے پَر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ سارے شہر اور اس کے مضافات تک پھیل گیا۔ آخر کار شہر کی فصیل پر توپیں گرجنے لگیں کیونکہ شہر کے پہرے داروں نے سمجھا کہ دُشمن نے بخارا پر حملہ کر دیا ہے اور محل کی توپیں بھی چھوٹنے لگیں کیونکہ محل کے پہرے داروں نے خیال کیا کہ بغاوت ہو گئی ہے۔ بے شمار میناروں سے مؤذنوں کی غم انگیز پریشان کن اذان گونجی۔ اندھیرے میں قطعی ہنگامہ برپا تھا، کسی کو پتہ نہ تھا کہ کدھر جائے۔

اور اس تاریکی اور ہنگامے کے قلب میں خواجہ نصر الدّین بھاگ رہے تھے۔ وہ بڑی صفائی سے بھڑکے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں سے بچتے، پیپے کی آواز کے ذریعہ اپنے گدھے کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ گدھے کو اس وقت تک نہ پکڑ سکے جب تک کہ رسّی ٹوٹ نہ گئی اور پیپا اونٹوں کے پیروں سے لگ کر کسی طرف لڑھک نہ گیا۔ پیپے سے بچنے کے لیے جو اونٹ بدحواس ہو کر بھاگ رہے تھے انہوں نے شامیانے، چائے خانے اور چھوٹی چھوٹی دُکانیں گرا دیں۔

خواجہ نصر الدّین کو گدھے کی تلاش میں بڑی دیر لگتی لیکن اتّفاق سے ایک دوسرے سے سامنا ہو گیا۔ گدھا پسینے سے شرابور سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

”چل، جلدی چل، یہاں بڑا غل غپاڑہ ہو رہا ہے۔“ خواجہ نصر الدّین نے گدھے کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر کسی چھوٹے گدھے سے کوئی پیپا باندھ دیا جائے تو بڑے شہر میں کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو

سکتا ہے۔ دیکھ، تونے کیا کیا ہے! یہ سچ ہے کہ تونے مجھے پہرے داروں سے بچا لیا، لیکن مجھے بخارا کے شہریوں پر افسوس آتا ہے۔ یہ سب گڑبڑ ٹھیک کرنے میں ان کو صُبح ہو جائے گی۔ ہمیں کہاں کوئی خاموش اور پرامن جگہ مل سکتی ہے؟"

خواجہ نصر الدّین نے رات ایک قبرستان میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی یہ دلیل بجا تھی کہ چاہے جتنا ہنگامہ کیوں نہ ہو، مُردے نہ تو بھاگیں گے اور نہ چیخیں چلّائیں گے یا مشعلیں لے کر دوڑیں گے۔

ہنگامہ پرور اور عوام کو اُکسانے والے خواجہ نصر الدّین نے اپنے شہر میں واپسی کا پہلا دن اسی طرح گزارا جو ان کے خطاب کے لیے سزاوار تھا۔ انہوں نے اپنے گدھے کو ایک قبر کے پتھر سے باندھ دیا اور خود ایک قبر پر دراز ہو گئے اور جلدی سو گئے۔ اس دوران میں شہر میں ہنگامہ، غل شور، گڑگڑاہٹ اور توپوں کی گرج کافی دیر تک جاری تھی۔

۹

صُبح سویرے جب ستارے دُھندلے پڑنے لگے اور اندھیرے سے ہلکے ہلکے خط و خال اُبھرنے لگے تو سیکڑوں جاروب کش، بڑھئی اور تھوئی بازار کے چوک میں جمع ہو گئے اور خوب زوروں سے کام شروع کر دیا۔ انہوں نے گِرے ہوئے شامیانے کھڑے کیے، پُلوں کی مرمّت کی، باڑوں میں ٹوٹی پھوٹی جگہیں ٹھیک کیں، تمام لکڑی کے ٹکڑے اور ٹوٹے برتن اس طرح صاف کئے کہ سورج کی پہلی کرنوں کو بخارا میں اتنے بڑے ہنگامے کا کوئی نام و نشان نہ ملا۔

بازار کھُل گیا۔

قبرستان میں رات بھر اچھی طرح آرام کرنے کے بعد خواجہ نصر الدّین اپنے گدھے پر سوار چوک آئے۔ وہاں خوب زوروں کی چہل پہل تھی اور بازار بہت سی زبانوں اور قوموں والے رنگین مجمع سے بھرا ہوا تھا۔ ”ہٹو بچو، ہٹو بچو!“ خواجہ نصر الدّین کو اپنی آواز سوداگروں، ساربانوں، بہشتیوں، حجاموں، آوارہ درویشوں، فقیروں، بازار میں دانت اکھاڑنے والوں (جو اپنے پیشے کے زنگ آلود اور دہشتناک آلات لیے ہلا رہے تھے) کی آوازوں میں گم ہو گئی۔ رنگا رنگ قبائیں، عمامے، گھوڑے کی جھولیں اور قالین، چینی، عربی، ہندوستانی، منگولیائی اور بہت سی دوسری زبانیں اس بھیڑ بھکڑ اور غل غپاڑے میں گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ ایسی گرد اُڑ رہی تھی کہ آسمان چھپ گیا تھا۔ چوک میں لوگوں کا تانتا بندھا تھا جو اپنا سامان بازار میں لگا رہے تھے اور ان کی ہانکیں عام ہنگامے میں اضافہ کر رہی تھیں۔ کمہار چھوٹی چھوٹی چھڑیوں سے اپنے برتن بجا بجا کر اور راہ گیروں کا دامن تھام کر التجا کر رہے تھے کہ وہ ان برتنوں کی صاف کھنک

سنیں۔ اس طرح وہ انہیں خریدنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ٹھٹھیروں کی قطار میں تانبے کی چمک چکا چوند کر رہی تھی اور ان چھینیوں اور ہتھوڑیوں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی جن سے وہ کشتیوں اور صراحیوں پر نقش و نگار بنا رہے تھے، ساتھ ہی وہ اپنی دستکاری کی تعریف بھی کرتے جاتے تھے اور پڑوسیوں کے کام کی برائی۔ سونار چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں چاندی پگھلا رہے تھے، سونے کے تار کھینچ رہے تھے اور چمڑے کے گولوں کے ذریعہ قیمتی ہندوستانی جواہرات کو جلا دے رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا آتا اور عطر سازوں کی طرف سے خوشبو کی زوردار لپٹ آتی جہاں گلاب کا عطر، عنبر اور مُشک اور مختلف قسم کے مسالے فروخت ہوتے تھے۔ ایک طرف رنگا رنگ، پھول پتیاں اور شبیہیں بنے ہوئے ایران، دمشق اور کاشغر کے قالین، گھوڑے کی رنگین جھولیں، سستی اور بیش قیمت دونوں کی طرح کی یعنی معمولی اور بہترین گھوڑوں کے لئے لامحدود قطاروں میں چلی گئی تھیں۔

خواجہ نصر الدّین ریشم والوں، ساز بنانے والوں، اسلحہ بیچنے والوں اور رنگ ریزوں کی لائنوں، غلاموں کے بازار اور اون تیار کرنے والوں کی طرف سے گزرے۔ اور یہ سب صرف بازار کی شروعات تھی کیونکہ سیکڑوں اور قطاریں آگے تھیں۔ خواجہ نصر الدّین اپنے گدھے پر مجمع میں جتنا ہی گھستے گئے اتنی غل غپاڑہ، طول تکرار، چیخ پکار اور طے توڑ کی آوازیں اور زیادہ کان پھاڑنے لگیں۔ ہاں یہ وہی بازار تھا۔ بخارا کا مشہور اور لاجواب بازار جس کی مثال نہ تو دمشق میں تھی اور نہ خود بغداد میں۔

آخر کار وہ ان قطاروں کے جھمیلے سے باہر نکلے اور امیر کا محل دیکھا جو ایک روزن دار فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ چاروں کونوں کے کناروں پر عرب اور ایرانی کاریگروں نے بڑی مہارت سے برسوں میں رنگارنگ پچّی کاری کی تھی۔

محل کے پھاٹک کے باہر رنگ برنگی خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ پھٹے پرانے شامیانوں کے نیچے لوگ گرمی سے تھک کر چٹائیوں پر لیٹے یا بیٹھے تھے۔

کچھ اکیلے ہی تھے اور کچھ اپنے خاندان کے ساتھ۔ عورتیں بچّوں کو کھِلا رہی تھیں، کھانا پکا رہی تھیں، پھٹی ہوئی قباؤں اور گدّوں کی مرمت کر رہی تھیں۔ نیم عریاں بچے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، غُل مچا رہے تھے۔ وہ آپس میں جھگڑتے اور ٹھوکر کھا کر گرتے تھے اور گستاخی سے اپنے بدن کا وہ حصّہ محل کی طرف کیے ہوئے تھے جس کو چھپانا چاہیے۔ مرد سو رہے تھے یا کوئی گھریلو کام کر رہے تھے یا پھر چائے دانیوں کے گرد بیٹھ کر گپ لڑا رہے تھے۔ ”ارے، یہ لوگ تو شاید یہاں کئی دن سے ہیں!“ خواجہ نصرالدّین نے سوچا۔

ان کی توجہ دو آدمیوں کی طرف گئی جن میں ایک گنجا اور دوسرا داڑھی والا تھا۔ دونوں اپنے اپنے شامیانوں کے نیچے کھری زمین پر لیٹے تھے۔ دونوں کے درمیان کھونٹے سے ایک سفید بکری بندھی تھی جو ایسی دُبلی پتلی تھی کہ بس اس کی پسلیاں کھال پھاڑ کر نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

وہ بڑے غمگین لہجے میں ممیا رہی تھی اور کھونٹے کو کتر رہی تھی جس کو وہ ابھی تک آدھا کھا چکی تھی۔

خواجہ نصر الدّین فطرتاً کھوجی واقع ہوئے تھے اس لیے وہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکے:

"سلام علیکم، بخارا کے شہریو! بتائیے کہ آپ لوگ خانہ بدوشوں میں کب سے شامل ہو گئے ہیں؟"

"مسافر، ہماری ہنسی نہ اڑاؤ!" داڑھی والے نے جواب دیا۔ "ہم خانہ بدوش نہیں ہیں بلکہ تمہاری ہی طرح نیک مسلمان ہیں۔"

"لیکن اگر آپ نیک مسلمان ہیں تو اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟ محل کے پھاٹک پر کیا انتظار ہے؟"

"ہم اپنے بادشاہ اور مالک امیر کے منصفانہ فیصلے کے منتظر ہیں جن کی آب و تاب آفتاب کو بھی شرماتی ہے۔"

"اچھا۔" خواجہ نصر الدّین نے طنز کو چھپائے بغیر کہا۔ "تو کیا آپ اپنے بادشاہ اور مالک، امیر کے منصفانہ فیصلے کا جن کی آب و تاب آفتاب کو شرماتی ہے کافی دنوں سے انتظار کر رہے ہیں؟"

"مسافر، ہم چھ ہفتے سے انتظار کر رہے ہیں۔" گنجا بولا۔ "یہ داڑھی والا جھگڑالو، اللہ اس کو مارے، شیطان اس کو دفعان کرے۔ یہ داڑھی والا جھگڑالو میرا بڑا بھائی ہے۔ ہمارے والد کا انتقال ہوا۔ انہوں نے کچھ ملکیّت چھوڑی۔ ہم نے سب کچھ تقسیم کر لیا ہے سوائے اس بکری کے۔ اب امیر اس کا فیصلہ کریں گے کہ یہ کس کی ہونی چاہیے۔"

"لیکن وہ بقیہ ملکیت کہاں ہے جو تم کو وراثت میں ملی ہے؟"

"ہم نے وہ سب نقد کر لیا۔ درخواست لکھنے کے لیے عرضی نویس کو دینا پڑتا ہے پھر درخواست لینے والے منشی، پہرے داروں اور بہت سے لوگوں کو۔۔۔"

گنجا یکایک اُچک کر اُٹھا اور ایک گندے، ننگے پیر درویش سے ملنے کے لیے لپکا جو مخروطی ٹوپی پہنے تھا اور اس کے پہلو سے کشکول لٹک رہی تھی۔

”میرے لیے دُعا کیجیۓ، اے بزرگ! دُعا کیجیۓ کہ فیصلہ میرے حق میں ہو!“

درویش نے پیسے لے لیے اور دُعا شروع کر دی۔ جیسے ہی وہ اپنی دُعا کے آخری الفاظ تک پہنچا گنجے نے اس کی کشکول میں ایک سِکّہ اور ڈال دیا تاکہ وہ دُعا کو از سرِ نو شروع کر سکے۔

داڑھی والا بے چینی سے اُٹھا اور مجمع میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کافی تلاش کے بعد اس کی نظر ایک اور درویش پر پڑی جو پہلے والے سے زیادہ گندا اور چیتھڑوں میں تھا اس لیے زیادہ بزرگ بھی تھا۔ اس درویش نے کافی بڑی رقم طلب کی۔ داڑھی والے نے کچھ طے توڑ کرنا چاہا لیکن درویش نے اپنی ٹوپی کے نیچے ٹٹول کر مٹھی بھر چیلڑ بر آمد کئے۔ داڑھی

والا یہ دیکھ کر فوراً اس کی کرامات کا قائل ہو گیا اور مطلوبہ رقم مان لی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے رقم گنی۔

درویش نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر زور زور سے دُعا شروع کی۔ اس کی بھاری بھر کم آواز میں پہلے درویش کی مدہم آواز غائب ہو گئی۔

گنجے نے پریشان ہو کر اپنے درویش کو چند سِکّے اور دیے، داڑھی والے نے بھی یہی کیا اور دونوں درویشوں نے ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے وہ چیخم دھاڑ کی کہ غالباً اللہ میاں نے فرشتوں کو آسمان کی کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دے دیا ہو گا۔ بکری برابر کھونٹے کو کترے جا رہی تھی اور غمگین لہجے میں ممیا رہی تھی۔

گنجے بھائی نے اس کے سامنے تھوڑی سی گھاس ڈال دی جس پر داڑھی والا زور سے چیخا:

"اپنی گندی بدبُودار گھاس میری بکری کے پاس سے لے جاؤ !"

اس نے لات مار کر گھاس الگ ہٹا دی اور بکری کے سامنے بھوسے کی ناند لگا دی۔

"نہیں!" گنجا غصّے میں چلایا۔ "میری بکری تمہارا بھوسا نہیں کھائے گی!"

اب ناند بھی گھاس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ٹوٹ گئی اور بھوسا سڑک کی مٹّی میں مل گیا۔

دونوں بھائی سخت غصّے میں دست و گریباں ہو گئے۔ وہ زمین پر لوٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کی گھونسوں اور گالیوں سے خاطر کر رہے تھے۔

"دو بیوقوف لڑ رہے ہیں، دو دھوکے باز دُعا کر رہے ہیں اور بکری بے چاری بھوکوں مر رہی ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ارے نیک بخت اور محبّت کرنے والے بھائیو، اِدھر دیکھو! اللہ نے اس جھگڑے کا فیصلہ اپنے طور پر کر دیا۔ اس نے بکری کو تم سے لے لیا۔"

بھائیوں کو ہوش آیا اور انہوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے خون آلود چہرے لیے بڑی دیر تک مُردہ بکری کو گھُورتے رہے۔ آخر کار گنجے نے کہا:

" اس کی کھال تو نکال لینا چاہیے۔"

" یہ میں کروں گا" داڑھی والا جلدی سے بولا۔

" تم کیوں کروگے؟" دوسرے نے پوچھا۔ اس کا گنجا سر غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا۔

" بکری میری ہے اور اسی لیے اس کی کھال بھی۔"

" نہیں، میری ہے!"

قبل اس کے کہ خواجہ نصر الدّین کچھ بولیں دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا پھر زمین پر لوٹ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھاری مٹھی میں

سیاہ بالوں کا گچھا نظر آیا جس سے خواجہ نصر الدّین نے نتیجہ اخذ کیا کہ بڑے بھائی کی داڑھی کا کچھ حصّہ غائب ہو چکا ہے۔

ناامیدی سے ہاتھ جھٹک کے خواجہ نصر الدّین آگے بڑھ گئے۔

ایک لوہار ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پٹکے میں ایک سنسی لگی ہوئی تھی۔ یہ وہی لوہار تھا جس نے خواجہ نصر الدّین سے ایک دن پہلے تالاب پر باتیں کی تھیں۔

"السلام علیکم، آہن گر!" خواجہ نصر الدّین نے خوشی سے کہا۔ "ہماری ملاقات پھر ہو گئی۔ حالانکہ مجھے ابھی اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ آہن گر، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم بھی امیر سے اپنے انصاف کا مطالبہ کرنے آئے ہو؟"

"ایسے انصاف سے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟" لوہار نے افسردگی سے کہا۔ "میں لوہاروں کی لائن سے فریاد لے کر آیا ہوں۔ ہم کو پندرہ پہرے دار دیے گئے جنہیں ہمیں تین مہینے تک کھلانا پلانا تھا۔"

"ایک سال گزر چکا ہے اور وہ اب بھی ہمارے اُوپر مسلط ہیں۔ اس وجہ سے ہم بڑا نقصان اُٹھا رہے ہیں۔"

"اور میں رنگریزوں کی طرف سے آیا ہوں۔" ایک آدمی بیچ میں بولا جس کے ہاتھوں پر رنگ کے دھبّے تھے اور جس کے چہرے کا رنگ زہر آلود بھاپ کی وجہ سے جس میں وہ صُبح سے شام تک سانس لیتا تھا سبزی مائل ہو گیا تھا۔ "میں بھی اسی طرح کی فریاد لے کر آیا ہوں۔ ہم کو پچیس پہرے دار ملے ہیں۔ ہمارا کاروبار تباہ ہو گیا اور نفع بہت کم ہو گیا۔ شاید امیر ہمارے اُوپر رحم کھا کر ہمیں اس ناقابل برداشت بار سے چھٹکارا دلا دیں۔"

"آخر تم بے چارے پہرے داروں کو کیوں ناپسند کرتے ہو؟" خواجہ نصر الدّین نے زور سے کہا۔ "سچ مچ، وہ بخارا کے سب سے زیادہ بُرے اور لالچی لوگ تو نہیں ہیں۔ تم لوگ بلا شکایت کیے امیر، اس کے تمام وزرا اور عمائدین کو کھلاتے ہو، تم دو ہزار ملاؤں اور چھ ہزار درویشوں کو کھانا دیتے ہو۔ تو آخر پہرے دار ہی کیوں بھوکے رہیں؟ کیا تمھیں یہ کہاوت معلوم نہیں کہ جہاں ایک گیدڑ کو کھانا ملا وہاں دس فوراً اور آ جاتے ہیں۔ آہن گر اور رنگ ریز تمہاری شکایت میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"آہستہ سے۔" آہن گر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رنگ ریز نے خواجہ نصر الدّین کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "مسافر تم خطرناک آدمی ہو۔ تمہارے الفاظ میں نیکی نہیں ہے۔ لیکن ہمارے امیر عقلمند اور فیاض ہیں۔"

وہ رُک گیا کیونکہ اچانک قرناؤں اور نقّاروں کی آواز گونج اُٹھی۔ جیسے ہی محل کے پھاٹک کے پیتل سے منڈھے دروازے آہستہ آہستہ کھلے خیموں کا سارا رنگا رنگ جنگل جاگ اُٹھا۔

"امیر! امیر!" ہر طرف غلغلہ ہوا اور لوگ اپنے امیر کو دیکھنے چاروں طرف سے محل کی طرف دوڑ پڑے۔ خواجہ نصر الدّین نے اگلی صفوں میں ایک معقول جگہ چن لی۔

پہلے پھاٹک سے نقیب اعلان کرتے ہوئے نکلے۔ "امیر کے لیے راستہ دو، مقدس امیر کے لیے راستہ دو! مجاہدین کے لیے راستہ دو!"

ان کے بعد پہرے دار آئے جو اپنے ڈنڈوں سے دائیں بائیں ان لوگوں کی پیٹھوں اور سروں پر بارشیں کر رہے تھے جو اشتیاق میں بہت قریب آ گئے تھے۔ مجمع کے درمیان ایک چوڑا راستہ بن گیا۔ اب نقّارے، شہنائیاں، طنبورے اور قرنائیں لیے موسیقار آئے۔ اس کے بعد زرّیں ریشمی لباس میں، مرصع مخملی نیاموں میں ہلالی شمشیریں لگائے دستہ

برآمد ہوا۔ پھر دوہاتھی نکلے جن کے سروں پر لمبی کلغیاں تھیں۔ آخر میں ایک بہت ہی مرصع اور سجی ہوئی پالکی نمودار ہوئی جس میں خود باعظمت امیر ایک بھاری زرّیں نم گیرے کے نیچے تشریف فرما تھے۔

اس منظر کو دیکھ کر مجمع سے ایک غلغلہ بلند ہوا جیسے کہ چوک پر کوئی ہوا کا جھونکا آگیا ہو اور سب لوگ زمین پر سجدے میں جھک گئے کیونکہ امیر کا حکم تھا کہ اس کی تابعدار رعایا اپنے کو امیر کا بندہ بے دام خیال کرے اور اس سے آنکھیں نہ چار کرے۔ پالکی کے آگے آگے خدّام دوڑ دوڑ کر قالین بچھائے جاتے تھے، دائیں طرف شاہی مورچھل بردار کاندھے پر مورچھل رکھے چل رہا تھا اور بائیں طرف بڑی سنجیدگی اور شان سے ترکی کا سنہرا حقّہ لیے حُقّے بردار تھا۔

جلوس کے پیچھے حصّے میں پیتل کے خودوں، سپروں، نیزوں، تیر کمانوں اور ننگی تلواروں سے لیس پہرے دار تھے۔ سب سے آخر میں دو چھوٹی توپیں تھیں۔ سارا جلوس دوپہر کی تیز دھوپ سے چمچمار رہا تھا۔ سورج نے

جواہرات، سونے چاندی کے زیورات، پیتل خودوں، سپروں اور سفید فولادی، ننگی تلواروں کو آئینے کی طرح چمکا دیا تھا۔۔۔ لیکن اس سجدے میں پڑے ہوئے زبردست مجمع میں نہ تو جواہرات چمک رہے تھے اور نہ سونا حتیٰ کہ تانبے تک کی چمک نہ تھی۔ غرض کوئی ایسی چمک دمک نہ تھی جو دل کو خوش کر سکتی ہو۔ وہاں تو صرف چیتھڑے، غربت اور بھوک تھی۔ اور جب امیر کا پُر تکلف جلوس اس گندے، جاہل اور کچلے ہوئے لوگوں کے سمندر کے درمیان سے گزر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گدڑی میں لعل ہو۔

قالینوں سے سجا ہوا اُونچا چبوترہ جہاں سے امیر اپنی وفادار رعایا پر عنایت کی بارش کرنے والے تھے پہلے ہی چاروں طرف سے پہرے داروں سے گھِر چکا تھا اور نیچے سولی کے میدان میں جلّاد بڑے زوروں کے ساتھ امیر کے احکام کی تعمیل کے لیے تیّاری کر رہے تھے۔ وہ سلاخوں کی لچک اور ڈنڈوں کی مضبوطی کی جانچ کر رہے تھے، چمڑے کے کوڑے طشتوں میں

بھگو رہے تھے، سولیاں نصب کر رہے تھے، کلہاڑیاں تیز کر رہے تھے اور زمین میں تیز نوکوں والے ستون گاڑ رہے تھے۔ اس کا منتظم شاہی پہرے داروں کا داروغہ ارسلان بیک تھا جس کی بربریت کا چرچا بخارا سے باہر دُور دُور پھیل چکا تھا۔ وہ لال چہرے، بھاری جسم اور کالے بالوں والا آدمی تھا۔ اس کی داڑھی سینے پر اپنا گھنا سایہ کئے ہوئے ناف تک لٹک رہی تھی اور اس کی آواز اونٹ کی بلبلاہٹ سے ملتی جلتی تھی۔ وہ بڑی فیاضی کے ساتھ گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر رہا تھا۔ اچانک وہ بہت نیچا جھکا اور چاپلوسی سے کانپنے لگا۔

آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی پالکی چبوترے تک پہنچی اور امیر نے اس کے پردے ہٹاتے ہوئے اپنے درشن رعایا کو دیے۔

۱۰

تقدس مآب امیر بہر حال ایسا کچھ صورت دار نہیں تھا۔ اس کا چہرہ جس کی تشبیہ اکثر درباری شعراء تابدار ماہِ کامل سے دیتے تھے پلپلے خربوزے سے زیادہ مشابہ تھا۔ وہ اپنے وزیروں کے سہارے سنہرے تخت پر جلوہ فرمانے کے لیے پالکی سے اُترا۔ خواجہ نصر الدّین نے دیکھا کہ درباری شعراء کے دعوؤں کے برعکس وہ بالکل سرو سہی قد نہ تھا۔ اس کا جسم موٹا اور بھاری تھا، اس کے ہاتھ چھوٹے اور پیر اتنے ٹیڑھے تھے کہ اس کی قبا سے بھی یہ عیب نہیں چھپ رہا تھا۔

وزراء اس کے دائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ ملّاؤں اور عمائدین کو بائیں طرف جگہ ملی، نیچے احکام نویس اپنے رجسٹر اور دواتیں لیے جمے تھے اور

درباری شعراء نے تخت کے پیچھے اس طرح نیم حلقہ بنالیا تھا کہ ان کی نظر اپنے آقا کی گدّی پر رہے۔ شاہی مور چھل بردار مور چھل جھلنے لگا۔ حُقّے بردار نے سنہری نال اپنے مالک کے ہونٹوں سے لگا دی۔ چبوترے کو گھیرے ہوئے زبردست مجمع دم بخود کھڑا تھا۔ خواجہ نصرالدّین رکابوں کے اُوپر اُٹھے اور اپنی گردن نکال کر غور سے سننے لگے۔

امیر نے اُونگھتے ہوئے سر ہلایا۔ پہرے داروں نے دو حصّوں میں تقسیم ہو کر گنجے اور داڑھی والے دونوں بھائیوں کو راستہ دیا جن کی باری تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے چبوترے تک گئے اور زمین تک لٹکتے ہوئے قالین کو بوسہ دیا۔

"اٹھو!" وزیر اعظم بختیار نے کہا۔

دونوں بھائی اٹھے لیکن ان کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنی قباؤں کی دُھول جھاڑ دیں۔ خوف نے ان کی زبان اس طرح پکڑ لی تھی کہ وہ ہکلا رہے

تھے اور ان کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ۔ لیکن بختیار آخر بہت تجربے کار وزیر تھا۔ وہ ایک نظر میں ساری صورت حال بھانپ گیا۔

" تمہاری بکری ہے کہاں ؟" اس نے بے چین ہو کر بیچ میں لقمہ دیا۔

گنجے بھائی نے جواب دیا۔ " وزیر اعلی نسب، وہ تو مر چکی، اللہ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن کھال کا مالک کون ہے ؟"

بختیار امیر کی طرف مڑا۔

" کیا حکم ہے اے شاہِ دانشوراں ؟"

امیر نے بالکل بے تعلقی سے جمائی لے کر آنکھیں بند کر لیں ۔ بختیار بڑے ادب سے بھاری سفید دستار والا سر جھکایا۔

"مالک، میں نے فیصلہ آپ کے چہرے سے معلوم کر لیا! سنو" وزیر نے بھائیوں کی طرف مڑ کر کہا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گئے اور امیر کی عقل، انصاف اور مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے ۔ بختیار نے

فیصلے کا اعلان کرنا شروع کیا اور احکام نویس اپنے اپنے بڑے رجسٹروں میں اس کے الفاظ لکھنے کے لیے اپنے قلم دوڑانے لگے۔

"امیر المومنین، آفتاب جہاں، باعظمت امیر، خدا ان پر رحمتیں نازل کرتا رہے ان کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر بکری کو اللہ نے لے لیا ہے تو کھال انصاف کے مطابق زمین پر اللہ کے نائب یعنی خود عظیم امیر کی ملکیت ہونی چاہیے۔ اس لیے بکری کی کھال نکال کر اس کو کھانا اور پکانا چاہیے اور محل میں لاکر شاہی خزانے کے حوالے کرنا چاہیے۔"

بھائیوں نے بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مجمع میں چُپکے چُپکے کھُسر پھُسر ہونے لگی۔ بختیار نے اپنا حکم زور دار اور صاف آواز میں جاری رکھا

"اس کے علاوہ مدعیان دو سو تانگے مقدمے کے اخراجات، ڈیڑھ سو تانگے محل کا ٹیکس، پچاس تانگے احکام نویسوں کا خرچ ادا کریں اور

مسجدوں کی آراستگی کے لیے بھی چندہ دیں۔ یہ تمام رقم نقدی یا کپڑوں یا کسی اور قسم کی جائداد کی صورت میں فوراً وصول کی جائے۔"

ابھی بختیار نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ ارسلان بیک کے اشارے پر پہرے دار دونوں بھائیوں پر ٹوٹ پڑے، ان کے پٹکے کھول دیے، جیبیں باہر نکال کر جھاڑ لیں، قبائیں تار تار کر دیں اور جوتے اتار کر ان کو ننگے پیر اور نیم عریاں کر کے گردن پکڑ کر ڈھکیل دیا۔

یہ سارا قصّہ چُٹکی بجاتے ہو گیا۔ فیصلہ کا اعلان ہوتے ہی درباری شاعروں نے تحسین و مرحبا کے نعرے لگائے

"دانا امیر، داناؤں کے دانا! دانائے روزگار!"

تخت کی طرف اپنی گردنیں بڑھا بڑھا کر وہ اس طرح کی تعریفیں دیر تک کرتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کی آواز سب سے بلند ہو کر امیر کے گوش گزار ہو سکے۔ اس دوران میں چبوترے کے چاروں

طرف مجمع خاموش کھڑا ہمدردی اور افسوس کے ساتھ دونوں بھائیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"پرواہ مت کرو!" خواجہ نصر الدّین نے بڑے سنجیدہ لہجے میں دونوں بھائیوں سے کہا جو ایک دوسرے سے چمٹے دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ "بہر حال چوک پر چھ ہفتے انتظار کا وقت ضائع نہیں گیا۔ تمہارا فیصلہ منصفانہ اور رحمانہ ہے کیونکہ کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ دنیا بھر میں ہمارے امیر سے زیادہ دانشمند، زیادہ رحیم اور کوئی نہیں ہے، اور اگر کسی کو اس میں شک ہو۔۔۔" یہاں انہوں نے چاروں طرف اپنے آس پاس کے لوگوں کو دیکھا اور کہا۔ "تو پہرے داروں کو بلانے میں دیر نہ لگے گی۔ اور وہ؟ ہاں، وہ شبہ کرنے والے مردود کو جلّادوں کے حوالے کر دیں گے جو آسانی سے اسے بتا دیں گے کہ وہ کس طرح غلط راستے پر چل رہا ہے۔ ارے بھائیو! اطمینان سے گھر جاؤ۔ اب کبھی اگر تمہاری لڑائی کسی مرغی کے بارے میں ہو تو پھر امیر کی عدالت میں آنا۔ لیکن ذرا پہلے

اپنے مکانات، انگور کے چمن اور کھیت بیچ لینا، نہیں تو ٹیکس نہیں ادا کر سکو گے اور اس سے امیر کے خزانے کو نقصان ہو گا جس کا خیال ہی ہر وفادار رعایا کے لیے ناقابلِ برداشت ہونا چاہیے۔"

"کاش کہ ہم اپنی بکری کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے۔" بھائیوں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہارے خیال میں آسمان پر بیوقوف کافی تعداد میں نہیں ہیں؟" خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔ "معتبر آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ آج کل جنّت و جہنّم دونوں احمقوں سے بھرے پڑے ہیں اور اب اور نہیں لیے جا رہے ہیں۔۔۔ بھائیو، میں تمہارے لیے ابدیت کی پیشین گوئی کرتا ہوں۔۔۔ اب یہاں سے رفو چکّر ہو جاؤ کیونکہ پہرے دار ادھر دیکھ رہے ہیں اور تمہاری طرح میں لافانی ہونے پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

دونوں بھائیوں نے زور زور سے سسکیاں بھرتے، اپنا چہرہ نوچتے اور سڑک کی زرد خاک اپنے سروں پر اُڑاتے چلے گئے۔

اب لوہار امیر کے سامنے حاضر ہوا۔ اس نے اپنی شکایت بھاری گرجدار آواز میں پیش کی۔ وزیر اعظم بختیار نے امیر کی طرف دیکھا:

"اعلیٰ حضرت، کیا حکم ہوتا ہے؟"

امیر سو رہا تھا اور اس کے کھلے ہوئے مُنہ سے خرّاٹے صادر ہو رہے تھے۔ بختیار ذرا بھی نہ جھجکا اور بولا:

"جہاں پناہ، میں نے آپ کا حکم چہرے سے معلوم کر لیا ہے۔"

اور اس نے شان کے ساتھ اعلان کیا:

"خدا کی طرف سے جو رحیم و کریم ہے، امیر المومنین اور ہمارے آقا نے جو اپنی رعایا کی فکر سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتے اس کو یہ عزّت دے کر بڑی مہربانی اور عنایت کا اظہار کیا ہے کہ وہ امیر کے پہرے داروں کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کا انتظام کر سکے۔ یہ سہولت دے کر امیر نے بخارا شریف کے شہریوں کو یہ باعزّت موقع دیا ہے کہ وہ ہر روز اور ہر

گھنٹے اپنے امیر کے لیے جذبہ احسان و شکر کا اظہار کر سکیں۔ اس قسم کی عزت ہمارے پڑوسی ملکوں کے باشندوں کو حاصل نہیں ہے لیکن لوہاروں کی قطار نے اپنی سعادت مندی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس آہن گر یوسف نے عقبی کے عذابوں اور گنہ گاروں کے لیے بال سے باریک پُل کی پرواہ کئے بغیر ڈھٹائی سے اپنی ناشکری کا اظہار کیا ہے۔ مزید بر آں، اس کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ اپنی شکایت آقا و مولا، تقدس مآب امیر کے سامنے لائے جن کا نور آفتاب کو بھی ماند کرتا ہے۔"

"اس لیے ہمارے تقدس مآب امیر نے عنایت فرما کر یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ آہن گر یوسف کو دو سو دُرّے لگائے جائیں۔ اس سے اس کو بلاشبہ توبہ کا خیال آئے گا جس کے بغیر اس پر جنّت کے دروازے کھلنا ممکن نہیں ہیں۔ جہاں تک آہن گروں کی قطار کا سوال ہے تقدس مآب امیر نے اپنی مزید عنایت و مہربانی کا اظہار کیا ہے اور بیس اور پہرے دار وہاں رہنے اور کھانے پینے کے لیے بھیج دیے ہیں۔ اس طرح وہ ہر روز اور ہر

گھنٹے ہمارے امیر کی دانشمندی اور رحم و کرم کی تعریف کرنے کی خوش نصیبی سے محروم نہ ہوں گے۔ یہ ہے ان کا فیصلہ، خدا ان کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بہت دنوں تک سلامت رکھے۔"

درباری خوشامدیوں کی تعریف و تحسین کا شور پھر بلند ہوا۔ اس دوران میں پہرے داروں نے آہن گر یوسف کو پکڑ لیا اور اس کو سزا دینے کی جگہ تک گھسیٹ لے گئے جہاں جلّاد اپنے خوفناک دانت نکالے ہوئے بھاری چابکوں کو تول رہے تھے۔

آہن گر ایک چٹائی پر پٹ گر پڑا۔ درّے سرسراتے ہوئے برسنے لگے اور آہن گر کی پیٹھ لہولہان ہو گئی۔

جلّادوں نے اس کو بُری طرح پیٹا، اس کی کھال کی دھجیاں اُڑا دیں اور گوشت ہڈّیوں تک کاٹ دیا۔ لیکن آہن گر کے مُنہ سے ایک چیخ ایک آہ نہ نکلی۔ جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے مُنہ سے سیاہ جھاگ نکل رہا تھا۔ سزا

کے دوران اس نے اپنے دانت زمین میں پیوست کر لیے تھے تاکہ کوئی چیخ اس کے مُنہ سے نہ نکل سکے۔

"آہن گر بھولنے والا نہیں ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "وہ آخری دم تک امیر کی مہربانی کو یاد رکھے گا۔ رنگ ریز، تم کیا انتظار کر رہے ہو؟ جاؤنا؟ اب تمہاری باری ہے۔"

رنگ ریز نے زمین پر تھوکا اور بلا پیچھے دیکھے مجمع سے چلا گیا۔

وزیر اعظم جلدی جلدی فیصلہ کرتا گیا اور ہر ایک سے اس نے امیر کے خزانے کے لیے حاصلات میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہی ایک بات تھی جس نے اس کو تمام عمائدین سے ممتاز بنایا تھا۔

جلّاد متواتر مصروف تھے۔ ان کی طرف سے چیخوں اور رونے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وزیر اعظم نئے نئے گنہ گاروں کو جلّادوں کے پاس بھیجتا جا رہا تھا۔ ایک لمبی قطار اپنے نمبر کا انتظار کر رہی تھی۔ ان میں

بُڈّھے مرد اور عورتیں، حتیٰ کہ ایک دس سالہ لڑکا تھا جس کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے بدتمیزی کی اور باغیانہ طور پر امیر کے محل کے سامنے پیشاب کیا۔ وہ کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا اور اپنا چہرہ آنسوؤں سے تر کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر خواجہ نصرالدّین کا دل رحم اور غصّے سے بھر آیا۔

"واقعی یہ لڑکا بڑا خطرناک مجرم ہے۔" انھوں نے زور سے کہا۔ "امیر کی دور اندیشی کی تعریف نہیں ہو سکتی کہ وہ اس طرح کے دشمنوں سے اپنے تخت کو محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں جو اپنی کم سنی سے ہی بُرے خیالات کو چھپائے رکھتے ہیں۔ صرف آج ہی میں نے ایک اور مجرم دیکھا ہے جو اس سے بھی بُرا اور خطرناک تھا۔ اس دوسرے مجرم کی کرتوت۔ کیا آپ یقین کریں گے؟ پہلے سے بھی بری تھیں اور پھر ٹھیک محل کی دیوار کے نیچے! ایسی گستاخی کے لیے کوئی بھی سزا کم ہے۔ اس کو تو نوکیلے ستون پر بٹھا کر ہلاک کر دینا چاہیے حالانکہ ستون اس کے اندر سے ایسا گزر جاتا جیسے سیخ چوزے کے جسم سے گزر

جاتی ہے کیونکہ لڑکا صرف چار سال کا تھا۔ بہر حال جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس کی عمر کوئی عذر نہیں ہو سکتی۔ میرے دل کو ان زبردست برائیوں کے خیال سے سخت رنج ہوتا ہے جو ہمارے بخارا میں پھیل گئی ہیں۔ بہر نوع، ہمیں اُمّید ہے کہ امیر کے جلّادوں اور پہرے داروں کی مدد سے یہ برائیاں ختم ہو جائیں گی اور ان کی جگہ اچھائیاں لے لیں گی۔"

انہوں نے اس طرح یہ سب کچھ کہا جیسے کوئی ملا وعظ دے رہا ہو۔ ان کا لہجہ اور الفاظ دونوں اچھے تھے لیکن جن کے کان تھے انہوں نے ان الفاظ کو سنا اور سمجھا اور چپکے چپکے اپنی داڑھیوں میں تلخی سے مسکرائے۔

۱۱

اچانک خواجہ نصر الدّین نے دیکھا کہ مجمع چھٹنے لگا۔ بہت سے لوگ جلدی جانے لگے اور کچھ تو بھاگ رہے تھے۔

"کیا پہرے دار میرا پیچھا کر رہے ہیں؟" انہوں نے گھبرا کر سوچا۔

لیکن وہ سُود خور کو آتے دیکھ کر اس کا سبب سمجھ گئے، اس کے پیچھے، پہرے داروں کے محاصرے میں، ایک نحیف سفید داڑھی والا بُڈّھا تھا جس کی قبا مٹّی سے لتھڑی ہوئی تھی اور ایک برقع پوش عورت یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا جوان لڑکی تھی جیسا کہ خواجہ نصر الدّین کی تجربہ کار نگاہیں اس کی چال سے بھانپ سکیں۔

"اور ذاکر، جورا، محمد اور صادق کہاں ہیں؟" اپنی چچیاتی ہوئی آواز میں سُود خور نے لوگوں کا کانی آنکھ سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ دوسری آنکھ دھندلی اور غیر متحرک تھی اور اس پر جالا چھایا ہوا تھا۔ "وہ ابھی ابھی تو یہاں تھے۔ میں نے ان کو دور سے دیکھا تھا۔ ان کے قرض جلد ہی واجب الادا ہیں۔ ان کے لیے بھاگ کر چھپنا بے سُود ہے۔"

اور اب یہ کبڑا لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

لوگوں نے آپس میں کہنا شروع کیا:

"دیکھو، یہ بُڈّھا کھوسٹ، کمہار نیاز اور اس کی بیٹی کو امیر کے سامنے گھسیٹ لایا ہے۔"

"اس نے کمہار کو ایک دن کی بھی چھوٹ نہیں دی۔"

"لعنت ہو اس پر، میرا قرض پندرہ دن میں واجب الادا ہے۔"

"اور میرا ایک ہفتے میں۔"

"دیکھو، لوگ اس کے آنے پر کس طرح بھاگتے اور چھُپتے ہیں جیسے وہ کوڑھ یا ہیضے کی بیماری لایا ہو!"

"یہ سُود خور کوڑھ سے بھی بد تر ہے!"

خواجہ نصر الدّین کی روح کو پشیمانی سے تکلیف تھی انہوں نے اپنی قسم کو دہرایا کہ "میں اس کو اسی تالاب میں ڈبوؤں گا!"

ارسلان بیک نے سُود خور کو یہ اجازت دے دی کہ وہ اپنی باری کے بغیر آجائے۔ اس کے پیچھے پیچھے کمہار اور اس کی بیٹی تھے۔ انہوں نے گھٹنوں کے بل جھک کر قالین کے دامن کو بوسہ دیا۔

"سلام علیکم، لائق جعفر۔" وزیر اعظم نے اخلاق سے کہا۔ "کیسے آئے؟ باعظمت امیر سے اپنا کام بتاؤ۔"

" ے باعظمت بادشاہ، میرے آقا!" جعفر نے امیر کو مخاطب کر کے کہا جس نے نیند کی حالت میں سر ہلایا اور پھر خراٹے بھرے لگا۔ "میں آپ

سے انصاف مانگنے آیا ہوں۔ یہ آدمی جس کا نام نیاز ہے اور پیشے کا کمہار ہے میرا سو تانگے کا قرض دار ہے اور اس قرض پر تین سو تانگے کا مزید سُود چڑھ گیا ہے۔ آج صُبح یہ قرض واجب الادا تھا لیکن کمہار نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ اے دانشور امیر، آفتابِ جہاں، آپ ہی ہمارا فیصلہ کیجئے۔"

احکام نویسوں نے سُود خور کی شکایت اپنے رجسٹر میں درج کر لی۔ اب وزیر اعظم نے کمہار سے کہا:

"کمہار، باعظمت امیر کی بات کا جواب دو۔ کیا تم یہ قرض مانتے ہو؟ شاید تمہیں ادائیگی کے دن اور گھنٹے پر اعتراض ہے؟"

"نہیں۔" کمہار نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "نہیں، دانشور اور منصف وزیر۔ مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے۔ نہ تو قرض پر اور نہ دن اور گھنٹے پر۔ میں صرف ایک مہینے کی مہلت چاہتا ہوں۔ میں اپنے کو امیر کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔"

"میرے آقا، مجھے فیصلے کا اعلان کرنے کی اجازت دیجئے جو میں نے آپ کے چہرے سے پڑھ لیا ہے۔" بختیار نے کہا۔ "خداوند رحیم و کریم کے نام پر قانون کے مطابق جو بھی اپنا قرض ادا نہیں کرتا وہ اپنے مہاجن کا معہ اپنے خاندان کے غلام ہو جاتا ہے اور اس وقت تک غلام رہتا ہے جب تک وہ ساری مدّت کے لیے، جس میں غلامی کا زمانہ بھی شامل ہے، سُود اور اصل نہیں ادا کر دیتا۔"

کمہار کا سر جھکتا گیا اور وہ اچانک کانپنے لگا۔ مجمع میں بہت سے لوگوں نے اپنی آہیں روک کر مُنہ پھیر لیا۔ لڑکی کے شانے کانپ رہے تھے وہ برقع میں رو رہی تھی۔ خواجہ نصرالدّین بار بار یہ بات اپنے آپ دھرا رہے تھے:

"میں غریبوں پر اس وحشیانہ مظالم کرنے والے کو ڈبو کر رہوں گا!"

"لیکن ہمارے آقا کا رحم و کرم لا انتہا ہے۔" بختیار نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ بُڈّھے کمہار نے اپنا سر اُٹھایا۔ اس کے چہرے پر اُمّید کی کرن جھلک رہی تھی۔

"حالانکہ قرض ابھی واجب الادا ہے لیکن امیر کمہار نیاز کو مہلت دیتے ہیں۔۔ ایک گھنٹے کی۔۔۔ اگر ایک گھنٹہ ختم ہونے پر نیاز مذہبی اصولوں سے لاپرواہی برتتا ہے اور پورا قرض معہ سُود کے ادا نہیں کرتا تو قانون کی تکمیل ہوگی جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ جا! اے کمہار، امیر کی مہربانی تیرا ساتھ دے!"

بختیار نے فیصلہ ختم نہیں کیا کہ تخت کے پیچھے کھڑے ہوئے خوشامدیوں نے اپنا چرخہ چلایا:

"صاحب انصاف امیر، آپ کے انصاف کے سامنے تو انصاف خود شرمندہ ہے! اے رحیم اور دانشور امیر! فیاض امیر، زمین و آسمان کی شان و شوکت ہمارے مقدس امیر!"

اس بار خوشامدیوں نے تعریفوں سے اس طرح آسمان اُٹھالیا کہ امیر کی نیند ٹوٹ گئی اور اس نے غصّے سے ڈانٹ کر ان کو چُپ رہنے کے لیے کہا۔ وہ سب سنّاٹے میں آ گئے۔ چوک پر مجمع بھی خاموش تھا۔ اچانک زور دار، سمع خراش رینگنے کی آواز نے اس عام خاموشی کو توڑا۔

یہ خواجہ نصرالدّین کا گدھا تھا۔ یا تو وہ ایک جگہ کھڑے کھڑے تنگ آ چکا تھا یا پھر اس نے اپنے کسی لمبے کانوں والے بھائی کو دیکھ لیا تھا جس سے وہ صاحب سلامت کرنا چاہتا تھا۔ بھر حال ہوا یہ کہ وہ رینکنے لگا، دُم اوپر اٹھا دی، تھوتھن آگے بڑھا دیا اور زرد زرد دانت نکوس دیے۔ اس کی آواز کان پھاڑ دینے والی اور قابو سے باہر تھی اور اگر وہ ایک لمحے کے رُکتا بھی تھا تو محض سانس لینے کے لیے، اپنے جبڑے زیادہ کشادہ کرنے اور زیادہ زور سے رینگنے اور چیخنے کے لیے۔

امیر نے اپنے کان بند کر لیے ۔ پہرے دار مجمع کی طرف جھپٹے۔ لیکن خواجہ نصر الدّین وہاں سے دور تھے۔ انہوں نے اپنے رینگتے ہوئے گدھے کو کھینچتے اور دھکا دیتے ہوئے زور زور سے اسے ملامت کی۔

"بد ذات گدھے، تو کس بات پر خوش ہے۔ کیا تو ہمارے امیر کے رحم و کرم کی تعریف اتنا شور مچائے بغیر نہیں کر سکتا؟ شاید تو اس طرح دربار کا سب سے بڑا خوشامدی بننا چاہتا ہے؟"

مجمع میں ان باتوں پر زور سے قہقہہ پڑا اور لوگوں نے خواجہ کو نکلنے کا رستہ دیا اور قبل اس کے کہ پہرے دار ان تک پہنچ سکیں جگہ پھر گھر گئی۔ اگر چہ وہ خواجہ نصر الدّین کو پکڑ پاتے تو اس بد تمیزی سے بد امنی پیدا کرنے کے لیے ان کے دُرّے لگاتے اور ان کا گدھا ضبط کر لیتے۔

۱۲

"فیصلہ ہو گیا اور اب تمہارے اوپر میرے اختیار کی کوئی حد نہیں۔" سُود خور جعفر نے کمہار نیاز اور اس کی بیٹی گُل جان سے عدالت چھوڑنے کے بعد کہا۔ "میری حسینہ جب سے تجھے دیکھنے کا اتّفاق ہوا میرے دل کا صبر و قرار جاتا رہا۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ جلدی سے اپنا چہرہ دکھا۔ آج ٹھیک ایک گھنٹے میں تو میرے گھر میں ہو گی۔ اگر تو مجھ پر مہربان ہوئی تو میں تیرے باپ کو ہلکا کام اور اچھا کھانا دوں گا۔ اگر تو نے ضد کی تو اپنی آنکھوں کی قسم میں اس کو کچّے مٹر کھانے کو دوں گا اور اس سے پتھر ڈھلواؤں گا اور خیوا والوں کے ہاتھ فروخت کر دوں گا جو تجھے معلوم ہے

اپنے غلاموں پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ ضد مت کر، پیاری گُل جان، اپنی صورت دکھادے مجھے!"

اپنی ٹیڑھی عیاش انگلیوں سے اس نے گُل جان کی نقاب ذرا کھسکائی۔ اس نے غصّے سے سُود خور کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گُل جان کا چہرہ ایک لمحہ کے لیے کھلا لیکن یہ خواجہ نصر الدّین کے لیے کافی تھا جو اُدھر سے اپنے گدھے پر گزر رہے تھے۔ لڑکی کا حُسن ایسا جاں گداز تھا کہ خواجہ نصر الدّین پر تقریباً غشی طاری ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی، دل کی دھڑکن رُک گئی، وہ خود زرد پڑ گئے اور گدھے کی پیٹھ پر لڑکھڑائے۔ انہوں نے پریشان ہو کر اپنی آنکھیں ڈھک لیں۔ ان پر اچانک محبّت نے اپنی بجلی گرادی۔ سنبھلنے میں ذرا وقت لگا۔

"اور یہ لنگڑا، کبڑا، کانا لنگور اس حسینہ کی محبّت کا دم بھرتا ہے جس کا حُسن دنیا میں بے مثال ہے!" انہوں نے اپنے آپ کہا۔ "ارے، ہائے، میں نے اس کو کل پانی سے باہر کیوں نکالا؟ اب تو میں نے اپنے پیروں پر

کلہاڑی مار لی۔ لیکن دیکھا جائے گا، بد ذات سُود خور! ابھی تو تم کمہار اور اس کی بیٹی کے آقا نہیں ہو۔ ان کو ابھی ایک گھنٹے کی مہلت ہے اور خواجہ نصر الدّین ایک گھنٹے میں اس سے زیادہ کر سکتا ہے جتنا کوئی اور ایک سال میں نہیں کر سکتا ہے۔"

اس دوران میں سُود خور نے اپنے تھیلے سے ایک چوبی سورج گھڑی نکالی اور وقت دیکھا۔

"کمہار میرے اس درخت کے نیچے انتظار کر۔ میں ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ دیکھ چھپنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ میں تجھے سمندر کی تہہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا اور تیرے ساتھ مفرور غلام جیسا برتاؤ کروں گا۔ اور تو حسین گُل جان، میری بات کے بارے میں سوچ، تیرے باپ کی قسمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ تو میرے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہے۔"

اور اپنے بد نما چہرے پر اطمینان بخش مُسکراہٹ کے ساتھ وہ جوہریوں کے بازار سے اپنی نئی داشتہ کے لیے زیورات خریدنے روانہ ہو گیا۔

غم سے چُور کمہار اپنی بیٹی کے ساتھ سڑک کے کنارے درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔

خواجہ نصر الدّین ان کے پاس گئے:

"کمہار، میں نے فیصلہ سُنا تھا۔ تمہارے اُوپر بڑی مصیبت آن پڑی ہے لیکن شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

"نہیں، مہربان۔" کمہار نے نا اُمّیدی سے جواب دیا۔ "میں تمہارے پیوند لگے ہوئے کپڑوں سے ہی دیکھ سکتا ہوں کہ تم امیر نہیں ہو اور مجھے چار سو تانگوں کی ضرورت ہے۔ میرے دوست امیر نہیں ہیں، سب ٹیکسوں اور محصولوں سے تباہ غریب لوگ ہیں۔"

"بخارا میں میرے بھی دوست امیر نہیں ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "پھر بھی میں یہ رقم جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"چار سو تانگے ایک گھنٹے میں!" بُڈّھے نے اپنا سفید سر ہلایا اور تلخی سے مُسکرایا۔ "اجنبی، تم مجھے چڑھا رہے ہو۔ صرف خواجہ نصر الدّین ہی یہ کارنامہ کر سکتے ہیں۔"

"اجنبی، ہم کو بچایئے، بچایئے!" گُل جان نے اپنے باپ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

خواجہ نصر الدّین نے گُل جان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ اس نے خواجہ کو نظر بھر کر دیکھا اور نقاب کے اندر ہی اندر خواجہ نصر الدّین نے ان آنکھوں کی پگھلی ہوئی چمک کو دیکھ لیا جن میں التجا اور اُمّید تھی۔ خواجہ نصر الدّین کی رگوں میں خون آگ کی طرح دوڑ گیا اور ان کی محبّت ہزار گنا فروزاں ہو گئی۔ انہوں نے کمہار سے کہا:

"بڑے میاں، یہیں ٹھہرو، اگر میں سُود خور کی واپس سے پہلے چار سو تانگے حاصل نہ کر سکا تو میں اپنے کو دنیا کا انتہائی قابلِ نفرت اور ذلیل آدمی سمجھوں گا۔"

وہ کُود کر اپنے گدھے پر بیٹھے اور بازار کے مجمع میں غائب ہو گئے۔

۱۳

اس وقت بازار میں صُبح کے مقابلے میں، جبکہ انتہائی مصروف گھنٹوں میں ہر شخص اس ڈر سے بھگتا دوڑتا، چیختا اور عجلت میں ہوتا ہے کہ کہیں موقع ہاتھ سے جاتا نہ رہے، سناٹا تھا اور چڑیاں طرف اُچھل اُچھل کے دانے دُنکے چُگ رہی تھیں اور خوشی خوشی چہچہا رہی تھیں۔

"اللہ بھلا کرے، بھلے آدمی ہم کو بھی کچھ دیتے جاؤ۔" فقیر اپنے پھوڑے اور جسمانی عیب دکھا کر خواجہ نصر الدّین سے بھیک کے لیے گھگھیا رہے تھے۔

انہوں نے جھڑک کر جواب دیا:

"الگ رہو، میں خود بھی تمہاری طرح غریب ہوں اور کوئی ایسی آسامی ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھ کو چار سو تانگے دے سکے۔"

فقیروں نے یہ خیال کر کے کہ وہ ان کو چڑھا رہے ہیں خوب گالیں دیں لیکن خواجہ نصر الدّین اپنے خیالات میں ایسے منہمک تھے کہ ان کو ان باتوں کے جواب دینے کا موقع کہاں۔

چائے خانوں کی قطار میں انہوں نے ایک ایسا چائے خانہ چُنا جو سب سے بڑا تھا اور جہاں مجمع بھی زیادہ تھا لیکن وہاں قیمتی قالین اور ریشمی گدّے نہ تھے۔ وہ اس میں داخل ہوئے اور اپنے گدھے کو باہر باندھنے کی بجائے زینوں پر کھینچتے ہوئے لے آئے۔

لوگوں نے ان کا متحیّر کُن خاموشی سے خیر مقدم کیا۔ اس سے وہ ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ انہوں نے اپنی خورجین سے وہ مقدس کتاب نکالی جو دو دن پہلے ان کو بُڈّھے نے دی تھی اور اس کو کھول کر گدھے کے سامنے رکھ دیا۔

انہوں نے یہ کام بڑے اطمینان سے ذرا بھی مُسکرائے بغیر کیا جیسے یہ بالکل فطری بات ہو۔ چائے خانے میں جو لوگ تھے انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

گدھے نے چوبی فرش پر گونج دار آواز میں اپنے پیر پٹکے۔

"ابھی سے؟" خواجہ نصر الدّین نے ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "تو نے نمایاں ترقی کی ہے۔"

اب چائے خانے کا توندیل اور زندہ دل مالک اپنی جگہ سے اُٹھا اور خواجہ نصر الدّین کے پاس آیا۔

"دیکھو، بھلے آدمی، کیا یہ تمہارے گدھے کے لیے مناسب جگہ ہے؟ اور تم نے یہ مقدس کتاب گدھے کے سامنے کیوں کھول رکھی ہے؟"

"میں اس گدھے کو دینیات کی تعلیم دے رہا ہوں۔" خواجہ نصر الدّین نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اب یہ مقدس کتاب ختم ہونے والی ہے پھر ہم شریعت کا مطالعہ کریں گے۔"

سارے چائے خانے میں کھُسر پھُسر ہونے لگی۔ بہت سے لوگ اچھی طرح دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ چائے خانے کے مالک کی آنکھیں پھیلی اور مُنہ کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسا عجوبہ نہیں دیکھا تھا۔ اس موقع پر گدھے نے پھر پیر پٹکے۔

"شاباش۔" خواجہ نصر الدّین نے ورق اُلٹتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھے، تھوڑا سا اور پڑھ لے تو تُو مدرسہ میر عرب میں صدر معلّم دینیات کی جگہ لے سکے گا۔ صرف یہ ورق خود سے نہیں پلٹ سکتا اور اس کو کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ نے اس کو تیز فہم بنایا ہے اور یادداشت بھی لاجواب ہے لیکن خدا نے اس کو انگلیاں نہیں دیں۔" خواجہ نصر الدّین نے چائے خانے کے مالک سے کہا۔

"یہ کوئی معمولی گدھا نہیں ہے!" انہوں نے بتایا "یہ بذات خود امیر کی ملکیت ہے۔ ایک دن امیر نے مجھے طلب کیا اور پوچھا: کیا تم میرے محبوب گدھے کو دینیات پڑھا سکتے ہو تاکہ وہ اتنا ہی جان جائے جتنا میں جانتا ہوں؟ لوگوں نے مجھے گدھا دکھایا، میں نے اس کی لیاقت کی جانچ کی اور جواب دیا: اے تقدس مآب امیر! یہ لاجواب گدھا عقل و دانش میں آپ کے کسی وزیر سے کم نہیں ہے بلکہ آپ سے بھی۔ میں اس کو دینیات پڑھاؤں گا اور وہ اتنا ہی قابل ہو جائے گا جتنے آپ ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ لیکن اس میں بیس سال لگیں گے۔ امیر نے حکم دیا کہ خزانے سے مجھے سونے کے پانچ ہزار تانگے دے دیے جائیں اور کہا: گدھے کو لے جاؤ اور اسے پڑھاؤ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر بیس سال ختم ہونے پر اسے دینیات کا علم نہ ہوا اور وہ مذہبی کتابیں حفظ نہ کر سکا تو میں تمہارا سر اُڑا دوں گا!"

"تو پھر تم اپنے سر کو سلام کر لو!" چائے خانے کے مالک نے کہا۔ "کس نے سنا ہے کہ گدھا دینیات سیکھ سکتا ہے اور مذہبی کتابیں زبانی سنا سکتا ہے!"

"بخارا میں ایسے کافی گدھے ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "میں یہ بھی بتا دوں کہ سونے کے پانچ ہزار تانگے اور اچھا گدھا روز روز نہیں ملتے۔ اور رہا میرا سر تو اس کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ بیس سال میں ہم میں سے کوئی نہ کوئی مرے گا ضرور۔ یا تو میں یا امیر یا پھر گدھا۔ اس وقت یہ پرکھنے کا وقت گزر چکا ہو گا کہ ہم تینوں میں سے دینیات کا بڑا عالم کون ہے۔"

چائے خانہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ چائے خانے کا مالک تو ہنسی سے بے قابو ہو کر نمدوں پر گر پڑا اور اتنا ہنسا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھا۔

"یہ سنا آپ نے۔" اس نے گھٹے ہوئے گلے سے خرخراتے ہوئے کہا۔ "اس وقت یہ پرکھنے کا وقت گزر چکا ہو گا کہ کون دینیات کا بڑا عالم ہے!" یقیناً ہنسی میں اس کا پیٹ پھٹ جاتا اگر اچانک اس کو ایک خیال نہ آ گیا ہوتا۔

"ٹھہریے، ٹھہریے!" اس نے لوگوں کی توجّہ اپنی طرف کرنے کے لیے ہاتھ ہلائے۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو، دینیات کے استاد؟ کیا تم خود خواجہ نصر الدّین ہو سکتے ہو؟"

"کیا یہ کوئی حیرت کی بات ہے؟ تمہارا قیاس صحیح ہے۔ میں خواجہ نصر الدّین ہوں۔ بخارا شریف کے شہریو، سلام علیکم!"

ذرا دیر کے لیے ایسی خاموشی چھا گئی جیسے کسی نے جادُو کر دیا ہو۔ یک دم ایک پُر مسرّت آواز نے خاموشی توڑی:

"خواجہ نصر الدّین!"

"خواجہ نصر الدّین! خواجہ نصر الدّین!" یکّے بعد دیگرے ہر ایک کی زبان پر آتا گیا۔ یہ آواز دوسرے چائے خانوں تک پہنچی اور پھر سارے بازار میں گونج گئی۔ ہر جگہ یہ آواز پھیل کر گونج رہی تھی:

"خواجہ نصر الدّین! خواجہ نصر الدّین!"

لوگ ہر طرف سے دوڑ دوڑ کر اس چائے خانے آنے لگے۔ ان میں ازبک، تاجک، ایرانی، ترکمان، عرب، ترک، جارجیائی، آرمینیائی اور تاتار سبھی تھے۔ وہ اپنے محبوب خواجہ نصر الدّین کو، مشہور، زندہ دل اور ہوشیار خواجہ نصر الدّین کو زور زور سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

مجمع بڑھتا گیا۔

کہیں سے جئی کا ایک بورا، ایک گٹھا گھاس اور صاف پانی کی بالٹی بھی آ گئی۔ یہ سب چیزیں گدھے کے سامنے پیش کر دی گئیں۔

"خوش آمدید، خواجہ نصر الدّین !" مجمع نے کہا۔ "آپ کہاں گھومتے پھرتے رہے، ہمیں کچھ بتایئے خواجہ نصر الدّین!"

وہ بر آمدے کے کنارے تک آ گئے اور مجمع کے سامنے کافی خم ہو کر بولے:

"بخارا شریف کے شہریو، تم کو سلام! دس سال تک میں تم سے جُدا رہا اور اب میرا دل اس ملاپ سے باغ باغ ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ بتانے کو کہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ میں اس کو گا کر سناؤں!"

انہوں نے ایک بڑا سا مٹّی کا گھڑا لے لیا، اس کا پانی انڈیل دیا اور اس کو اپنے ہاتھ سے بجاتے ہوئے گانا شروع کیا:

باج باج، گھڑے رے باج

اور کر امیر کے گن گان

کہہ سارے سنسار سے کتھا

ہمرے سندر جیون کی، امیر کے راج

گھڑا بھن بھنایا، ٹھن ٹھنایا

اور آ کر تاؤ میں گھڑ گھڑایا

گرما کر گھوما چاروں طرف

اونچے سر میں سب سے فرمایا

ہاں، اونے سر میں فرمایا:

دیکھو! یہ کمہار نیاز ہمارا

برتنوں کا استاد نیارا

لیکن روزی سے بالکل ہارا

پیٹ سے ٹوٹا، پیسے کا مارا

اور جعفر کبڑے کو نیند نہ آئے

ڈر اپنی سونے کی دیگوں کا ستائے

خزانہ امیر کا بھی سونے سے اٹڈا آئے

اس کی گنتی بھیا کون تمہیں بتائے

اک دن بوڑھے نیاز پہ جو بپتا آئی

برق اندازوں نے کی چپکے سے چڑھائی

اور کچھ نہ سنی اس کی دہائی

پیشی امیر کی عدالت میں کرائی

پیچھے پیچھے جعفر کبڑا دوڑا آیا

منحوس شکل اپنی سرکار میں لایا

ہم ظلم کب تک برداشت کریں گے

کہہ رے گھڑے، سب تو سنیں گے

تیری مٹّی کی جیبھ ہے سچی پیارے

اس سے سب نیاز کا دوش سنیں گے

گھڑا اونچے سر میں بولا

سارا ماجرا سچ سچ کھولا

دوش تو ہے کمہار کا سارا

جو اس جال میں آیا

اب تو وہ ہے جال میں مکڑے کے

اور مکڑے نے اس کو اپنا داس بنایا

نیاز نے دی امیر کی دھائی

آنسو بھر کر آنکھ قدموں سے لگائی

پھر بولا "ساری دنیا کو ہے گیا

امیر اپنا مہربان، مہان

اور وہ دے گا مجھ کو امان"

"مت رو بُڈّھے" بولا امیر والا شان

”میں کرتا ہوں تجھ کو پوار گھنٹہ دان

ساری دنیا کو ہے گیان

میں ہوں مہربان، مہان“

ہم ظلم کب تک برداشت کریں گے

کہہ رے گھڑے، سب تو سنیں گے

گھڑا اونچے سر میں بولا

سارا ماجرا سچ سچ کھولا

سچ مچ وہ ہے دیوانہ

جس نے امیر کو منصف جانا

ایسا پنچ ہے مشکل پانا

سر اس کا کوڑا خانہ

کب تک ہم یہ نراج سہیں گے؟

کب تم ہم مریں کھپیں گے؟

کب لوگ اٹھیں گے؟

کب خوشی سے گلے ملیں گے؟

گھڑا اونچے سر میں بولا

سارا ماجرا سچ سچ کھولا

"ابھی تو امیر ہے بڑا ابلوان

لیکن گرے گا مُنہ کہ بل آن

تب یہ دکھ کے دن بیتیں گے

برس برس میں دن آئے گا

جب وہ مٹّی کے گھڑے سمان

ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا!"

گھڑے کو سر سے اُونچا اٹھا کر خواجہ نصر الدّین نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور اس کے سیکڑوں ٹکڑے ہو گئے۔ مجمع کے شور شرابے کے اوپر اپنی آواز بلند کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اچھا، ہم سب کو چاہیے کہ ہم سُود خور اور امیر کے رحم سے نجات دلانے کے لیے کمہار نیاز کی مدد کریں! تم تو خواجہ نصر الدّین کو جانتے ہی

ہو! ان کو دیا ہوا قرض کبھی ڈوبتا نہیں! تھوڑے دن کے لیے ان کو چار سو تانگے کون دے گا؟"

ایک سقّہ جو ننگے پاؤں تھا سامنے آیا:

"خواجہ نصر الدّین! ہمارے پاس پیسہ کہاں؟ ہمیں بہت بھاری ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن میرے پاس ایک پٹکا ہے، تقریباً بالکل نیا، اس سے کچھ ہاتھ لگ سکتا ہے۔"

اور اس نے اپنا پٹکا خواجہ نصر الدّین کے قدموں پر ڈال دیا۔ مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ ٹوپیاں، جوتے، پٹکے، رومال، حتیٰ کہ قبائیں تک خواجہ نصر الدّین کے قدموں پر برسنے لگیں۔ خواجہ نصر الدّین کی مدد ہر ایک اپنی عزّت خیال کرتا تھا۔ چائے خانے کا موٹا مالک اپنی دو بہترین چائے دانیاں لے اور تانبے کی ایک کشتی لے آیا۔ اس نے اپنی اس فیاضی کے لیے دوسروں کی طرف فخر سے دیکھا۔ تحفوں کا انبار بڑھتا جا رہا تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے اپنی پوری طاقت سے چلا کر کہا:

"کافی ہے، کافی، بخارا کے فیاض شہریو! کافی ہے۔ سُن رہے ہو نا؟ زین ساز اپنی زین واپس لے لو۔ بس کافی ہے، میں کہتا ہوں کیا تم اپنے خواجہ نصر الدّین کو پرانے کپڑوں کا بیوپاری بنا دینا چاہتے ہو؟ اب میں نیلام شروع کرتا ہوں۔ یہ رہا سقّے کا پٹکا، جو اسے خریدے گا اسے پیاس کبھی نہیں ستائے گی۔ آؤ، آؤ، سستا مال ہے۔ یہ رہے کچھ پرانے پیوند لگے جوتے۔ کم از کم یہ دو بار تو ضرور مکّہ شریف کا سفر کر چکے ہیں۔ جو ان کو پہنے گا وہ یہی محسوس کرے گا کہ وہ زیارت کے لیے جا رہا ہے۔ یہ رہے چاقو، ٹوپیاں، قبائیں اور جوتے! آؤ، آؤ سستا مال ہے، کوئی طے توڑ کی بات نہیں ہے۔ وقت بہت قیمتی ہے!"

لیکن وزیر اعظم بختیار وفادار رعایا کی برابر فکر رکھتا تھا اور اس نے بڑی محنت سے بخارا میں ایسا انتظام کیا تھا کہ لوگوں کی جیب میں ٹکا بھی نہ رہے اور سب کا سب امیر کے خزانے میں پہنچ جائے۔ خواجہ نصر الدّین کی یہ سب تعریف بے سُود ثابت ہوئی۔ کوئی خریدار نہیں ملا۔

۱۴

ٹھیک اسی وقت اتّفاق سے جعفر سُود خور کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس کی تھیلی سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی تھی جو اس نے جوہریوں کے بازار سے گُل جان کے لیے خریدا تھا۔

حالانکہ ایک گھنٹے کی مدّت ختم ہو چکی تھی اور سُود خور اپنی عیاشیانہ خواہشات سے چُور جلدی جلدی جا رہا تھا لیکن جب اس نے خواجہ نصر الدّین کو سستا مال بیچتے سنا تو لالچ غالب آیا۔

سُود خور کو دیکھتے ہی سارا مجمع کھسک گیا کیونکہ ہر تیسرا آدمی اس کا ضرور قرض دار تھا۔

جعفر نے خواجہ نصر الدّین کو پہچان لیا۔

"اچھا تو یہ تم ہو، جس نے مجھ کو کل پانی سے نکالا تھا؟ تم یہاں کاروبار کرتے ہو؟ اتنا سامان تم کو بیچنے کے لیے کہاں سے مل گیا؟"

"عزت مآب جعفر! آپ کو یاد نہیں ہے کہ کل آپ نے مجھے آدھا تانگہ دیا تھا؟" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "اور میں نے اس سے پیسہ بنایا۔ کام اور قسمت نے میرے کاروبار کا ساتھ دیا۔"

"اور تم نے ایک ہی دن میں یہ سارا سامان جمع کر لیا؟" سُود خور نے حیرت سے کہا۔ "واقعی میرے پیسے نے تمہیں بڑی برکت دی! اچھا تو سب سامان کے لیے تم کیا مانگتے ہو؟"

"چھ سو تانگے۔"

"پاگل ہو گئے ہو؟ تمھیں اپنے محسن سے اتنی بڑی رقم مانگتے شرم آنی چاہیے! میری بدولت ہی یہ خوش حالی آئی ہے؟ دو سو تانگے۔ یہ ہیں میرے دام۔"

"پانچ سو۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "آپ کا لحاظ کر کے، معزّز جعفر، پانچ سو تانگے!"

"ارے ناشکرے! ایک بار پھر یاد دلاتا ہوں۔ کیا یہ خوشحالی میری بدولت نہیں ہے؟"

"اور مہاجن، کیا تمھاری زندگی میری وجہ سے نہیں بچی؟" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ "یہ سچ ہے کہ تم نے مجھ کو آدھا تانگہ اپنی جان بچانے کے لیے دیا تھا لیکن تمھاری زندگی اس سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی اس لیے مجھے بُرا نہیں لگا۔ اگر تمھیں خریدنا ہے تو ٹھیک دام لگاؤ۔"

"تین سو!"

خواجہ نصر الدّین کچھ نہیں بولے۔

سُود خور رُکا۔ اس نے تجربے کار نگاہ سے سامان کو آنکا اور یہ اطمینان کر کے کہ یہ سب قبائیں، جوتے اور ٹوپیاں کم از کم سات سو تانگے کی ہوں گی بولی بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

"ساڑھے تین سو۔"

"چار سو۔"

"پونے چار سو۔"

"چار سو۔"

خواجہ نصر الدّین اپنی ضد پر اڑ گئے۔ کئی مرتبہ سُود خور نے یہ بناوٹ کی کہ وہ جا رہا ہے لیکن پھر لوٹ آیا اور ایک ایک تانگہ بڑھاتا رہا یہاں تک کہ آخر وہ راضی ہو گیا۔ سودا ہو گیا۔ طوعاً و کرہاً سُود خور نے رقم گنی۔

”خدا کی قسم، میں مال سے دُگنی رقم دے رہا ہوں۔ لیکن میری فطرت ہی یہی ہے کہ مہربانی کر کے نقصان اٹھاؤں۔“

”یہ سِکّہ جعلی ہے۔“ خواجہ نصر الدّین نے بیچ میں لقمہ دیا۔ ”اور چار سو تانگے بھی نہیں ہیں۔ صرف تین سو اسّی تانگے ہیں۔ نگاہ کمزور ہو گئی ہے، معزّز جعفر۔“

سُود خور کو مجبوراً بیس تانگے اور دینے پڑے اور جعلی سِکّہ بھی بدلنا پڑا۔ سودا ہونے کے بعد اس نے ایک قُلی چوتھائی تانگے پر لیا، اس پر سارا سامان لادا اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ بیچارہ قُلی تو سامان کے بوجھ سے کِرا جا رہا تھا۔

”ہم ایک ہی طرف جا رہے ہیں۔“ خواجہ نصر الدّین نے کہا۔

خواجہ گُل جان کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے اور تیزی سے آگے چل رہے تھے۔ سُود خور اپنی لنگڑے پن کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔

"تم کہاں جلدی جلدی جارہے ہو؟" سُود خور نے آستین سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں تم جا رہے ہو۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا، ان کی سیاہ آنکھوں میں شرارت کی جھلک تھی۔ "معزّز جعفر، تم اور میں ایک ہی جگہ اور ایک ہی کام سے جارہے ہیں۔"

"لیکن تم میرے کام کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔" سُود خور نے کہا۔ "اگر تم جانتے ہوتے تو مجھ پر رشک کرتے۔"

اس بات کے اندر جو مطلب پنہاں تھا اس کو خواجہ نصر الدّین سمجھ گئے اور انہوں نے زندہ دلی سے ہنس کر جواب دیا:

"لیکن مہاجن، اگر تمہیں میرے کام کا پتہ ہوتا تو تم مجھ پر دس گنا رشک کرتے۔"

جعفر نے گستاخانہ جواب کو محسوس کر کے گھورا اور کہا۔ ''تمہاری زبان بہت تیز ہے۔ تمہارے ایسے آدمیوں کو مجھ سے بات کرتے ڈرنا چاہیے۔ بخارا میں چند ہی ایسے لوگ ہیں جن پر میں رشک کر سکتا ہوں۔۔ میں دولتمند ہوں اور میری مرضی کسی طرح سے پابند نہیں ہے۔ میں نے بخارا کی حسین ترین دوشیزہ کی خواہش کی اور آج وہ میری ہو گی۔''

اسی وقت ایک آدمی ٹوکری میں بیریاں بیچتے ہوا اُدھر سے گزرا۔ خواجہ نصر الدّین نے ایک لمبے ڈنٹھل کی بیری ٹوکری سے چن کر سُود خور کو دکھائی اور بولے:

''معزّز جعفر، میری بات سُنو، کہتے ہیں کہ ایک دن ایک گیدڑ نے درخت میں اونچے پر ایک بیری دیکھی اور اس نے اپنے آپ سے کہا کہا میں تو اس کو کھائے بغیر چین نہیں ہوں گا۔ تو اس نے درخت پر چڑھنا شروع کیا اور دو گھنٹے تک چڑھتا رہا اور اس کے شاخوں سے بہت سے کھرونچے بھی آ گئے۔ اور ٹھیک اسی وقت جب وہ بیری کھانے جا رہا تھا اور

مُنہ بھاڑ سا کھول چکا تھا اچانک ایک باز جھپٹا اور بیری لے کر اُڑ گیا۔ اس کے بعد گیدڑ کو اُترنے میں دو گھنٹے اور لگے اور اس کے بدن پر اور زیادہ خراشیں آ گئیں۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا، ہائے میں بیری کے لیے کیوں درخت پر چڑھا کیونکہ یہ سبھی جانتے ہیں کہ بیریاں درختوں پر گیدڑوں کے لیے نہیں لگتی ہیں!"

"تم احمق ہو۔" سُود خور نے حقارت سے کہا۔ "تمہارے قصّے کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔"

"گہرے معنی فوراً سمجھ میں نہیں آتے۔" خواجہ نصر الدّین جھٹ سے بولے۔

بیری ان کے کان کے پیچھے لٹک رہی تھی اور ڈنٹھل ٹوپی میں دبا ہوا تھا۔

سڑک کی موڑ آئی۔ موڑ کے دوسری طرف کمہار اور اس کی بیٹی پتھروں پر بیٹھے تھے۔

کمہار کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جن میں اُمّید کی روشنی جھلکی تھی دھیمی پڑ گئیں کیونکہ اس نے سوچا کہ اجنبی رقم نہیں حاصل کر سکا۔ گُل جان نے ہلکی آہ کے ساتھ پیٹھ موڑ لی۔

"ابّا، ہم تباہ ہو گئے!" اس نے ایسی درد بھری آواز میں کہا کہ پتھر بھی اس کو سن کر پگھل جاتا۔ لیکن سُود خور کا دل تو پتھر سے بھی سخت تھا۔ صرف ظالمانہ فتح اور عیاشی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ وہ بولا:

"کمہار، مدّت ختم ہو گئی۔ اب سے تو میرا غلام ہے اور تیری بیٹی بھی میری کنیز اور داشتہ۔"

خواجہ نصر الدّین کو چرکا لگانے اور ذلیل کرنے کے لیے اس نے مالکانہ غرور کے ساتھ لڑکی کے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔

"دیکھو، کیا یہ حسین نہیں ہے؟ آج میں اس کے ساتھ ہم بستر ہوں گا۔ اب بتاؤ کون کس پر رشک کرے گا؟"

"واقعی حسین ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "لیکن کیا تمہارے پاس کمہار کا پرونوٹ ہے؟"

"ضرور ہے، پرونوٹ کے بغیر کاروبار کیسے ممکن ہے؟ سب آدمی دھوکے باز اور چور ہوتے ہیں۔ یہ رہا پرونوٹ، اس میں قرض کی رقم اور ادائیگی کی تاریخ حاضر ہے۔ نیچے کمہار کا انگوٹھا نشانی ہے۔"

اس نے پرونوٹ خواجہ نصر الدّین کو دکھایا۔

"پرونوٹ تو ٹھیک ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے تصدیق کی۔ "اچھا، اب اس پرونوٹ کے مطابق اپنی رقم لو۔ آپ حضرات ذرا ٹھہر جایئے اور گواہ بن جایئے۔" انہوں نے کچھ راہگیروں کی طرف مڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

انہوں نے رسید کے دو ٹکڑے کر دیے، پھر چار اور پھر اس کے پرزے پرزے چاک کر کے ہوا میں بکھیر دیے۔ اب انہوں نے پٹکا کھولا اور سُود خور کو وہ سب رقم واپس لوٹا دی جو ذرا دیر پہلے اس سے لی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمہار اور اس کی بیٹی حیرت اور خوشی سے جم کر پتھر ہو گئے ہیں اور سُود خور کا بھی غصّے سے یہی حال تھا۔ گواہ ایک دوسرے کو آنکھ مار رہے تھے۔ وہ نفرت انگیز سُود خور کی پریشانی پر ہنس رہے تھے اور اس سے لطف اٹھا رہے تھے۔

خواجہ نصر الدّین نے کان کے پیچھے سے بیری نکالی اور اپنے مُنہ میں رکھ لی۔ پھر سُود خور کی طرف آنکھ مار کر اپنے ہونٹ چاٹے۔

سُود خور کے بھدّے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ کی لہر دوڑ گئی، اس کے ہاتھ چنگلوں کی طرح بھیچ گئے، اس کی کانی آنکھ غصّے سے ابل پڑی اور اس کے کوبڑ میں لرزش ہوئی۔

کمہار اور گُل جان نے التجا کی:

”اجنبی، ہمیں اپنا نام تو بتا دو تا کہ ہم تمہارے لیے دُعا کر سکیں۔“

”ہاں!“ سُود خور نے جس کا مُنہ کف سے بھرا تھا اس بات پر صاد کیا۔
”اپنا نام بتا دو تا کہ میں اس پر لعنت بھیج سکوں!“

خواجہ نصر الدّین کا چہرہ چمک اٹھا۔ انہوں نے صاف اور زور کی آواز میں جواب دیا:

”بغداد میں اور طہران میں، استنبول اور بخارا میں۔ ہر جگہ مجھ کو لوگ ایک ہی نام سے جانتے ہیں۔ خواجہ نصر الدّین!“

سُود خور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ زرد پڑ گیا تھا:

”خواجہ نصر الدّین!“ کے نعروں نے ان کا استقبال کیا۔ گُل جان کی آنکھیں نقاب کے اندر چمک رہی تھیں۔ کمہار کے حواس ابھی تک

درست نہیں ہوئے تھے اور وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا اور ہاتھ ہلا رہا تھا۔

۱۵

امیر کی عدالت ابھی جاری تھی۔ جلّاد کئی بار بدلے جا چکے تھے۔ جسمانی سزا پانے والے بدقسمت لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ دو مصیبت زدہ ستونوں پر چیخ رہے تھے، تیسرے کا خون آلود سر زمین پر پڑا تھا۔ لیکن لوگوں کی چیخ و پکار اور آہیں اونگھتے ہوئے امیر کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ وہ درباری خوشامدیوں کے کورس میں ڈوب جاتی تھیں، تعریف کرتے کرتے جن کے گلے بیٹھ گئے تھے، اپنی تعریفوں میں وہ اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ وزیر اعظم، دوسرے وزراء اور ارسلان بیک کو بھی شامل کر لیں۔ حتیٰ کہ وہ مورچھل بردار اور حقّہ بردار کو بھی

نہیں بھولتے تھے کیونکہ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ ہر شخص کو خوش رکھنا ہی سلامتی کی ضمانت ہے، کچھ کو اس لیے کہ وہ کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو اس لیے کہ وہ خطرناک نہ بن سکیں۔

کچھ دیر سے ارسلان بیک ایسی آوازوں کی عجیب جھنجھناہٹ بے چینی سے سُن رہا تھا جو دور سے آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے دو بہت لائق اور تجربے کار جاسوسوں کو بلایا اور کہا۔ ”جا کر معلوم کرو کہ لوگوں میں اتنا جوش و خروش کیوں ہے۔ جاؤ اور فوراً مجھے خبر دو۔“

جاسوس روانہ ہو گئے۔ ایک فقیر کے بھیس میں تھا اور دوسرا درویش بن گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ لوٹیں سُود خور بھاگتا ہوا آیا۔ وہ زرد تھا اور اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ خود اپنی قبا کے دامنوں میں پھنس رہا تھا۔

”کیا ہوا، معزّز جعفر؟“ ارسلان بیک نے گھبرا کر پوچھا۔

"مصیبت آ گئی!" سُود خور نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ "معزّز ارسلان بیک، ہمارے اوپر بڑی بلا نازل ہو گئی ہے۔ خواجہ نصر الدّین ہمارے شہر میں ہے۔ میں نے ابھی اس کو دیکھا ہے اور اس سے باتیں کی ہیں۔"

ارسلان بیک کی آنکھیں نکل پڑیں۔ چبوترے کے زینے اس کے قدموں تلے چرچرا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر گیا اور اپنے نیند میں مارے آقا کے کان میں کچھ کہا۔

امیر اس طرح چونک کر سیدھا ہوا جیسے اس کے کسی نے سوئی کچو دی ہو۔

"جھوٹ کہتے ہو!" وہ چیخا۔ اس کا چہرہ خوف اور غصّے سے بگڑ گیا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ خلیفہ بغداد نے مجھے چند ہی دن ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کا سر قلم کروا دیا! ترکی کے سلطان نے لکھا ہے کہ انہوں نے اسے ستون پر چڑھوا کر مار دیا! شاہِ ایران نے خود اپنے قلم سے لکھا کہ انہوں نے اس کو پھانسی دلوا دی! خان خیوا نے عام اعلان کیا ہے کہ

انہوں نے زندہ اس کی کھال کھنچوالی! یہ ملعون خواجہ نصر الدّین کیسے چار بادشاہوں کے ہاتھ سے بچ کر نکل سکتا ہے؟"

خواجہ نصر الدّین کا نام سنتے ہی وزراء اور عمائدین کے چہرے فق ہو گئے۔ مور چھل بردار اچھل پڑا اور اس کے ہاتھ سے مور چھل گر گئی۔ حُقّے بردار کا گلا دھوئیں سے گھٹ گیا اور وہ کھانسنے لگا اور خوشامدیوں کی زبانیں مارے خوف کے تالو سے چپک گئیں۔

"وہ یہاں ہے۔" ارسلان بیک نے دھرایا۔

"تم جھوٹے ہو!" امیر نے چلّا کر شاہی ہاتھ سے اس کے ایک زوردار چانٹا جڑ دیا۔ "تم جھوٹ کہتے ہو۔ لیکن اگر وہ واقعی یہاں ہے تو وہ بخارا میں کیسے داخل ہوا اور تمہارے پہرے داروں اور تم سے کیا فائدہ ہے؟ تو پھر وہی ہے جس نے رات کو بازار میں سارا ہنگامہ برپا کیا! وہ لوگوں کو میرے خلاف اکسانا چاہتا تھا جبکہ تم سو رہے تھے اور کچھ نہیں سُن رہے تھے!"

امیر نے ارسلان بیک کے پھر چانٹا مارا۔ ارسلان بیک نے کافی جھک کر امیر کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا:

"میرے آقا، وہ یہاں ہے۔ آپ سُن نہیں رہے ہیں؟"

دور کی گڑگڑاہٹ رفتہ رفتہ بڑھ اور پھیل رہی تھی جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو۔ اور پھر عدالت کے چاروں طرف مجمع نے بھی عام ہیجان میں مبتلا ہو کر ہنگامہ شروع کر دیا۔ پہلے تو آہستہ اور مدہم آواز میں، پھر زور سے یہاں تک کہ امیر کو محسوس ہونے لگا جیسے سارا چبوترہ اور اس کا مرصع تخت ہل رہا ہے۔ اچانک آوازوں کی بھنبھناہٹ اور گھن گرج سے ایک نام اُبھرا، جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر شخص کی زبان پر تھا:

"خواجہ نصرالدّین!"

"خواجہ نصرالدّین!"

پہرے دار دھواں دھار مشعلیں لیے ہوئے توپوں کی طرف دوڑے۔

امیر کا چہرہ جذبات سے بپھرا ہوا تھا۔

"برخاست کرو!" وہ چیخا۔ "محل واپس چلو!"

اپنے مرصع لباس کے دامن سمیٹتے ہوئے وہ عجلت کے ساتھ محل واپس چلا گیا۔ اس کے پیچھے خالی پالکی لیے ہوئے لڑکھڑاتے اور بھاگتے ہوئے ملازمین تھے۔ آگے نکل جانے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے خوف زدہ وزیر، جلّاد، طائفے، پہرے دار، مور چھل اور حقّہ بردار سبھی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ جن کے جوتے اُتر گئے تھے وہ انہیں اُٹھانے کے لیے بھی نہیں رُک رہے تھے۔

صرف ہاتھی ہی اپنے روایتی وقار کے ساتھ سست رفتاری سے چل رہے تھے کیونکہ امیر کے عملے میں ہونے کے باوجود ان کو آدمیوں سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

پیتل سے منڈھے ہوئے محل کے بھاری پھاٹک امیر اور اس کے درباریوں کے داخلے کے بعد جھنکار کے ساتھ بند ہو گئے۔

اس دوران میں سارے بازار میں جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا خواجہ نصرالدّین کے نام کی گونج گرج سنائی دے رہی تھی۔

حصّہ دوئم

”یہ عجیب واقعات ہیں،

کچھ تو میری موجودگی ہی

میں ہوئے اور کچھ مجھ سے

معتبر اشخاص نے بیان کئے۔“

عثمان ابن منقض ”کتاب پند و نصیحت“

۱۶

بہت ہی قدیم زمانے سے بخارا کے کمہار شہر کے مشرقی پھاٹک کے قریب، ایک بڑے مٹّی کے ٹیلے کے اطراف میں بس گئے تھے اور ان کے لیے اس جگہ سے اور کوئی بہتر جگہ ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ چکنی مٹّی قریب تھی اور ایک نالی سے جو شہر کی فصیل کے برابر چلی گئی تھی پانی بھی افراط سے مل جاتا تھا۔ کمہاروں کے داداؤں، پر داداؤں اور نگڑ داداؤں نے اس ٹیلے کو آدھا کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر مٹّی سے بناتے تھے، برتن مٹّی سے بناتے تھے اور پھر خود بھی اعزاو اقربا کو ماتم کناں چھوڑ کر اسی مٹّی میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ اور اس کے برس ہا برس بعد

متعدّد بار ایسا ہوتا رہا کہ کسی کمہار نے کوئی برتن یا صراحی بنائی، دھوپ میں سکھائی اور آگ میں پکائی اور اس کی صاف اور زور دار کھنکھناہٹ پر متحیر رہ گیا لیکن اسے کبھی یہ شُبہ نہیں ہوا کہ کسی بہت زمانے پہلے کے بزرگ نے، جو اپنی نسلوں کی بہبودی اور اپنے برتنوں کی بِکری کی بڑی فکر رکھتا تھا، اس مٹّی کو اپنی خاک کے ایک ذرّے سے پاکیزہ بناتا ہے تاکہ اس میں خالص چاندی جیسی کھنک پیدا ہو سکے۔

یہاں ایک زبردست اور پرانے چنار کے درخت کے سائے میں بالکل نالی کے کنارے کمہار نیاز کا گھر تھا۔ ہوا میں پتّیوں کی سرسراہٹ ہوتی تھی، پانی قلقل کرتا بہتا تھا اور باغیچے میں صُبح سے رات تک حسین گُل جان کے نغمے گونجتے تھے۔

خواجہ نصرالدّین نے نیاز کے گھر میں رہائش اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔

"نہیں، نیاز۔" انھوں نے کہا۔ "میں تمہارے گھر میں گرفتار ہو سکتا ہوں۔ میں یہاں سے قریب ہی کسی محفوظ جگہ میں رات کو رہوں گا جو میں نے تلاش کرلی ہے۔ دن کو آکر میں تم کو کام میں مدد کر دوں گا۔"

اور انھوں نے یہی کیا۔ ہر صُبح سورج نکلنے سے پہلے وہ نیاز کے یہاں پہنچ جاتے تھے اور چاک پر بُڈّھے کمہار کے ساتھ کام کرنے لگتے تھے۔ دنیا میں کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جس سے خواجہ نصر الدّین واقف نہ ہوں۔ کمہار کا پیشہ اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی بنائی ہوئی صراحیوں میں چکنا پن اور گمک ہوتی تھی۔ ان میں انتہائی گرمی کے موسم میں بھی پانی برف کی طرح ٹھنڈا رہتا تھا۔ پہلے بڈھا کمہار جس کی نگاہ چند برسوں سے کمزور پڑنے لگی تھی، مشکل سے روزانہ پانچ چھ گھڑے بنا پاتا تھا لیکن اب اس کے یہاں تیس چالیس اور کبھی کبھی پچاس گھڑوں اور صراحیوں کی لمبی قطار دھوپ میں سوکھتی نظر آتی۔ بازار کے دن جب بڈھا گھر لوٹتا تو اس کی تھیلی بھری ہوتی اور رات کو پلاؤ کی اشتہا انگیز مہک اس کے گھر سے

ساری سڑک پر پھیل جاتی۔ پڑوسی بُڈّھے کی خوشحالی پر خوش ہوتے اور کہتے:

"آخر کار نیاز کے دن پھرے اور غریبی نے اس کا پنڈ چھوڑا، خدا کرے یہ ہمیشہ کے لیے ہو!"

"کہتے ہیں کہ اس نے ایک اور کاریگر ملازم رکھا ہے جو لاجواب کاریگر ہے۔"

"ہاں میں نے بھی یہ سُنا ہے۔ ایک دن میں نیاز کے یہاں گیا تاکہ اس کے کاریگر کو دیکھ سکوں لیکن باغیچہ کے پھاٹک میں داخل ہوا ہی تھا کہ کاریگر اُٹھا اور چلا گیا اور پھر سامنے نہیں آیا۔"

"ہاں بُڈّھا اپنے کاریگر کو چھپاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہوگا کہ ہم کہیں اس کے ماہر کاریگر کو پھسلا نہ لیں۔ عجیب آدمی ہے! جیسے ہم سب کمہار بالکل بے حیا ہیں اور بُڈّھے کی قسمت خراب کرنے پر تلے ہیں جو ابھی تو جاگی ہے۔"

اس طرح پڑوسیوں نے معاملے کو آپس میں نبٹ لیا اور کسی کے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ بُڈّھے نیاز کا کاریگر خود خواجہ نصر الدّین تھے۔ سب کو قطعی یقین تھا خواجہ نصر الدّین بہت دن ہوئے بخارا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ انہوں نے خود یہ افواہ پھیلائی تھی کہ جاسوس دھوکے میں آجائیں اور تلاش و جستجو میں ڈھیل ڈال دیں۔ اور ان کا مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملا کہ دس دن کے بعد شہر کے تمام پھاٹکوں سے مزید چوکیاں ہٹالی گئیں اور رات کو گشت کرنے والے پہرے دار اب بخارا کے باشندوں کو مشعلوں کی روشنی اور ہتھیاروں کی جھنکار سے پریشان نہیں کرتے تھے۔

ایک دن بُڈّھا نیاز خواجہ نصر الدّین کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا اور کراہتا رہا اور پھر بولا:

"خواجہ نصر الدّین تم نے مجھے غلامی سے اور میری بیٹی کو بے عزّتی سے بچایا، تم میرے ساتھ کام کرتے ہو اور مجھ سے دس گنا۔ یہ رہے ساڑھے

تین سو تانگے خالص منافع کے۔ یہ مجھ کو اُن برتنوں کی بِکری سے ملے ہیں جب سے تم نے میری مدد کرنی شروع کی۔ یہ رقم لے لو۔ یہ تو تمہارا حق ہے۔"

خواجہ نصرالدّین اپنا چاک روک کر بُڈّھے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

"نیاز میاں، تمہارا دماغ کچھ چل گیا ہے جو ایسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ تم مالک ہو اور میں تمہارا کاریگر۔ اگر تم مجھے منافع کا دسواں حصّہ یعنی ۳۵ تانگے دے دو تو میرے لیے بہت کافی ہوں گے۔"

نیاز کی پرانی تھیلی لے کر انہوں نے ۳۵ تانگے گنے اور ان کو اپنی جیب میں رکھا اور باقی بُڈّھے کو واپس کرنے لگا۔ لیکن نیاز نے رقم لینے سے قطعی انکار کر دیا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے، خواجہ نصر الدّین، یہ رقم تمہاری ہے۔ اگر ساری نہیں لیتے تو آدھی تو لے لو۔"

خواجہ نصر الدّین کو غصہ آگیا۔

"نیاز، اپنی ہتھیلی ہٹاؤ، دنیا میں جو ریت چلی آتی ہے اس کو نہ بگاڑو۔ اگر سب مالک اپنے کاریگروں سے آدھے کا ساجھا کرنے لگے تو کیا ہو گا؟ اس دینا میں نہ تو مالک رہیں گے اور نہ نوکر، نہ امیر رہیں گے، نہ غریب، نہ پہرے دار رہیں گے اور نہ امیر رہے گا۔ ذرا سوچو تو قدرت اس گڑبڑ کو کیسے برداشت کر سکتی ہے؟ ہم پر فوراً ایک اور طوفانِ نوح نازل ہو جائے گا! لو، اپنی ہتھیلی اچھی طرح چھپادو نہیں تو تمہارے پاگل پن کے خیالات انسانیت پر خدا کا قہر نازل کر دیں گے اور ساری بنی نوعِ انسان تباہ ہو کر رہ جائے گی۔"

یہ کہہ کر خواجہ نصر الدّین نے پھر اپنا چاک چالو کر دیا۔

"یہ بہترین گھڑا ہو گا۔" انہوں نے ہاتھوں سے نم مٹّی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے امیر کے سر کی طرح بجتا ہے۔ میں یہ گھڑا لے کر محل جاؤں گا۔ ان کو اسے رکھنا چاہیے، ممکن ہے کہ امیر کا سر غائب ہو جائے۔"

"دیکھو، خواجہ نصر الدّین، کہیں تمہارا سر ایسی باتوں کی وجہ سے کسی دن نہ غائب ہو جائے۔"

"ارے، تمہارے خیال میں خواجہ نصر الدّین کا سر غائب کرنا ایسا آسان ہے؟"

ہوں میں خواجہ نصر الدّین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

تیشے کو تیز کر کے کہتا ہے مجھے امیر

لٹیرا، فتنۂ عالم، زمانے کا شریر

ہوں میں خواجہ نصر الدّین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

میں زندہ رہ کر گاؤں گا

روشن دنیا میں موج اڑاؤں گا

دنیا بھر میں نعرہ یہ لگاؤں گا

"مردہ باد امیر، مردہ باد!"

ہاں سلطان بھی کہتا ہے میرا سر کٹوانے کو

اور شاہ نے فرمایا مجھ کو پھانسی پر لٹکانے کو

خیوا میں ہے تیّار چِتا میرے جلانے کو

ہوں میں خواجہ نصر الدّین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

غربت کا مارا، آوارہ ہوں ضرور

پر فکر پھٹکتی نہیں نزدیک و دور

جگت کی آنکھ کا تارا

قسمت کا راج دلارا

ہوں گے سلطان و خان و امیر

سب کو جوتی کی نوک پہ مارا

ہوں میں خواجہ نصر الدّین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

نیاز کی پیٹھ کے پیچھے گُل جان کے ہنستے ہوئے چہرے کی جھلک انگور کی بیلوں میں دکھائی دی۔ خواجہ نصر الدّین کا گیت بیچ میں رُک گیا اور گُل جان سے رمز و کنائے ہونے لگے۔

"تم کیا دیکھ رہے ہو؟" نیاز نے پوچھا۔ "ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں جنّت کی چڑیا دیکھ رہا ہوں، دنیا کی حسین ترین چڑیا!"

بُڈّھا کراہتے ہوئے پیچھے مُڑا لیکن گُل جان ہری بھری بیلوں کے درمیان غائب ہو چکی تھی اور صرف دور سے نقرئی ہنسی کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ بڑی دیر تک بُڈّھا تیز دھوپ کی روشنی سے بچنے کے لیے اپنی کمزور آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے ہر طرف گھورتا رہا لیکن اسے صرف ایک گوریا دکھائی دی جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدک رہی تھی۔

"ہوش کی دوا کرو، خواجہ نصرالدّین، کیسی جنت کی چڑیا، یہ تو گوریا ہے!"

خواجہ نصرالدّین نے دل کھول کر کر ٹھٹھا لگایا۔ بے چارہ نیاز اس خوشی کی وجہ نہ سمجھ کر سر ہلاتا رہا۔

رات کو کھانے کے بعد جب خواجہ نصر الدّین چلے گئے تو نیاز چھت پر ہلکی ٹھنڈی ہوا میں لیٹ گیا۔ جلد ہی خرّاٹے لینے لگا۔ اب نیچی باڑ کے پیچھے سے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ خواجہ نصر الدّین لوٹ آئے تھے۔

"سو گئے ہیں۔" گُل جان نے چپکے سے کہا۔

ایک چھلانگ میں وہ باڑ کے اس پار تھے۔

وہ تالاب کے کنارے حور کے درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ان کو لگا جیسے درخت اپنے لمبے سبز لباسوں میں لپٹے ہلکے ہلکے سے اونگھ رہے ہیں۔ صاف آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور چاندنی نے ہر چیز کو پُراسرار نیلگوں بنا دیا تھا۔ بہتا ہوا پانی گنگنا رہا تھا اور روشنی کی کرنوں سے کہیں کہیں چمک اٹھتا تھا اور پھر سائے میں غائب ہو جاتا تھا۔

گُل جان بھرپور چاندنی میں خواجہ نصر الدّین کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ خود ماہِ کامل کی طرح نورانی تھی۔ نازک اور لچکیلی، اپنی زلفوں کے پیچ و خم میں لپٹی ہوئی۔ خواجہ نے چپکے سے کہا:

"میں تجھے پیار کرتا ہوں، میری ملکہ، صرف تجھ سے پہلی مرتبہ میں نے پیار کیا ہے، میں تیرا غلام ہوں، تیرے آنکھ کے اشارے پر چلنے کے لیے تیّار ہوں۔ میں ساری زندگی تیرا انتظار کرتا رہا ہوں اور اب میں نے تجھے ڈھونڈ نکالا ہے۔ میں تجھے کبھی دل سے نہیں نکالا سکتا۔ میری زندگی تیرے بغیر ممکن نہیں ہے!"

"مجھے یقین ہے کہ تم یہ بات پہلی بار نہیں کہہ رہے ہو۔" گل جان نے حسد آمیز لہجے میں کہا۔

"میں؟" خواجہ نے ناراضگی سے کہا۔ "ارے گُل جان! تو نے یہ بات کیسے کہی؟"

خواجہ کی باتوں میں اتنا خلوص تھا کہ گُل جان نے ان پر اعتبار کر لیا۔ وہ نرم پڑ گئی اور خواجہ کے پاس مٹّی کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کا ایسا طویل بوسہ لیا کہ وہ ہانپ گئی۔

"سنو۔" گُل جان نے ذرا رُک کر کہا۔ "ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ جس لڑکی کو چومتے ہیں اسے کوئی تحفہ دیتے ہیں اور تم ہو کہ مجھے ایک ہفتے سے زیادہ سے چوم چاٹ رہے ہو لیکن ایک تانگہ تک نہیں دیا۔"

"صرف اس وجہ سے کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "لیکن آج تمہارے باپ نے مجھے تنخواہ دی ہے اور کل میں تمہارے لیے ایک اچھا سا تحفہ لاؤں گا۔ تمہیں کیا پسند ہے۔ ہار یا رومال یا پھر یاقوت کی انگوٹھی؟"

"اس کی کوئی بات نہیں۔" گُل جان نے چپکے سے کہا۔ "اس کی کوئی بات نہیں ہے، پیارے، مجھے تو تمہارے تحفے سے مطلب ہے۔ مجھے تو تم سے

اسی دن محبّت ہو گئی تھی جب تم بازار میں ہمارے پاس آئے تھے اور جب تم نے اس پاجی سُود خور کو بھگا دیا تھا تو یہ محبّت اور بھی زیادہ ہو گئی۔"

نالی میں نیلگوں پانی گنگناتا رہا اور صاف آسمان پر روشن ستارے جھلملاتے رہے۔ خواجہ نصر الدّین لڑکی سے اور ٹھُس کر بیٹھ گئے اور اپنی ہتھیلی اس کے گرم سینے پر رکھ دی۔ ان کے اوپر ایک مدہوشی کا عالم طاری ہو گیا کہ اچانک ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی ہیں۔ ان کا گال ایک زور کے تھپڑ سے جل اٹھا۔ انہوں نے پیچھے کھسک کر اپنے کو ہاتھ آڑا کر کے بچایا۔ گُل جان غصّے سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"میرے خیال میں میں نے ایک تھپڑ کی آواز سُنی ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے سہم کر کہا۔ "اگر زبان سے کہنے سے کام چل جائے تو بھلا مار پیٹ کی کیا ضرورت ہے؟"

"زبان سے!" گل جان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہی بڑی بُری بات ہے کہ میں نے شرم و حیا کو طاق پر رکھ کر تمہارے سامنے نقاب اُتار دی۔ پھر تمہارے لمبے ہاتھ وہاں تک پھیلنے لگے جہاں تک نہ چاہیے۔"

"اور مہربانی کر کے یہ تو بتاؤ کہ یہ فیصلہ کس نے کیا ہے کہ کہاں تک ہاتھوں کو پھیلانا چاہیے اور کہاں تک نہیں؟" خواجہ نصرالدّین نے حاضر جوابی سے کہا لیکن وہ کافی گھبرائے ہوئے تھے۔ "اگر تم نے دانش مند ابن طفیل کی کتابیں پڑھی ہوتیں۔۔۔"

"شکر ہے خدا کا۔" گُل جان نے غصّے میں بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے خدا کہ میں نے ایسی آوارگی کی کتابیں نہیں پڑھیں ہیں۔ میں اپنی عصمت کی حفاظت اسی طرح کرتی ہوں جیسی ایک اچھی لڑکی کو کرنی چاہیے۔"

وہ اس کی طرف سے مُڑ کر چلی گئی۔ زینے اس کے ہلکے قدموں تلے چرچرائے اور جلد ہی بالکونی کی جھلملیوں سے روشنی چمکنے لگی۔

”میں نے اس کے جذبات کو ٹھیس لگادی۔“ خواجہ نصر الدّین نے سوچا "میں کیسا احمق ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ کیسے مزاج کی ہے۔ اگر وہ میرے گال پر چانٹا رسید کر سکتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دوسرے کے بھی تھپڑ مار سکتی ہے اور وہ وفادار بیوی ہو گی۔ ہاں، اگر شادی کے بعد وہ دوسرے مردوں کے ساتھ اپنے تھپڑوں سے ایسے ہی فیاضی برتے تو میں شادی سے پہلے اس کے سینکڑوں چانٹے سہنے کو تیّار ہوں۔“

وہ پنجوں کے بل بالکونی تک گئے اور دھیمے سے پکارا:

”گُل جان!“

کوئی جواب نہیں ملا۔

”گُل جان!“

مہک، تاریکی اور خاموشی۔ خواجہ نصر الدّین افسردہ ہو گئے۔ انہوں نے ایسی مدہم آواز میں گانا شروع کر دیا کہ بڑے میاں کی نیند نہ کھلے:

چرا لے گئیں دل تیری حسین پلکیں

گراتی ہو اپنی نظروں سے

اور چراتی ہو اپنی پلکوں سے

اور ستم پر ستم تو دیکھو

ہمیں سے معاوضے کی طالب

اچھا، کچھ پیار ہو جائے

آؤ، بوس و کنار ہو جائے

لیکن ان کا تلخ شربت

بھڑکاتا ہے شعلۂ اُلفت

درو بام بند کیے مجھ پر

زندگی حرام کی مجھ پر

اب نیند کہاں سے لاؤں

بتاؤ، چین کہاں سے پاؤں

تیری اک نگاہ کی آرزو

تیر بے پناہ کی آرزو

تیری زلف مشک بو کا شیدائی

تیری گیسوئے عنبریں کا سودائی

اس طرح وہ گاتے رہے اور حالانکہ نہ تو گُل جان آئی اور نہ اس نے کوئی جواب دیا لیکن خواجہ جانتے تھے کہ وہ توجّہ سے سُن رہی ہے۔ وہ یہ بھی

جانتے تھے کہ ایسے گیت سے ہر عورت ضرور متاثر ہو گی اور ان کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ کواڑ کا پٹ تھوڑا سا کھلا۔

"آ جاؤ۔" گُل جان نے چپکے سے کہا۔ "ذرا چپکے سے آنا، کہیں ابّا کی آنکھ نہ کھل جائے۔"

وہ زینوں پر چڑھ گئے اور اب اس کے پاس بیٹھے تھے۔ چربی سے بھرے ہوئے چراغ کی لُو صُبح تک لہراتی اور جلتی رہی۔ وہ باتیں کرتے رہے لیکن ان کا دل نہیں بھرا۔ مختصر یہ کہ سب کچھ وہی ہوا جیسا کہ ہونا چاہیے اور جیسا کہ ابو محمد علی ابن حزم نے اپنی کتاب "قمری کے ہار" کے محبّت کی فطرت والے باب میں بیان کیا ہے۔

"محبّت، اللہ اس کو سلامت رکھے، ایک کھیل کی طرح شروع ہوتی ہے لیکن بہت سنگین معاملے پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اتنی اعلیٰ خوبیوں کی حامل ہے کہ ان کا بیان امکان سے باہر ہے اور اس کے اصل جوہر کو سمجھنا مشکل ہے۔ جہاں تک اس کا سوا ہے کہ محبّت زیادہ تر حسن ظاہر کی وجہ

سے کیوں ہوتی ہے تو اس کا سمجھنا مشکل نہیں ہے کیونکہ روح خود حسین ہے اور بے عیب شکل و صورت کی طرف کھینچتی ہے۔ ایسی شکل کو دیکھ کر روح اس کا جائزہ لیتی ہے اور اگر سطح سے نیچے بھی کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جو اس سے یگانگت رکھتی ہے تو سنجوگ ہو جاتا ہے اور پھر سچی محبّت جنم لیتی ہے۔ واقعی، ظاہری شکل و صورت حیرت انگیز طریقے سے روح کے دور افتادہ ذرّات کو بھی متحد کر دیتی ہے!"

۱۷

چھت پر بُڈّھے نے کروٹ لی۔ وہ چھینکا اور کھانسا اور نیند ہی میں گُل جان سے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔ گُل جان نے خواجہ کو دروازے کی طرف دھکیلا اور وہ زینوں پر اس طرح بھاگے کہ ان کے پیر مشکل سے قدمچوں کو چھو رہے تھے۔ پھر وہ کود کر باڑ کے پار ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد، وہ قریب کی نہری نالی سے مُنہ دھو کر اور اپنی قبا کے دامن سے چہرہ پونچھ کر پھر لکڑی کے پھاٹک کو کھٹکھٹا رہے تھے۔

"صُبح بخیر، خواجہ نصر الدّین۔" بُڈّھے نے چھت ہی پر سے اُن کو خوش آمدید کہا۔ "پچھلے چند دنوں سے تم کتنے سویرے اٹھنے لگے ہو۔ تم سوتے کب ہو۔ اچھا، کام شروع کرنے سے پہلے ہم چائے پی لیں۔"

دوپہر کو خواجہ بُڈّھے کو چھوڑ کر گُل جان کے لیے تحفہ خریدنے بازار گئے۔ انہوں نے حسبِ معمول یہ احتیاط کی کہ بدخشاں کا رنگین عمامہ باندھا اور مصنوعی داڑھی لگالی۔ اس بھیس میں وہ پہچانے نہیں جاسکتے تھے اور جاسوسوں سے نڈر ہو کر وہ دُکانوں اور چائے خانوں میں جاسکتے تھے۔

انہوں نے مونگے کا ایک ہار منتخب کیا جس کے رنگ نے ان کو اپنی محبوبہ کے ہونٹوں کی یاد دلا دی۔ جوہری معقول آدمی ثابت ہوا اور صرف ایک گھنٹہ خوب طے توڑ کر کے خواجہ نے تیس تانگے کا ہار خریدا۔

واپسی میں خواجہ نصر الدّین نے بازار کی مسجد کے قریب بڑی بھیڑ دیکھی۔ لوگ گھس گھس کر ایک دوسرے کے کندھوں کے اوپر سے اپنی

گردنیں نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب وہ قریب پہنچ گئے تو انہوں نے ایک درست اور تیز آواز سنی"

"مومنو، خود دیکھ لو! اس پر فالج گرا ہے اور یہ دس سال سے بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اس کے تمام عضو مفلوج اور ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ دیکھو، یہ اپنی آنکھیں تک نہیں کھولتا۔ یہ بہت دور سے ہمارے شہر آیا ہے۔ خدا ترس رشتے دار اور دوست اسے یہاں صرف اس علاج کے لیے لے آئے ہیں جس کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔ ایک ہفتے میں مقدس ترین اور بے مثال بزرگ حضرت بہاؤ الدّین کے عرس کے دن اس کو مزار کے زینوں پر لٹا دیا جائے گا۔ اس طرح اندھے، لنگڑے اور صاحب فراش مریض متعدّد بار شفا پا چکے ہیں۔ اس لیے اے مومنو آیئے ہم دُعا کریں کہ مقدس شیخ اس پر رحم کھائیں اور اس بدقسمت انسان کو شفا عطا فرمائیں۔"

مجمع نے دُعا پڑھی اور پھر اس تیز آواز نے شروع کیا:

"مومنو، خود دیکھ لو! اس پر فالج گرا ہے اور یہ دس سال سے بے حس و حرکت پڑا ہے!"

خواجہ نصر الدّین نے دھکم پیل کر کے مجمع میں اپنے لیے راستہ بنایا اور پنجوں پر کھڑے ہو کر ایک لمبا، سوکھا سا ملا دیکھا جس کی آنکھوں میں کمینگی جھلک رہی تھی۔ اس کی داڑھی چھدری تھی۔ وہ چلّا چلّا کر بیماروں کی ایک ڈولی کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا تھا جس پر مفلوج آدمی پڑا تھا۔

"دیکھو، اے مسلمانو! دیکھو، یہ کیسا قابلِ رحم اور بدقسمت آدمی ہے! لیکن ایک ہفتے میں مقدس بہاؤ الدّین اس کو شفا بخشیں گے اور اس کو دوبارہ زندگی عطا فرمائیں گے!"

مفلوج آدمی پڑا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور ایک افسردہ اور قابل رحم تاثر اس کے چہرے پر تھا۔ خواجہ نے حیرت سے آہ بھری۔ وہ ہزاروں آدمیوں میں بھی یہ چیچک بھرا چہرہ اور چپٹی ناک پہچان سکتے

تھے۔ بظاہر یہ آدمی کافی دن سے مفلوج تھا کیونکہ سستی اور بےکاری سے وہ زیادہ موٹا ہو گیا تھا۔

اس دن سے جب بھی خواجہ نصر الدّین اس مسجد کی طرف سے گزرتے وہ ہمیشہ ملا اور مفلوج کو وہاں ضرور پاتے جس کا چیچک دار چہرہ روز بروز زیادہ موٹا اور چکنا ہوتا جا رہا تھا۔

آخر کار مقدس شیخ کے عرس کا دن آیا۔ یہ پرانی روایت چلی آتی ہے کہ ان کی وفات مئی کے مہینے میں ٹھیک دوپہر کو ہوئی تھی اور حالانکہ دن بہت صاف تھا اور آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا تک نہ تھا لیکن ان کی موت کے وقت سورج سیاہ پڑ گیا اور زمین کانپنے لگی اور بہت سے گنہگاروں کے مکانات مسمار ہو گئے جن میں یہ گنہگار بھی دفن ہو گئے تھے۔ یہ تھی وہ کہانی جو ملا لوگ مسجدوں میں کہتے تھے اور مسلمانوں سے اپیل کرتے تھے کہ وہ شیخ کے مزار پر ضرور آئیں اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کریں

تا کہ ان کا شمار منکروں میں نہ ہو اور ان کا حشر بھی ان گنہگاروں جیسا نہ ہو۔

رات رہے سے ہی زائرین روانہ ہونا شروع ہو گئے اور سورج نکلتے نکلتے مقبرے کے چاروں طرف بڑے میدان میں زبردست مجمع ہو گیا اور بہت سے لوگ ابھی چلے آرہے تھے۔ پرانے رواج کے مطابق سب ننگے پیر تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو دور دراز سے آئے تھے۔ خصوصاً متّقی اور پرہیز گار اور ایسے لوگ جنہوں نے سنگین گناہ کیے تھے اور بخشائش کے امیدوار تھے۔ شوہر اپنی بانجھ بیویوں کو لائے تھے، مائیں بیمار بچّوں کو لیے تھیں، بُڈّھے بیساکھیوں کے سہارے چل کر آئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر کوڑھیوں کا مجمع تھا جو آس لگائے مقبرے کے سفید گنبد کی طرف دیکھ رہے تھے۔

عبادت کافی دیر تک شروع نہیں ہوئی کیونکہ امیر کا انتظار تھا۔ مجمع تپتی ہوئی دوپہر میں ٹھسا ٹھس کھڑا تھا۔ کوئی بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ان کی آنکھوں میں حریص اور گرسنہ شعلے تھے۔ دنیاوی مسرّتوں پر ان کا عقیدہ اُٹھ گیا تھا، آج وہ کسی معجزے کی توقع کرتے تھے اور ہر زور کی آواز پر چونک پڑتے تھے۔ شدید اشتیاق ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا اور دو درویش تشنّج میں مبتلا ہو کر دانتوں سے مٹّی کھُرچ رہے تھے، ان کے مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ مجمع میں ہلچل تھی، ہر طرف عورتیں چیخ اور رو رہی تھیں۔ اچانک ہزاروں گلوں سے ایک غلغلہ بلند ہوا:

"امیر! امیر!"

مجمع کے درمیان راستہ بنانے کے لیے شاہی پہرے داروں نے ڈنڈوں سے کام لیا اور اس چوڑے راستے پر امیر ننگے پیر، سر جھکائے، استغراق کی حالت میں دنیا کے ہنگامے سے بے خبر اور بے نیاز زیارت کے لیے چلا جا رہا تھا۔ خدّام تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر دوڑ کر اس کے پیچھے قالین لپیٹتے جاتے تھے اور پھر ان کو تیزی سے آگے لے جا کر بچھاتے تھے۔

اس نظارے کو دیکھ کر بہت سے لوگوں پر رِقّت طاری ہو رہی تھی اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ امیر اس مٹّی کے چبوترے پر چڑھا جو مزار کے دامن میں تھا۔ جانماز اس کے سامنے بچھا دی گئی اور اپنے وزیروں کی مدد سے جو دونوں پہلوؤں سے اس کو سنبھالے تھے امیر اس پر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ سفید عباؤں میں ملبوس ملّاؤں نے ایک نیم حلقہ سا بنا لیا اور اپنے ہاتھ گرمی سے سنولائے ہوئے آسمان کی طرف اٹھا کر دُعا پڑھنا شروع کر دی۔

یہ عبادت ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وعظ ہوتے۔ خواجہ نصر الدّین مجمع سے چپکے سے کھسک گئے اور اس الگ تھلگ چھوٹے سے گھر کی طرف چلے جہاں اندھے، لنگڑے اور صاحب فراش مریض تھے جن سے آج کے دن شفا کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ اپنی باری کے منتظر تھے۔

اس مکان کے دروازے پٹو پٹ کھلے تھے۔ متجسس لوگ اندر جھانک کر دیکھتے اور آپس میں تبادلہ خیال کرتے۔ جو ملا یہاں ڈیوٹی پر تھے وہ

چڑھاوے کے لیے بڑے بڑے تانبے کے طبق لیے کھڑے تھے۔ بڑا ملا کہہ رہا تھا:

"۔۔۔ اور اس وقت سے تقدس مآب شیخ بہاؤ الدّین مقدس بخارا اور اس کے آفتابِ زماں امیروں پر سدا کے لیے مستقل طور پر مہربان ہیں۔ اور ہر سال اس دن مقدس بہاؤ الدّین ہم کو، خدا کے حقیر بندوں کو معجزے دکھانے کی طاقت عطا فرماتے ہیں۔ یہ تمام اندھے، لنگڑے، آسیب زدہ اور معذور لوگ شفا پانے کے منتظر ہیں اور ہمیں اُمّید ہے کہ ہم مقدس بہاؤ الدّین کی عنایت سے ان کو مصیبتوں سے نجات دلا سکیں گے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان باتوں کے جواب میں مکان سے رونے، چیخنے اور دانت کٹکٹانے کی آواز آ رہی ہے۔ اپنی آواز بلند کرتے ہوئے ملا نے بیان جاری رکھا:

"اے مومنو، دل کھول کر مسجدوں کی آرائش کے لیے دو، آپ کی خیرات خدا کے یہاں مقبول ہو گی۔"

خواجہ نصر الدّین نے مکان کے اندر جھانک کر دیکھا۔ دروازے کے قریب چیچک رو موٹا نوکر ڈولی پر لیٹا ہوا تھا۔ دُھندلکے میں اس کے پیچھے بہت سے لوگ بیساکھیوں کے سہارے کھڑے، پٹیوں میں لپٹے یا ڈولیوں پر پڑے تھے۔ اچانک مقبرے کی طرف سے بڑے ملا کی آواز گونجی جس نے ابھی وعظ ختم کیا تھا۔

"اندھے کو! اندھے کو میرے پاس لاؤ۔"

خواجہ نصر الدّین کو راستے سے دھکیلتے ہوئے ملا امس بھرے تاریک مکان میں گھس گئے اور ایک فقیروں کی طرح چیتھڑوں لگے اندھے کو اپنے ساتھ باہر لائے۔ وہ ہاتھ پھیلا کر ٹٹولتا اور پتھروں پر ٹھوکریں کھاتا چل رہا تھا۔

اندھا بڑے ملا کے پاس پہنچا، اس کے سامنے مُنہ کے بل گِر پڑا اور مقبرے کی چوکھٹ کو بوسہ دیا۔ بڑے ملا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آنکھ جھپکاتے وہ بینا ہو گیا۔

"میں دیکھ سکتا ہوں! میں دیکھ سکتا ہوں!" وہ زوروں سے کانپتی آواز میں چیخنے لگا۔ "مقدّس بہاؤالدّین! میں دیکھ سکتا ہوں، دیکھ سکتا ہوں، ارے زبردست اور حیرت انگیز معجزہ ہے!"

عبادت کرنے والوں کے ایک بڑے مجمع نے اس کو گھیر لیا اور چاؤں چاؤں کرنے لگے۔ بہت سے لوگ اس کے قریب آکر پوچھنے لگے :

"اچھا بتاؤ، میں نے کون سا ہاتھ اٹھایا ہے، دایاں یا بائیاں؟"

اس نے صحیح جواب دیے جس سے سب لوگ مطمئن ہو گئے کہ اس کو شفا ہوئی ہے۔

اب ملّاؤں کی پوری فوج تانبے کے طبق لے کر مجمع میں یہ چلّاتی ہوئی گھس گئی:

"اے سچے مومنو، تم نے اپنی آنکھوں سے معجزہ دیکھ لیا۔ کچھ مسجدوں کی آرائش کے لیے دو!"

سب سے پہلے امیر نے مٹھی بھر اشرفیاں طبق میں پھینکیں۔ پھر وزیروں اور عمائدین کی باری آئی جنہوں نے ایک ایک اشرفی دی۔ اب مجمع نے بڑی فیاضی کے ساتھ چاندی اور تانبے کے سکوں کی بارش شروع کر دی۔ طبق جلد ہی بھر گئے اور ملّاؤں کو انہیں تین بار بدلنا پڑا۔

جیسے ہی چندے کا سیلاب دھیما پڑا ایک لنگڑا آدمی مکان سے لایا گیا۔ وہ بھی مقبرے کی چوکھٹ چومتے ہی فوراً تندرست ہو گیا اور اپنی بیساکھیاں پھینک پیر اُچھال اُچھال کر ناچنے لگا۔ اور پھر ملا خالی تھالیاں لیے یہ پکارتے ہوئے آگے بڑھے۔ "خیرات کیجئے، سچّے مومنو!"

ایک سفید داڑھی والا ملا خواجہ نصر الدّین کے پاس پہنچا جو اپنے خیالات میں ڈوبے تھے اور ان کی آنکھیں مریضوں والے مکان پر لگی تھیں۔

"اے سچّے مومن، تو نے یہ زبردست معجزہ دیکھا ہے۔ خیرات کر، اللہ اس کا اجر دے گا!"

اس طرح زور سے بولتے ہوئے کہ ان کے قریب کے لوگ سُن سکیں خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "تم اس کو معجزہ کہہ کر مجھ سے پیسے اینٹھنا چاہتے ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے ملا جی کہ میں بھی بہت بڑا بزرگ ہوں اور اس سے بڑا معجزہ دکھا سکتا ہوں!"

"تو مرتد ہے!" ملا نے غصّہ سے کہا۔ "مسلمانو، اس کی بات مت سنو، اس کے مُنہ میں شیطان بیٹھ گیا ہے!"

خواجہ نصر الدّین نے مجمع کی طرف رُخ کر کے کہا:

"ملا کو یہ یقین نہیں ہے کہ میں معجزہ دکھا سکتا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ثبوت دوں گا۔ اس مکان میں اندھے، لنگڑے، بیمار اور معذور جمع ہیں اور میں ان سب کو بلا چھوئے ہوئے اچھا کرنے کی ذمّہ داری لیتا ہوں۔ میں صرف دو لفظ کہوں گا اور بس وہ چنگے ہو جائیں گے۔ وہ اِدھر

اُدھر پھیل جائیں گے اور اتنے تیز بھاگیں گے کہ صبا رفتار عرب گھوڑا بھی اُن کو نہ پکڑ سکے گا۔"

مکان کی دیواریں پتلی تھیں اور جس مٹّی کی وہ بنی ہوئی تھیں وہ کئی جگہوں پر کافی چیخ گئی تھی۔ خواجہ نصر الدّین نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی تھی جہاں دیوار میں کئی دراڑیں تھیں اور انہوں نے یہاں اپنے بازو سے اسے دھکا دیا۔ مٹّی ٹوٹ گئی۔ تھوڑی سی لیکن پُراسرار سرسراہٹ ہوئی۔ انہوں نے اور زور سے دھکیلا اور دیوار کا ایک بڑا حصّہ دھڑام سے گر گیا۔ گری ہوئی تاریک جگہ سے زبردست گرد کا بادل اٹھا۔

"زلزلہ! بھاگو!" خواجہ نصر الدّین زور سے چلائے۔ انہوں نے دیوار کا ایک اور حصّہ گرا دیا۔

جھونپڑی کے اندر ایک لمحہ تو بالکل خاموشی رہی اور پھر ہنگامہ ہو گیا۔ چیچک رو مفلوج سب سے پہلے دروازے کی طرف معہ اپنی ڈولی کے بھاگا لیکن اس کی ڈولی دروازے میں پھنس گئی اور دوسروں کے لیے راستہ

رُک گیا۔ اندھے، لنگڑے اور معذور ایک دوسرے کو دھکیلنے، ہنگامہ کرنے اور چلّانے لگے۔ جب خواجہ نصرالدّین نے دیوار کا تیسرا حصّہ گرا دیا تو مریضوں نے ایک زبردست ریلے سے چیچک رو آدمی، دروازہ اور اس کے چوکھٹ وغیرہ کو اکھاڑ پھینک دیا اور اپنی معذوری کو بھول کر چاروں طرف نکل بھاگے۔

مجمع غُل مچا رہا تھا، سیٹیاں بجا رہا تھا، ہنس رہا تھا اور مذاق اُڑا رہا تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے اس مجمع کی کاؤں کاؤں کے اُوپر اپنی آواز بلند کی:

''مسلمانو! تم نے دیکھ لیا نا۔ میں نے یہ بات بالکل بجا کہی تھی کہ وہ چند الفاظ سے شفایاب ہوسکتے ہیں!''

اب وعظوں سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی۔ ہر طرف سے لوگ ادھر دوڑنے لگے۔ جب ان کو واقعہ معلوم ہوتا تو وہ خوب قہقہے لگاتے اور قصّہ دوسروں سے بیان کرتے۔ تھوڑی ہی دیر میں معتقدین کے پورے مجمع میں مکان والے واقعہ کی خبر گشت کر گئی اور جب بڑے ملا نے اپنا ہاتھ اٹھا

کر خاموشی کے لیے کہا تو مجمع نے اس کا جواب لعنت ملامت، شور و غل اور سیٹیوں سے دیا۔

اور پھر جیسے اس یادگار دن بازار میں ہوا تھا مجمع میں کھُسر پھُسر اور ہنگامہ اور چرچا ہونے لگا:

"خواجہ نصر الدّین! واپس آ گئے ہیں وہ! وہ یہاں ہیں، ہمارے خواجہ نصر الدّین!"

آوازوں اور فقروں سے گھبرا کر ملا لوگ اپنے طبق چھوڑ کر مجمع سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس وقت تک خواجہ نصر الدّین دُور پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا رنگین عمامہ اور مصنوعی داڑھی قبا میں چھپا لی کیونکہ اب ان کو جاسوسوں سے مُڈ بھیڑ ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا جو مقبرے کے اطراف میں مصروف تھے۔

بہر حال، وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ جعفر سُود خور گھروں کے کناروں اور سڑک کے درختوں کی آڑ لے کر اُن کا پیچھا کر رہا ہے۔

ایک سنسان گلی میں خواجہ نصر الدّین باڑ کے پاس گئے اور ہاتھوں کے بل اوپر اٹھ کر ہلکے سے کھنکارے۔ فوراً ہی ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی اور زنانی آواز آئی :

"تم ہو، پیارے ؟"

درخت کے پیچھے سے جہاں سُود خور چھپا ہوا تھا اس کو حسین گُل جان کی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ پھر اس نے کھُسر پھُسر، ہلکی ہنسی اور بوسوں کی آواز سنی۔

"اچھا تو تم نے اس کو مجھ سے اپنے لیے چھینا تھا!" سُود خور نے بہت جل کر سوچا۔

گُل جان سے رُخصت ہو کر خواجہ نصر الدّین اتنی تیزی سے نکل گئے کہ سُود خور ان کا پیچھا نہ کر سکا اور تنگ گلیوں کی بھول بھلیوں میں ان کا نشان کھو بیٹھا۔

"اچھا اب تو اس کی گرفتاری کا انعام مجھے ملنے سے رہا۔" سُود خور نے پریشان ہو کر سوچا۔ "لیکن کوئی بات نہیں! خواجہ نصر الدّین ہوشیار رہنا، میں تم سے اس کے لیے عبرتناک انتقام لوں گا۔"

۱۸

امیر کے خزانے کو زبردست خسارہ ہوا۔ پچھلے برسوں کے مُقابلے میں حضرت بہاؤ الدّین کے مقبرے سے رقم کا دسواں حصّہ بھی نہیں آیا۔ اور اس سے بُری بات تو یہ تھی کہ لوگوں کے دماغوں میں دلیرانہ آزاد خیالی کی پھر سے آبیاری ہو گئی۔ جاسوسوں نے مخبری کی کہ مقبرے کے واقعے کی خبر ریاست کے کونے کونے تک پہنچ گئی اور اس کے نتائج بھی بر آمد ہوئے۔ تین گاؤں میں باشندوں نے مسجدوں کی تکمیل سے انکار کر دیا اور چوتھے میں انہوں نے اپنے ملا کو بہت ذلیل کر کے نکال دیا۔

امیر نے وزیر اعظم بختیار کو حکم دیا کہ وہ دیوان یعنی ریاستی کونسل کا جلسہ طلب کرے۔ کونسل کا جلسہ محل کے باغ میں ہوا۔ یہ بھی عجیب و غریب باغ تھا، دنیا کا سب سے حسین باغ۔ شاندار چھتنارے درختوں پر نایاب پھل لگے تھے۔ بہت سے اقسام کے شفتالو، بادام، آلوچے، انجیر اور نارنگیاں اور بہت سے دوسرے پھل جن کا بیان مشکل ہے۔ گلاب اور طرح طرح کے پھول پودوں کی چمن بندیاں تھیں جن سے ساری فضا معطّر رہتی تھی۔ کوڑیالے کے پھُول مُسکرا رہے تھے اور نرگس ان کی طرف محبّت سے دیکھ رہی تھی۔ فوّارے اُچھل رہے تھے اور سنگِ مرمر کے حوضوں میں طرح طرح کی سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ہر جگہ نقرئی پنجروں میں نایاب چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

لیکن وزرا، عمائدین اور حکما بے پروائی سے گزر رہے تھے۔ وہ حسن کے جادُو سے بے خبر اور ناآشنا تھے کیونکہ ان کے خیالات بالکل اپنے مفادات پر مرکوز تھے کہ کس طرح اپنے دُشمنوں کی چوٹوں سے بچا

جائے اور اپنی باری آنے پر کیسے اُن کو چوٹ کی جائے۔ اس طرح ان کے سخت اور مُرجھائے ہوئے دِلوں میں اس کے سوا کسی اور بات کے لیے جگہ ہی نہ تھی۔ اگر اچانک دنیا کے تمام پھُول مُرجھا جاتے اور ساری چڑیاں چہچہانا بند کر دیتیں تب بھی وہ توجّہ نہ کرتے کیونکہ وہ اپنی ذاتی خواہشات اور حریصانہ چالوں میں مبتلا تھے۔

ان کی آنکھوں میں افسردگی تھی اور خون سے عاری ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور ریتلے راستوں پر اپنی جوتیاں گھسیٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک کُنج میں داخل ہوئے جو سرسبز، گھنی اور مہک دار بیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں وہ اپنی مرصع عصائیں دیوار کے سہارے کھڑی کر کے ریشمی گدّوں پر بیٹھ گئے۔ بڑے عماموں کے بوجھ سے سر جھکائے وہ خاموشی سے اپنے آقا کا انتظار کرنے لگے۔

وہ بھاری قدموں سے اندر داخل ہوا، غمگین خیالات سے اس کی تیوریوں پر بل تھا۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور تقریباً زمین تک جھک گئے اور اس

وقت تک جھکے رہے جب تک اس نے ہلکا سا اشارہ نہ کیا۔ اب آداب کے مطابق وہ گھٹنوں کے بل ہو گئے اور اپنے جسم کا سارا وزن ایڑیوں پر ڈال دیا۔ ان کی انگلیاں قالین پر تھیں۔ ہر ایک اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج امیر کا قہر کس پر نازل ہو گا اور اس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

درباری شاعروں نے حسبِ معمول آداب کے مطابق امیر کے پیچھے نصف حلقہ بنالیا اور ہلکے ہلکے کھنکار کر اپنے گلے صاف کرنے لگے۔

ان میں سب سے لائق شاعر جس کو "ملک الشعرا" کا خطاب مل چکا تھا دل ہی دل میں وہ قصیدہ دُہرا رہا تھا جو اس نے آج ہی صُبح تیّار کیا تھا اور امیر کو اس طرح سُنانا چاہتا تھا جیسے اس نے مافوق الفطرت جوش کے ماتحت اس کو فی البدیہہ کہا ہے۔

شاہی مور چھل اور حقّہ بر داروں نے بھی اپنی اپنی مقرّرہ جگہیں سنبھال لیں۔

"بخارا میں کس کی حکومت ہے؟" امیر نے دھیمی آواز میں ابتدا کی جس سے سامعین کو جھرجھری آگئی۔ "بخارا میں کس کی حکومت ہے؟ ہم تم سے پوچھتے ہیں۔ ہماری یا اس ملعون، ناپاک خواجہ نصر الدّین کی؟" یہاں تقریباً اس کی آواز گھُٹ گئی۔ پھر اپنے غصّہ پر قابو حاصل کرکے دھمکی آمیز آواز میں اس نے کہا۔ "امیر تمہاری آواز سُن رہا ہے! بولو!"

مور چھل اس کے سر پر ہلتی رہی۔ درباری خاموش اور خوف زدہ تھے۔ وزراء گھبرا گھبرا کے ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے۔

"اس نے ریاست میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔" امیر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تین بار اس نے ہمارے دارالحکومت کے امن و امان میں رخنہ ڈالا ہے۔ اس نے ہمارا خواب و آرام لوٹ لیا اور ہمارے خزانے کو جائز آمدنی سے محروم کر دیا۔ وہ اعلانیہ عوام کو سرکشی اور بغاوت کے لیے اکساتا ہے۔ اس پاجی سے کس طرح نپٹیں، ہم تم سے پوچھتے ہیں۔"

وزراء، عمائدین اور حکما سبھی نے یک آواز ہو کر جواب دیا:

"اے مرکزِ کائنات، محافظِ امن، وہ بلاشبہ سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے!"

"تو پھر وہ ابھی تک کیوں زندہ ہے؟" امیر نے دریافت کیا۔ "یا یہ کام پھر ہمارے لیے، تمہارے حکمران کے لیے ہے جس کا نام تمہیں خوف اور ادب سے اور وہ بھی بلا سر بسجود ہوئے نہیں لینا چاہیے جو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ تم کاہلی، گستاخی اور لاپرواہی کی وجہ سے نہیں کرتے ہو۔ ہاں تو دہراتا ہوں کہ کیا یہ ہمارے لیے ہے کہ ہم بذاتِ خود اس کو گرفتار کرنے بازار جائیں جب کہ تم اپنے اپنے حرموں میں خوب عیاشی کرو گلچھڑے اُڑاؤ اور صرف تنخواہ وصول کرنے کے دن اپنے فرائض کو یاد کرو؟ تیرا کیا جواب ہے، اے بختیار؟"

بختیار کا نام سن کر دوسروں نے چین کا نام لیا اور ارسلان بیک کے ہونٹوں پر کینہ پرور مُسکراہٹ کھیلنے لگی جس سے بختیار کا بہت زمانے سے جھگڑا چلا

آرہا تھا۔ بختیار نے اپنی توند پر ہاتھ باندھے اور امیر کے سامنے زمین تک جھک گیا۔

"خدا ہمارے امیر کو آزمائشوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے!" بختیار نے شروع کیا۔ "اس غلام کی وفاداری اور خدمات کو، جو امیر کی نورانی کرنوں کا ایک حقیر ذرّہ ہے، امیر اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے شاہی خزانہ بالکل خالی تھا لیکن میں نے کئی ٹیکس لگائے۔ میں نے ملازمت پانے پر بھی ٹیکس لگا دیا اور اب کسی کی یہ مجال نہیں کہ وہ خزانے کو بلا کچھ ادا کیے چھینک بھی دے۔"

"مزید برآں میں نے نچلے درجے کے سرکاری ملازمین اور پہرے داروں کی تنخواہیں آدھی کر دیں، بخارا کے باشندوں کو پہرے داروں کی دیکھ بھال کا ذمّے دار بنایا اور اس طرح میرے آقا، میں نے خزانے میں کافی بڑی رقم جمع کی۔ لیکن ابھی میں نے اپنی تمام خدمات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میری کوششوں ہی سے حضرت بہاؤالدین کے مقبرے پر پھر

معجزے ہونے لگے اور ہزاروں زائرین مقبرے کو آنے لگے۔ اس طرح ہمارے بادشاہ کا خزانہ، جن کے سامنے دنیا کے دوسرے حکمران ایک ذرّے کے برابر ہیں۔ ہر سال عطیوں سے بھرنے لگا ہے اور آمدنی کئی گنی بڑھ گئی ہے۔۔۔"

"یہ آمدنی کہاں ہے؟" امیر نے بیچ میں لقمہ دیا۔ "اس کو تو خواجہ نصر الدّین نے ہم سے لے لیا۔ ہم تمہاری خدمات کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہیں۔ یہ تو ہم متعدّد بار سن چکے ہیں۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ خواجہ نصر الدّین کس طرح ہاتھ آئے؟"

"آقا۔" بختیار نے جواب دیا۔ "وزیرِ اعظم کے فرائض میں مجرموں کی تلاش نہیں شامل ہے۔ ہماری ریاست میں یہ کام شاہی گارد اور فوج کے سپہ سالار کا، معزّز ارسلان بیک کا ہے۔"

"بولو!" امیر نے حکم دیا۔

ارسلان بیک بختیار کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا اُٹھا۔ لمبی سانس لی اور اس کی سیاہ داڑھی اوپر اٹھی اور پھر اس کی توند پر گر گئی۔

”خدا ہمارے مہرِ تاباں، بادشاہ کو ہر آفت و مصیبت، بیماری اور رنج سے محفوظ رکھے! امیر میری خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ جب خیوا کے خان نے بخارا پر چڑھائی کی تو مرکزِ کائنات، ظلِّ سبحانی نے عنایت فرما کر مجھے بخارا کی فوج کی کمان سپرد کی اور میں نے بلا خون خرابے کے دُشمن کو پیچھے دھکیل دیا اور لڑائی کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔“

”میں نے یہ حکم دے دیا کہ خیوا کی سرحد سے لے کر ہمارے علاقے کے اندر، کئی دنوں کے کوچ کے فاصلے تک تمام شہر اور گاؤں تباہ کر دیے جائیں، تمام فصلیں، باغات، سڑکیں اور پُل برباد کر دیے جائیں۔ جب خیوا کے لوگ ہمارے علاقے میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک ریگستان دیکھا جہاں نہ تو باغات تھے اور نہ کوئی جاندار، تو انہوں نے اپنے آپ سے کہا ہم بخارا نہ جائیں گے کیونکہ وہاں نہ تو کچھ کھانے پینے کو ہو گا

اور نہ لوٹ مار کے لیے۔ وہ واپس لوٹ گئے، دھوکہ کھا کر اور ذلیل ہو کر۔ ہمارے بادشاہ، امیر نے مہربانی کر کے اپنی فوج کے ہاتھوں خود اپنے ملک کی تباہی کو اتنا دانش مندانہ اور کارآمد حربہ تسلیم کیا کہ انہوں نے حکم نافذ کر دیا کہ کسی بھی چیز کو بحال نہ کیا جائے اور تمام شہر، گاؤں، کھیت اور سڑکیں تباہ شدہ حالت میں رکھی جائیں تاکہ آئندہ دشمن قبائل ہمارے علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کریں۔ اس طرح میں نے خیوا کے لوگوں کو شکست دی۔ اس کے علاوہ بخارا میں ہزاروں جاسوسوں کو میں نے تربیت دی۔۔۔"

"بند کر اپنی زبان شیخی خور!" امیر نے چلّا کر کہا۔ "تو تیرے جاسوس خواجہ نصرالدّین کو کیوں نہیں پکڑ سکے؟"

ارسلان بیک بدحواس ہو کر کافی دیر تک خاموش رہا۔ آخر کار اسے ماننا ہی پڑا:

"آقا، میں نے ہر تدبیر کر ڈالی لیکن میرا دماغ اس بدمعاش اور مرتد کے خلاف کام نہیں کرتا۔ میرے خیال میں حکما و عقلا سے اس کے بارے میں رائے لینی چاہیے۔"

"قسم ہے اپنے آبا و اجداد کی! تم سب اس قابل ہو کہ شہر کی فصیل پر تمہیں سولی دے دی جائے!" امیر برس پڑا، اپنے غصّے میں اس نے حُقّے بردار کو ایک زور کا ہاتھ رسید کیا جو اس غلط موقع پر شاہ کے دستِ دراز کے قریب آ گیا تھا۔

"بولو۔" اس نے سب سے معمّر دانا کو حکم دیا جو درازیٔ ریش کے لیے مشہور تھا۔ اس کی داڑھی اتنی لمبی تھی کہ اس کو اپنی کمر کے گرد دہری لپیٹ سکتا تھا۔

دانا اٹھا، ایک دُعا پڑھی اور اپنی مشہور داڑھی کو تھپتھپایا اور داہنے ہاتھ سے اس کو کھینچ کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اس میں شانہ کرنے لگا۔

"خدا بادشاہ کو رعایا کی خوش حالی اور مسرّت کے لیے شاندار اور طویل زندگی عطا فرمائے۔" اس نے کہا۔ "چونکہ مذکورہ بالا بدمعاش اور باغی خواجہ نصر الدّین بھی تو آدمی ہی ہے، اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا جسم بھی دوسرے آدمیوں جیسا ہے یعنی اس میں دو سو چالیس ہڈیاں اور تین سو ساٹھ رگیں ہیں جو پھیپھڑے، جگر، دل، تلی اور پِتّے کو چلاتی ہیں۔ داناؤں نے ہمیں سکھایا ہے کہ شہ رگ دل کی رگ ہوتی ہے جو تمام دوسری رگوں کو چلاتی ہے اور یہ ایک ناقابلِ تردید اور مقدّس حقیقت ہے جو بے ایمان ابو اسحاق کی کافرانہ تعلیم کے خلاف ہے جو یہ جھوٹا دعویٰ کرنے کی ہمّت کرتا ہے کہ انسان کی زندگی کی بنیاد پھیپھڑے کی رگ ہے۔"

"دانائے روزگار بُو علی سینا، یونانی حکیم ہپپوکریٹس اور کارڈویا کے اویروئس نے بھی لکھا ہے جس کے محنت کے پھل اب ہم اٹھا رہے ہیں اور الکندی، الفارابی اور ابو بصرہ ابن طفیل کی تعلیمات کے مطابق بھی

میں کہتا ہوں اور تصدیق کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اللہ نے آدم کو چہار عناصر۔۔۔ آب، خاک، آتش اور باد۔۔۔ کے خمیر سے اس طرح بنایا کہ زرد پتّے میں آگ کی خصوصیت ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ گرم اور خشک ہے۔ سیاہ پتّے میں خاک کی خصوصیت ہے کیونکہ وہ ٹھنڈا اور خشک ہوتا ہے۔ لعابِ دھن پانی کی خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ وہ سرد اور تر ہوتا ہے اور آخر میں خون باد کی نوعیت رکھتا ہے کیونکہ وہ گرم اور تر ہوتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے جسم کی ان رقیق اشیاء سے محروم کر دیا جائے تو وہ لازمی طور پر مر جاتا ہے اور اس سے میں نتیجہ اخذ کرتا ہوں، اے ممتاز آقا، کہ یہ مرتد، دشمنِ امن و امان، خواجہ نصر الدّین خون سے محروم کر دیا جائے جس کا بہتر طریقہ یہ ہو گا کہ اس کا سر دھڑ سے جدا کر دیا جائے کیونکہ جو خون بہتا ہے اس کے ساتھ آدمی کے جسم سے زندگی بھی بخارات میں تبدیل ہو کر اُڑ جاتی ہے اور کبھی واپس نہیں آتی۔ یہ ہے میرا مشورہ اے شاہِ زماں، جہاں پناہ!“

امیر نے اس کی باتیں توجہ سے سُنیں اور کچھ کہے بغیر دوسرے دانا کی طرف ابرو سے بہت ہی ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس دانا کی داڑھی کا مقابلہ تو پہلے دانا سے نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کا عمامہ اس سے کہیں بڑا اور شاندار تھا۔ سالہا سال نے عمامہ کے بوجھ نے اس کی گردن کو ایک طرف اور نیچے جھکا دیا جس سے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی آدمی تنگ دراڑ سے اوپر جھانک رہا ہو۔ امیر کے سامنے جھکتے ہوئے یہ دانا بولا:

"اے شہنشاہِ اکبر، آفتابِ نیم روز! میں خواجہ نصر الدّین کے اس طرح خاتمے سے متّفق نہیں ہوں کیونکہ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ انسان کی زندگی کے لیے صرف خون ہی نہیں بلکہ ہوا بھی ضروری ہے اور اگر کسی آدمی کی گردن سے رسّی دبا دی جائے اور اس طرح ہوا اس کے پھیپھڑوں تک پہنچنے سے روکی جا سکے تو وہ آدمی لازمی طور پر مر جاتا ہے اور کبھی پھر بحال نہیں ہو سکتا۔۔۔"

"اچھا۔" امیر نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اے داناؤں کے دانا، اور آپ کے مشورے ہمارے لیے بلاشبہ قیمتی ہیں۔ واقعی، اگر آپ ایسے مشورے نہ دیتے تو ہم خواجہ نصر الدّین سے کیسے پیچھا چھڑا سکتے؟"

وہ رُک گیا کیونکہ وہ غصّے سے بُری طرح بھرا ہوا تھا اور اس پر قابو رکھنا اس کے لیے مُشکل ہو رہا تھا۔ اس کے گال تھر تھرا رہے تھے، نتھنے جل رہے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن درباری خوشامدی۔۔۔ فلسفی اور شاعر جو امیر کی پشت پر نیم حلقہ بنائے کھڑے تھے اپنے مالک کا غضبناک چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے انہوں نے اس کے غضب آلود طعن کو نہیں سمجھا جس سے اس نے داناؤں کو خطاب کیا تھا۔ اس کی بات کے ظاہری مطلب کو لے کر انہوں نے سوچا کہ داناؤں نے واقعی امیر کی نگاہوں میں عزّت حاصل کر لی ہے اس لیے وہ امیر کی داد و دہش

سے محفوظ ہوں گے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے داناؤں کی عنایات فوراحاصل کرنا چاہئیں۔

"آپ دانائے روزگار ہیں ! آپ ہمارے شہنشاہِ عالی مرتبت کے تاج کے گُہرہائے بے بہاہیں، آپ کا عقل و دانش میں کوئی جواب نہیں، آپ مجسّم عقل و دانش ہیں جن کو خدا نے سب سے زیادہ عقل عطا فرمائی ہے!"

اس طرح انہوں نے قصیدہ خوانی شروع کر دی اور حسن بیان و جوش و خروش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہیں اس کا پتہ نہیں چلا کہ امیر غصّے میں بل کھایا ہوا ان کو دیکھ رہا ہے اور ڈراؤنی خاموشی چھا گئی ہے۔

"اے علم کے آفتاب و ماہتاب اور صاحبانِ عقل و دانش!" انہوں نے اپنی قصیدہ خوانی جاری رکھی اور غلامانہ جذبے کے جوش میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک ملک الشعراء کی نظر امیر پر پڑی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی چکنی چپڑی زبان تالو سے چپک گئی ہے۔ اس کے بعد اور سب بھی چپ ہو گئے اور یہ سمجھ کر کانپنے لگے کہ انہوں نے اپنے جوش میں کتنی زبردست غلطی کی ہے۔

"ناکارہ بد معاشو!" غصّے سے بپھرے ہوئے امیر نے کہا۔ "کیا تمہارے خیال میں ہم یہ نہیں جانتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کا سر قلم کر دیا جائے یا اس کو پھانسی دے دی جائے تو وہ پھر زندہ نہیں ہو سکتا؟ لیکن اس کے لیے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی کو گرفتار کیا جائے اور تم نے، بدمعاش، ناکارہ، پاجی اور احمقوں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ تمام وزراء، عمائدین، دانا اور شعراء اس وقت تک تنخواہ نہیں پائیں گے جب تک خواجہ نصر الدّین گرفتار نہ کیا جائے گا۔ اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ جو بھی اس کو گرفتار کرے گا اس کو تین ہزار تانگے انعام دیا جائے گا! ہم تم کو اس بات سے بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری کاہلی،

بے وقوفی اور لاپروائی کو دیکھ کر ہم نے ایک نئے دانا کو اپنی خدمت میں بغداد سے طلب کیا ہے جن کا نام مولانا حسین ہے اور جو ابھی تک امیر المومنین خلیفہ بغداد کی ملازمت میں تھے۔ وہ راستے میں ہیں اور جلد ہی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ لعنت ہو تم پر نرم گدّوں پر اینڈنے والے پیٹ کے غلامو اور حرص کے بندو! نکال دو ان کو یہاں سے!" اس نے غصّے کے بڑھتے ہوئے طوفان میں پہرے داروں کو حکم دیا۔ "ان سب کو یہاں سے نکال دو، نکال دو!"

گُم صُم درباریوں پر پہرے دار جھپٹے اور بلا پاس ولحاظ ان کو دروازے تک کھینچتے ہوئے لے گئے اور پھر سیڑھیوں کے نیچے دھکیل دیا۔ سیڑھیوں سے نیچے دوسرے پہرے داروں نے ان کی گردن ناپی اور راستے میں ان کی لات گھونسوں اور تھپڑوں سے خاطر تواضع کی۔ درباری ایک دوسرے سے آگے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سفید بالوں والا دانا تو خود اپنی داڑھی میں الجھ کر گرا، دوسرے دانا نے اس سے ٹھوکر

کھائی اور گر پڑا۔ اس کا سر ایک گلاب کی جھاڑی میں چلا گیا۔ یہاں وہ بڑی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ اپنی ٹیڑھی گردن کی وجہ سے وہ اس وقت بھی کسی تنگ دراڑ سے جھانکتا معلوم ہوتا تھا۔

۱۹

امیر سارے دن غصّے میں بھرا بیٹھا رہا۔ دوسرے دن صُبح کو بھی درباریوں نے اس کے چہرے پر غصّے کے آثار دیکھے۔ اس کو بہلانے اور خوش کرنے کی تمام کوششیں بے سُود رہیں۔ رقاصائیں اپنے طنبورے بجا بجا کر عود و عنبر کے مہکتے ہوئے بادلوں کے درمیاں تھرک رہی تھیں، اپنے گداز کولہے مٹکا رہی تھیں اور اپنے مرمریں سینے اس طرح عریاں کر رہی تھیں جیسے اِتّفاقاً یہ بات ہو گئی ہو۔ لیکن یہ سب بے کار تھا۔ امیر نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اس کے چہرے پر غصّے کے گہرے آثار درباریوں کے دِلوں کو دہلاتے رہے۔ درباری مسخروں، کرتب

دکھانے والوں، شعبدہ بازوں اور ان ہندوستانی مداریوں کی سب حرکتیں اور کرتب بھی بے کار رہے جو بین بجا کر سانپوں کو لُبھاتے ہیں۔

درباری آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے تھے:

"لعنت ہو اس خواجہ نصر الدّین پر! ولد الزنا! کیا آفت اس نے ہم پر نازل کر دی ہے!"

وہ ارسلان بیک سے اُمّیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

ارسلان بیک نے داروغہ خانے میں اپنے انتہائی چالاک جاسوسوں کو طلب کیا جن میں وہ چیچک رو بھی تھا جس کو خواجہ نصر الدّین نے انتہائی معجزنما طریقے سے شفا بخشی تھی۔

"تم سب سنو۔" ارسلان بیک نے کہا۔ "اعلیٰ حضرت امیر کے حکم سے تمہاری تنخواہیں اس وقت تک کے لیے روک دی گئی ہیں جب تک کہ خواجہ نصر الدّین گرفتار نہ ہو جائے۔ میں یہ قول دیتا ہوں کہ اگر تم اس کا

پتہ نہ لگا سکے تو نہ صرف تم اپنی تنخواہوں سے ہاتھ دھوؤ گے بلکہ اپنے سروں سے بھی۔ اس کے بر خلاف جو بھی سب سے زیادہ جوش کے ساتھ کام کر کے خواجہ نصر الدّین کو گرفتار کرے گا اسے تین ہزار تانگے کا انعام ملے گا اور ترقّی بھی۔ اس کو تمام جاسوسوں کا افسر مقرّر کیا جائے گا۔"

جاسوس دم کے دم درویشوں، بھک منگوں، سقّوں اور سوداگروں کے بھیس بدل بدل کر روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں چیچک رو جاسوس نے جو دوسروں سے زیادہ چالاک تھا ایک غالیچہ، کچھ مٹر کے دانے، ایک تسبیح اور پرانی کتابیں لیں اور بازار کی طرف چل دیا۔ وہاں وہ جوہریوں اور گندھیوں کے بازاروں کی نکّڑ پر بیٹھ گیا۔ یہاں اس نے رمال کے بھیس میں عورتوں کے ذریعے سُن گُن لینے کا منصوبہ گانٹھا۔

ایک گھنٹے بعد سینکڑوں نقیبوں نے بازار کے چوراہے پر تمام مسلمانوں سے مخاطب ہو کر اپنی بات توجّہ سے سُننے کے لیے کہا۔ انہوں نے امیر کا

فرمان سنایا کہ خواجہ نصر الدّین کو امیر کا دشمن اور مرتد قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا تعلّق ممنوع ہے خصوصاً اس کو پناہ دینا جس کی سزا موت ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اسے پکڑ کر امیر کے پہرے داروں کے حوالے کر دے گا تو اس کو تین ہزار تانگوں کے انعام اور دوسری عنایات سے سرفراز کیا جائے گا۔

چائے خانے کے مالک، ٹھٹھیرے، آہن گر، بنکر، سقے اور ساربان سبھی آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے:

"اس کے لیے امیر کو بہت دن انتظار کرنا ہو گا۔"

"خواجہ نصر الدّین کو ایسے دھر لینا آسان نہیں ہے!"

"کوئی رقم بھی بخارا کے لوگوں کو خواجہ نصر الدّین کے ساتھ دغا کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔"

لیکن سُود خور جعفر جو اپنے قرض داروں پر ظلم و ستم ڈھانے کے لیے بازار میں روزمرہ کی پھیری لگا رہا تھا کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ "تین ہزار تانگے۔" اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔ "کل تو رقم تقریباً میری جیب میں پہنچتے پہنچتے رہ گئی! خواجہ نصر الدّین اس لڑکی کے پاس پھر آئے گا لیکن میں اس کو تن تنہا تو نہیں گرفتار کر سکتا اور اگر میں کسی اور کو یہ خبر بتاتا ہوں تو وہ مجھ سے انعام جھپٹ لے گا۔ نہیں، مجھے کچھ اور کرنا چاہیے۔"

وہ محل کی طرف چل پڑا۔

وہ بڑی دیر تک کھٹکھٹاتا رہا لیکن دروازے بند رہے۔ پہرے داروں نے سُنا نہیں کیونکہ وہ خواجہ نصر الدّین کو پکڑنے کے منصوبوں پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔

"اے بہادر سپاہیو! کیا تم سو رہے ہو؟" سُود خور پریشان ہو کر چیخا۔ اس نے آہنی کنڈا بھی بجایا لیکن قدموں کی چاپ دیر میں سنائی دی اور زنجیروں کے کھلنے کی جھنکار ہوئی۔ پھاٹک کا دروازہ کھلا۔

سُود خور کی بات سننے کے بعد ارسلان بیک نے سر ہلایا:

"معزّز جعفر، میں آپ کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ آپ امیر سے آج ملیں۔ وہ آج بہت غصّے میں ہیں اور اداس بھی۔"

"لیکن میرے پاس اُن کی افسردگی دُور کرنے کا ایک لاجواب علاج ہے۔" سُود خور نے فوراً جواب دیا۔ "معزّز ارسلان بیک، معاونِ تخت و تاج، فاتح دُشمناں! میرے کام میں دیر نہ ہونا چاہیے۔ جا کر امیر سے کہیے کہ میں اُن کا رنج و غم دور کرنے آیا ہوں۔"

امیر اس سے بڑے روکھے پن سے ملا۔ وہ بولا:

"بتا جعفر! لیکن اگر تیری بات نے ہمارا دل خوش نہ کیا تو تجھ کو دو سو درّے لگائے جائیں گے۔"

"اے شہنشاہِ اعظم جس کی شان و شوکت کو نہ تو کوئی بادشاہ ماضی و حال میں پہنچا ہے اور نہ مستقبل میں پہنچے گا!" سُود خور نے کہا۔ "آپ کے اس ناچیز خادم کو یہ پتہ ہے کہ ہمارے شہر میں ایک ایسی دوشیزہ رہتی ہے جس کو میں حقیقت میں لاکھوں حسیناؤں کی ایک کہہ سکتا ہوں۔"

امیر کو فوراً دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے سر اُٹھایا۔

"آقا!" سُود خور کی ہمّت بندھی اور اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میرے پاس اُس کے حُسن کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ سرو قد، دِلرُبا، نازک اندام ہے۔ اس کے جسم کا ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہے۔ اس کی پیشانی روشن، چہرہ شہابی، آنکھیں غزالی اور بھویں ہلالی ہیں! اس کے گال گلابی اور دہانہ مہرِ سلیمانی کی مانند ہے، اس کے ہونٹ مونگے جیسے

اور دانت موتیوں کی لڑی ہیں۔ اس کے پستان مرمریں ہیں جن پر چیری کے دو سرخ پھل رکھے ہیں اور اس کے شانے۔۔۔"

امیر نے اس کے زورِ بیان کو روکا:

"اگر واقعی وہ ایسی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو وہ میرے حرم کے لائق ہے۔ وہ ہے کون؟"

"وہ حسب نصب سے تو غریب ہے، آقا۔ وہ ایک غریب کس گر کی لڑکی ہے جس کے نام سے میں اعلیٰ حضرت کے کانوں کی توہین کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں رہتی ہے لیکن کیا امیر کے اس غلام کو اس کے لیے انعام ملے گا؟"

امیر نے بختیار کی طرف اشارہ کیا اور ایک تھیلی سُود خور کے قدموں پر آن گری۔ جعفر نے اس کو حریصانہ عجلت کے ساتھ اُٹھالیا۔

"اگر وہ تمہاری تعریف کے مطابق ثابت ہوئی تو تم کو اتنا ہی اور انعام ملے گا۔" امیر نے کہا۔

"ہمارے لائق آقا کی فیاضی کا بول بالا رہے!" سُود خور نے ہانک لگائی۔ "لیکن جلدی کرنی چاہیے کیونکہ اس غزالِ رعنا کے پیچھے ایک صیّاد لگا ہوا ہے۔"

امیر کی تیوریوں پر بل آ گئے اور ناک کے بانسے پر ایک موٹی جھری نمودار ہو گئی۔

"کون ہے وہ؟"

"خواجہ نصر الدّین!" سُود خور نے جواب دیا۔

"پھر وہی خواجہ نصر الدّین! اس میں بھی خواجہ نصر الدّین! وہ ہر جگہ ہے۔۔ اور تم ہو کہ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے امیر اپنے وزیروں کی طرف مخاطب ہو گیا اور تخت ہلنے لگا۔ "سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرتے کہ

ہماری شاہانہ شخصیت کے لیے باعثِ شرم بنو۔ اے ارسلان بیک! اس کا انتظام کر، یہ لڑکی کو ہمارے محل میں ہی آنا ہے۔ اگر تو اس میں ناکام رہا تو واپسی پر جلّاد تیرا منتظر ہو گا!"

چند منٹوں میں محل کے پھاٹک سے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ ہو گیا۔ ان کے ہتھیاروں میں جھنکار تھی اور سپریں دھوپ میں چمچمارہی تھیں۔ ان کے آگے ارسلان بیک تھا۔ اس کی زرد قبا میں اعلیٰ عہدے کا بلا ٹنکا ہوا تھا۔ پہرے داروں کے ساتھ سُود خور بھی لنگڑاتا اور لڑکھڑاتا چلا جارہا تھا۔ اکثر وہ پیچھے رہ جاتا اور دوڑ کر ان کے برابر پہنچتا۔ لوگ اس جلوس کو دیکھ کر کنارے ہو جاتے اور سُود خور کو مخاصمانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ آج وہ کس بد معاشی کے لیے نکلا ہے۔

۲۰

خواجہ نصر الدّین نے ابھی اپنی نویں صراحی ختم کی تھی اور تسلے سے ڈھیر سی مٹّی دسیوں صراحی بنانے کے لیے نکالی ہی تھی کہ اچانک دروازے پر زور کی حاکمانہ دستک ہوئی۔ پڑوسی جو اکثر نیاز کے یہاں پیاز یا چٹکی بھر مرچ مانگنے آتے تھے اس طرح نہیں کھٹکھٹاتے تھے۔ خواجہ نصر الدّین اور نیاز نے ایک دوسرے کی طرف گھبرا کر دیکھا جب بھاری ضربوں کی بارش نے دروازہ پھر سے کھڑ کھڑایا۔ اس مرتبہ خواجہ نصر الدّین کے تیز کانوں نے ہتھیاروں کی جھنکار سُن لی۔

"پہرے دار۔" انہوں نے نیاز سے چپکے سے کہا۔

"بھاگو!" نیاز بولا۔

خواجہ نصر الدّین باغ کی دیوار پھلانگ گئے اور نیاز نے دروازہ کھولنے میں اتنا وقت لیا کہ وہ دُور نکل جائیں۔ جیسے ہی بُڈّھے نے کنڈی کھولی، انگور کے باغیچے سے مینائیں بھر بھرا کر اُڑیں لیکن بے چارے کس گر کے پر تو تھے نہیں وہ اُڑ کر کہاں جاتا۔ وہ زرد پڑ گیا اور کانپ کر ارسلان بیک کے سامنے جھک گیا۔

"کس گر، تیرے گھر کو بڑی عزّت نصیب ہوئی ہے۔" ارسلان بیک نے کہا۔ "مرکزِ جہاں، ظلِ سبحانی، ہمارے مالک و آقا، خدا اُن کو برس ہا برس سلامت رکھے، امیرِ اعظم نے بہ نفسِ نفیس عنایت کر کے تیرا حقیر نام لیا ہے۔ ان کو معلوم ہوا ہے کہ تیرے باغ میں ایک حسین پھُول کھلا ہے اور وہ اس پھُول کو اپنے محل کی زیبائش کے لیے چاہتے ہیں۔ تیری بیٹی کہاں ہے؟"

کس گر کا سفید سر ہلنے لگا اور اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ جب پہرے دار اس کی بیٹی کو گھر کے باہر گھسیٹ کر صحن میں لائے تو اس نے اس کی ایک مختصر مدہم چیخ سُنی۔ وہ مُنہ کے بل زمین پر ِگر گیا اور پھر نہ تو اس نے کچھ دیکھا اور نہ سُنا۔

"وہ فرطِ مسرت سے غش کھا گیا ہے۔" ارسلان بیک نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ "اس کو چھوڑو۔ جب وہ ہوش میں آئے گا تو محل میں آکر امیر سے اپنے بے پناہ شکریے کا اظہار کر سکتا ہے۔ چل پڑو!"

اس دوران میں خواجہ نصر الدّین پچھلی گلیوں میں منڈلا رہے تھے۔ وہ دوسرے سِرے سے سڑک پر واپس آئے۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے انہیں نیاز کا پھاٹک دکھائی دے رہا تھا جہاں انہیں دو سپاہی اور تیسرا آدمی دکھائی دیا جو جعفر سُود خور تھا۔

”اچھا۔ لنگڑے کتّے! تو سپاہیوں کو میری گرفتاری کے لیے لایا تھا!“ خواجہ نصر الدّین نے صحیح حالات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اس طرح سوچا۔ ”بہت اچھا، اچھی طرح ڈھونڈ لے! لیکن تو خالی ہاتھ لوٹے گا۔“

لیکن وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ خواجہ نصر الدّین دہشت سے بالکل پتھر ہو گئے جب انھوں نے دیکھا کہ سپاہی ان کی محبوبہ کو پھاٹک سے باہر لیے جا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ پیر مار رہی تھی اور دل شکن آواز میں چیخ رہی تھی لیکن سپاہیوں نے اس کو مضبوط پکڑ کر سپروں کے دہر حلقے سے گھیر رکھا تھا۔

یہ جون کی گرم دوپہر تھی لیکن خواجہ نصر الدّین کے جسم میں ایک سرد کپکپی دوڑ گئی۔ پہرے دار قریب آرہے تھے کیونکہ اُن کا راستہ اس جگہ سے ہو کر گزرتا تھا جہاں خواجہ نصر الدّین چھپے ہوئے تھے۔ وہ پاگل ہو گئے۔ انھوں نے اپنا خنجر نیام سے کھینچ لیا اور زمین سے چمٹ کر لیٹ گئے۔ ارسلان بیک اپنا چمکتا ہوا بلا لگائے دستے کے آگے آگے تھا۔ خنجر اس کی داڑھی کے نیچے چربی دار گردن میں اتر گیا ہوتا اگر اچانک ایک

بھاری ہاتھ خواجہ نصر الدّین کو تھام نہ لیتا اور ان کو زمین پر دبائے نہ رکھتا۔ انہوں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنا ہاتھ چوٹ کرنے کے لیے بُلند کیا لیکن یوسف لوہار کا کالک سے لپا ہوا چہرہ پہچان کر اُن کا ہاتھ نیچے گر گیا۔

"چپکے پڑے رہو۔" لوہار نے آہستہ سے کہا۔ "چپکے پڑے رہو! کیا پاگل ہو گئے ہو۔ وہ بیس سر سے پیر تک مسلح آدمی ہیں اور تم اکیلے ہو اور پھر تمہارے پاس کوئی ٹھکانے کا ہتھیار بھی تو نہیں ہے۔ تم ختم ہو جاؤ گے اور لڑکی مدد بھی نہ کر سکو گے۔ میں تم سے کہتا ہوں چپکے پڑے رہو!"

لوہار نے ان کو اس وقت تک دبائے رکھا جب تک کہ دستہ سڑک کے موڑ پر غائب نہیں ہو گیا۔

"ارے، تم نے مجھے کیوں روک لیا؟" خواجہ نصر الدّین چلائے۔ "اچھا ہی ہوتا اگر میں مر جاتا۔"

"کسی شیر پر ہاتھ اُٹھانا یا تلوار پر مکّا تاننا دانش مندوں کا کام نہیں ہے۔" لوہار نے درشتی سے کہا۔ "میں پہرے داروں کے پیچھے بازار سے لگا تھا اور میں تمہاری غیر دانشمندانہ حرکت روکنے کے لیے بر وقت پہنچ گیا۔ تمہیں اس لڑکی کے لیے مرنا نہیں چاہیے بلکہ کوشش کر کے اس کو بچانا چاہیے۔ یہ مشکل تو ہے لیکن زیادہ اچھا ہو گا غمگین خیالوں میں ڈوب کر وقت نہ گنواؤ، جاؤ اور کچھ کرو۔ ان کے پاس تلواریں، ڈھالیں اور نیزے ہیں لیکن اللہ نے تم کو طاقتور اسلحے عطا کئے ہیں۔ وہ ہیں تیز دماغ اور ہوشیاری جن میں تم اپنا ثانی نہیں رکھتے۔" اس نے کہا۔ اس کے الفاظ مردانہ اور اس لوہے کی طرح مضبوط تھے جس کو وہ اپنی تمام زندگی ڈھالتا رہا تھا۔ ان کو سُن کر خواجہ نصر الدّین کا ڈانواں ڈول دل بھی لوہے کی طرح سخت ہو گیا۔

"لوہار، تمہارا شکریہ، زندگی میں اس سے زیادہ تلخ لمحے مجھے کبھی پیش نہیں آئے لیکن نااُمّید ہو کر ہار نہ ماننا چاہیے۔ تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے ہتھیاروں کا کارآمد استعمال کروں گا۔"

وہ جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ اس وقت سُود خور بھی ایک قریب کے گھر سے نکلا۔ وہ کسی کمہار سے قرض کے تقاضے کے لیے رُک گیا تھا جو واجب الادا ہو چکا تھا۔ خواجہ نصر الدّین اور اس کا دوبدو سامنا ہو گیا۔ سُود خور سفید پڑ گیا اور اُلٹے پیروں بھاگ کر دروازہ بند کر لیا اور کنڈی چڑھالی۔

"جعفر، او کینہ پرور، یاد رکھ، تیرے لیے مصیبت ہے!" خواجہ نصر الدّین نے چلّا کر کہا۔ "میں نے سب کچھ دیکھا اور سُنا ہے اور میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

ذرا خاموش رہ کر سُود خور اندر سے بولا۔ "گیدڑ کو بیری نہیں ملی اور نہ عقاب کو۔ بیری شیر نے ہڑپ کر لی۔"

"یہ تو دیکھنا ہے." خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "جعفر میرے الفاظ یاد رکھ! میں نے تجھ کو پانی سے کھینچ کر نکالا تھا۔ لیکن قسم کھاتا ہوں کہ میں تجھ کو اسی تالاب میں ڈبوؤں گا۔ کائی تیرے جسم سے لپٹ جائے گی اور گھاس پھوس تیرا گلا گھونٹ دیں گے۔"

جواب کا انتظار کیے بغیر خواجہ نصر الدّین وہاں سے چل دیے۔ وہ نیاز کے گھر کے پاس سے بِلاژُکے گزر گئے۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں سُود خور دیکھ نہ لے اور بعد کو بوڑھے کو موردِ الزام کرے۔ سڑک کے سِرے پر اس کا بالکل یقین کرنے کے بعد کہ ان کا پیچھا نہیں کیا جا رہا ہے وہ تیزی سے ایک ویران جگہ کی طرف دوڑے جہاں گھاس پھوس اُگی تھی اور دیوار کے اُوپر سے پھاند کر کمہار کے گھر پہنچ گئے۔

بڈھا اب بھی مُنہ کے بل زمین پر پڑا تھا۔ اس کے قریب چند چاندی کے سِکّے جو ارسلان بیک ڈال گیا تھا ملکے سے چمک رہے تھے۔ بڈّھے نے اپنا آنسوؤں اور مٹّی سے لتھڑا چہرہ اُوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت

ہوئی لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ پھر اس کی نذر ایک رومال پر پڑی جو اس کی بیٹی وہاں ڈال گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس نے اپنا سفید سر زمین سے ٹکرا دیا اور اپنی داڑھی نوچنے لگا۔

خواجہ نصر الدّین کو اسے دلاسا دینے میں کافی وقت لگا۔ آخر کار اس کو اٹھا کر ایک بنچ تک لے گئے اور بٹھا دیا۔

"سُنو، بڑے میاں! تمہیں کو تنہا رنج نہیں پہنچا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "شاید تم جانتے ہو کہ میں اس سے محبّت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے؟ تم جانتے ہو کہ ہم میں شادی کا عہد ہو چکا تھا؟ میں صرف اس بات کا منتظر تھا کہ تمہیں دینے کے لیے جہیز کی کافی رقم جمع کر لوں۔"

"مجھے جہیز کی کیا پرواہ؟" بُڈّھے نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اپنی پیاری بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف ناراض کرتا؟ بہر حال افسوس، ان باتوں کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ اب تو وہ حرم میں پہنچ چکی ہو گی۔۔۔ ہائے توبہ کیسی بے عزّتی ہوئی!" وہ رونے پیٹنے

لگا۔ "مجھے محل جانا چاہیے۔۔۔ میں امیر کے قدموں میں گر کر التجا کروں گا، روؤں گا اور گڑگڑاؤں گا اور اگر ان کے سینے میں پتھر کا دل نہیں ہے تو۔۔۔"

وہ کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔

"ٹھہرو!" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "تم بھولتے ہو کہ امیروں کا خمیر دوسرے انسانوں جیسا نہیں ہوتا ہے۔ ان کے دل ہی نہیں ہوتا۔ ان سے التجا کرنا بے کار ہوتا ہے۔ بس یہی ممکن ہے کہ ان سے وہ چیز چھین لی جائے اور میں، خواجہ نصر الدّین گُل جان کو امیر سے چھین لوں گا!"

"وہ بہت طاقتور ہیں۔ ان کے پاس ہزاروں سپاہی، ہزاروں پہرے دار اور ہزاروں جاسوس ہیں! تم ان کے خلاف کیا کر سکتے ہو؟"

"ابھی تو نہیں جانتا کہ میں کیا کروں گا۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ گُل جان کے پاس نہ تو آج اور نہ کل جائے گا! اور پرسوں بھی نہیں! اور نہ وہ

کبھی اس کو رکھ سکے گا یا اس کا مالک بن سکے گا۔ یہ بات اسی طرح سچ ہے جیسے بخارا سے بغداد تک پھیلا ہوا میرا نام خواجہ نصر الدّین! اس لیے اپنے آنسو پونچھ ڈالو، بڑے میاں۔ رو پیٹ کر میرے کان نہ کھاؤ۔ میرے خیالوں کو منتشر نہ کرو۔"

خواجہ نصر الدّین تھوڑی دیر تک سوچتے رہے:

"بڑے میاں، یہ بتاؤ کہ تمہاری مرحومہ بیوی کے کپڑے کہاں رکھے ہیں؟"

"وہاں صندوق میں۔"

خواجہ نصر الدّین کنجی لے کر گھر کے اندر غائب ہو گئے اور چند منٹ بعد عورت کے بھیس میں نکلے۔ ان کا چہرہ گھوڑے کے بالوں کی نقاب میں اچھی طرح چھپا ہوا تھا۔

"بڑے میاں، میرا انتظار کرو اور خود سے کچھ نہ کرنا۔"

انہوں نے اپنا گدھا باڑے سے نکالا، اس پر کاٹھی کسی اور نیاز کے گھر سے روانہ ہو گئے۔

۲۱

گل جان کو باغ میں لے جا کر امیر کے سامنے پیش کرنے سے پہلے ارسلان بیک نے حرم کی مشاطاؤں کو بُلایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ گُل جان کو خوب اچھی طرح آراستہ و پیراستہ کریں تا کہ اس کے حسنِ کامل کو دیکھ کر امیر باغ باغ ہو جائے۔ مشاطائیں جو اس کام میں طاق تھیں فوراً حکم بجا لائیں۔ انہوں نے گُل جان کا اشک آلود چہرہ گرم پانی سے دھویا، نفیس ریشمی کپڑے پہنائے، آنکھوں میں سرمے کا دنبالہ دیا، گالوں پر غازہ ملا، بالوں کو گلاب کے تیل سے معطّر کیا اور ناخون سُرخ رنگے۔ پھر انہوں نے حرم سے خواجہ سراؤں کے عصمت مآب داروغہ کو بلایا۔ کسی زمانے

میں یہ آدمی اپنی عیّاشی کے لیے بخارا بھر میں مشہور تھا۔ ان معاملات میں اپنی معلومات اور تجربے ہی کی وجہ سے وہ اس اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا جس کے لیے دربار کے جرّاح نے اس کو خاص طور سے تیّار کیا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ امیر کی ایک سو ساٹھ داشتاؤں پر برابر نگاہ رکھے کہ وہ امیر کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے کافی دلکش ہوں۔

سال بہ سال اس کا فرض اور بھی بھاری ہوتا جارہا تھا کیونکہ امیر دن بدن سرد پڑتا جارہا تھا اور اس کی قوّت کم ہوتی جاتی تھی۔ متعدّد بار یہ ہوچکا تھا کہ خواجہ سراؤں کے داروغہ کو صُبح صُبح درجن بھر کوڑوں کا انعام ملا تھا۔ یہ تو اس کے لیے معمولی سزا تھی۔ اس کہیں زیادہ بڑی سزا تو یہ تھی کہ جب وہ ماہ رو داشتاؤں کو امیر کے پاس جانے کے لیے تیّار کرتا تو شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا، بالکل اسی طرح کے کرب میں جس کا سامنا جہنّم میں رند مشربوں کو کرنا پڑے گا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ رند مشربوں کو

جہنّم میں ستونوں سے زنجیروں میں کس دیا جائے گا اور ان کو لباس سے بے نیاز حوروں کے جھرمٹ میں کھڑا رہنا پڑے گا۔

خواجہ سراؤں کا داروغہ گُل جان کا حُسن دیکھ کر متحیر رہ گیا۔

"واقعی حسین ہے!" اس نے اپنی باریک اور متحیر آواز میں کہا۔ "اس کو امیر کے پاس لے جاؤ! میری نگاہ سے ہٹاؤ!"

اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے اپنا سر دیواروں سے ٹکرایا، دانت پیسے اور رونے پیٹنے لگا۔ "ہائے قسمت، اب تو برداشت نہیں ہوتا!"

"یہ اچھی علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا آقا نہال ہو جائے گا۔"

بے چاری خاموش گُل جان کو محل کے باغ پہنچایا گیا۔

امیر اٹھا، اس کے قریب آیا اور اس کی نقاب اُلٹ دی۔

تمام وزراء، عمائدین اور حکما نے اپنی آنکھیں قباؤں کی آستینوں سے ڈھک لیں۔

بڑی دیر تک امیر اس حسین چہرے سے اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکا۔

"سُود خور نے ہم سے جھوٹ نہیں کہا تھا۔" اس نے زور سے کہا۔ "جس رقم کا ہم نے وعدہ کیا تھا اس سے تگنی رقم اس کو دی جائے۔"

گُل جان کو وہاں سے لے جایا گیا۔ امیر کافی خوش نظر آ رہا تھا۔

"اس کو مشغلہ مل گیا۔ وہ اب خوش ہے۔ اس کے دل کا بُلبل لڑکی کے گالوں کے گلاب پر فریفتہ ہو گیا ہے۔" درباری آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ "صُبح کو وہ اور بھی خوش مزاج ہو جائے گا۔ خدا کی مہربانی سے طوفان بخیر و خوبی گزر گیا۔ ہم میں سے کسی پر بجلی نہ گری۔"

درباری شاعروں کی بھی ہمّت بندھی، وہ آگے بڑھے اور باری باری امیر کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔ اس کے چہرے کا ماہِ کامل سے، قد کا

نازک سرو سے اور اس کی حکومت کا دونوں جہان کے قران السعدین سے مُقابلہ کرنے لگے۔

آخر میں، ملک الشعراء اس طرح اپنا قصیدہ پڑھنے آیا جیسے اچانک جوش میں آکر اس نے اس کو کہہ ڈالا ہو حالانکہ اگلے دن کی صُبح سے یہ قصیدہ اس کو نوکِ زبان تھا۔

امیر نے اس کو مُٹھّی بھر چھوٹے سِکّے پھینک دیے اور وہ فرش پر رینگ رینگ کر اُن کو جمع کرنے لگا، ساتھ ہی وہ امیر کی جوتیوں کو بوسہ دینا نہیں بھولا۔

پھر امیر نے مربّیانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہم نے بھی ایک نظم کہی ہے:

شام کو ہوا جو باغ میں گزر ہمارا

چاند چھپ گیا بادلوں میں شرم کا مارا

پرندے ہوئے خاموش، ہوا بھی چال اپنی بھولی

اور ہم تھے وہاں استادہ۔۔۔ عظیم،

عالی مرتبت، اٹل، مانندِ آفتاب، عظیم الشان!"

سب شاعر گھٹنوں کے بل گر کر داد و تحسین دینے لگے:

"کیا عظمت ہے! رودکی کو بھی مات کر دیا!"

کچھ تو فرش کے بل زمین پرِ گر گئے جیسے تعریف کے جوش میں ان پر غشی طاری ہو گئی ہو۔

رقاصائیں آ گئیں، ان کے پیچھے بھانڈ، مداری اور شعبدہ گر آئے اور امیر نے ان سب کو بڑی فیاضی سے انعامات دیے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں سورج پر حکم نہیں چلا سکتا۔" اس نے کہا۔ "نہیں تو میں اس کو جلد غروب ہونے کا حکم دیتا۔۔۔"

اور درباری اس پر خوشامدانہ قہقہے لگا رہے تھے۔

۲۲

بازار میں بڑی چہل پہل تھی۔ یہ زوروں کے کاروبار کا وقت تھا، خرید و فروخت اور لین دین میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سورج بلند ہوتا جا رہا تھا اور لوگ ڈھکی ہوئی اور طرح طرح کی مہک سے بھری دُکانوں کے گھنے سائے میں پناہ لینے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ دوپہر کی تیز دھوپ کی کرنیں نرکل کی چھتوں کے روشن دانوں سے عمودی گر رہی تھیں اور دھویں کے ستونوں کی طرح استادہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی روشنی میں زربفت کے کپڑے جگمگا رہے تھے، نرم ریشم چمک رہا تھا اور مخمل ایک ہلکے دبے دبے شعلے کی طرح دھکتا معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف

عمامے، قبائیں اور رنگی ہوئی داڑھیاں روشنی میں چمک رہی تھیں۔ صاف شفاف تانبا آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہا تھا لیکن صرافوں کے نمدوں پر پھیلا ہوا کھرا سونا اس کو مُنہ چڑھا کر اپنی خالص چمک سے نیچا دکھا رہا تھا۔

خواجہ نصرالدّین نے اپنے گدھے کی لگام اس چاء خانے کے سامنے کھینچی جس کے برآمدے ایک مہینہ پہلے انہوں نے بخارا کے شہریوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ کمہار نیاز کی مدد کریں اور اس کو امیر کی مہربانی سے بچائیں۔ اس تھوڑی سی مدّت میں زندہ دل اور توندیل چائے خانے کے مالک علی سے جو سیدھا سادا ایماندار اور معتبر آدمی تھا خواجہ نصرالدّین کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔

موقع دیکھ کر خواجہ نصرالدّین نے اسے پکارا:

"علی!"

چائے خانے کے مالک نے چاروں طرف دیکھا اور بھونچکا سا ہو گیا کیونکہ اس نے مردانی آواز سُنی تھی اور دیکھ رہا تھا عورت۔

"یہ میں ہوں، علی۔" خواجہ نصرالدّین نے نقاب اٹھائے بغیر کہا۔ "مجھے پہچانتے ہو نا؟ خدا کے لیے اس طرح تو مت گھورو۔ کیا تم جاسوسوں کو بھول گئے ہو؟"

احتیاط سے چاروں طرف دیکھ کر علی ان کو پچھلی کوٹھری میں لے گیا جہاں وہ ایندھن اور فاضل کیتلیاں رکھتا تھا۔ یہاں نمی اور ٹھنڈک تھی اور بازار کا شور بہت مدہم سنائی دے رہا تھا۔

"علی، میرا گدھا لو۔" خواجہ نصرالدّین نے کہا۔ "اس کو اچھی طرح کھلانا پلانا کیونکہ مجھے اس کی کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور میرے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا۔"

"لیکن خواجہ نصر الدّین تم نے عورتوں کے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟" علی نے احتیاط سے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں محل جا رہا ہوں۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے!" چائے خانے کے مالک نے زور سے کہا۔ "تم اپنا سر شیر کے مُنہ میں دینے جا رہے ہو۔"

"یہ کرنا ہی پڑے گا، علی۔ تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کیوں۔ آؤ ایک دوسرے سے رُخصت ہو لیں کیونکہ اگر۔۔۔ میں خطرناک مہم پر جا رہا ہوں۔"

وہ ایک دوسرے سے بڑے خلوص سے گلے ملے۔ چائے خانے کے نیک دل مالک کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس کے گول، سُرخ رخساروں پر بہہ چلے۔ اس نے خواجہ نصر الدّین کو رُخصت کیا اور پھر اپنی

گہری آہوں کو روک کر جو اس کے توند کو دھونک رہی تھیں اپنے گاہکوں میں لگ گیا۔

اس کا دل بھاری تھا اور اس میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ وہ غمگین اور کھویا کھویا سا تھا۔ اس کے گاہکوں کو چاء دانیوں کے ڈھکن دو تین بار یہ یاد دلانے کے لیے بجانا پڑ رہے تھے کہ ان کو مزید چائے کی ضرورت ہے۔ اپنے خیالوں میں وہ دبنگ دوست کے ساتھ محل میں تھا۔

پہرے داروں نے خواجہ نصر الدّین کو روک دیا۔

"میں لاجواب مُشک، عنبر اور عطرِ گلاب لائی ہوں۔" خواجہ نصر الدّین بڑی چالاکی کے ساتھ زنانی آواز بنا کر برابر کہہ رہے تھے۔ "اے سورماؤ، مجھے حرم میں جانے دو۔ میں اپنا سامان بیچ کر تمہیں اس میں حصّہ دوں گی۔"

"بڑھیا، چلتی بن، جا، جا، بازار میں سودا کر!" پہرے داروں نے ڈانٹا۔

اپنے مقصد میں ناکام ہو کر خواجہ نصر الدّین افسردہ ہو گئے اور سوچنے لگے۔ ان کے پاس کم وقت تھا کیونکہ آفتاب مائل بہ زوال ہو چلا تھا۔ انہوں نے فصیل کا چکّر لگایا لیکن چینی مسالے نے پتھروں کو اس طرح آپس میں پیوست کر دیا تھا کہ ان کو ایک دراڑ، ایک سوراخ نہیں ملا۔ جہاں تک نہروں کے دہانوں کا سوال تھا ان میں ڈھلے ہوئے مضبوط لوہے کے سلاخ لگے تھے۔

"مجھے تو محل پہنچنا ہی ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں اور پہنچوں گا۔ اگر نوشتۂ تقدیر کے مطابق امیر نے میری منگیتر پر قبضہ کر لیا ہے تو تقدیر کے مطابق مجھے وہ واپس کیوں نہ ملنا چاہیے؟ میرا دل کہتا ہے کہ یہی ہو گا۔"

وہ بازار واپس آ گئے۔ ان کو یقین تھا کہ اگر کوئی آدمی اٹل ہمّت کے ساتھ کوئی ارادہ کر لے تو قسمت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہزاروں ملاقاتوں، بات چیت اور جھگڑوں میں کوئی ایسی بات ضرور نکل آئے گی جو مناسب

موقع فراہم کر دے گی اور آدمی اس کو ہوشیاری سے استعمال کر کے ان تمام رکاوٹوں کو دور کر سکتا ہے جو اس کی منزل اور اس کے درمیان حائل ہیں اور اس طرح اپنی قسمت کا لکھا پورا کر سکتا ہے۔ بازار میں ایسا ہی موقع کہیں ان کا منتظر تھا۔ ان کو اس کا قطعی یقین تھا اور وہ اس کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

خواجہ نصر الدّین سے کوئی چیز بچتی نہ تھی۔ ہزاروں آدمیوں کے شور و غل میں ایک لفظ، ایک چہرہ بھی نہیں۔ ان کا دماغ، کان اور نظریں اس غیر معمولی معیار کو پہنچ چکی تھیں جب انسان ان حدود کو آسانی سے پار کر جاتا ہے جو قدرت نے اس پر عائد کی ہیں۔ اس صورت میں جیت ان ہی کی ہوتی تھی کیونکہ اس دوران میں ان کے مخالفین تو عام انسانی حدود ہی میں رہتے تھے۔

اس جگہ جوہریوں اور گندھیوں کے بازار ایک دوسرے سے ملتے تھے خواجہ نصر الدّین نے مجمع کے شور و ہنگامے کے درمیان ایک پھسلانے والی آواز سُنی:

"تم کہتی ہو کہ تمہارا شوہر تم سے محبّت نہیں کرتا اور ہم بستر نہیں ہوتا۔ اس کا ایک علاج ہے لیکن مجھے اس کے بارے میں خواجہ نصر الدّین سے مشورہ کی ضرورت ہے۔ تم نے تو سُنا ہی ہو گا کہ وہ یہاں ہیں؟ معلوم کر کے مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں۔ ہم دونوں تمہیں تمہارے شوہر سے ملا دیں گے۔"

خواجہ نصر الدّین نے قریب جا کر دیکھا تو یہ چیچک رو رمال جاسوس تھا۔ ایک عورت چاندی کا سِکّہ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ رمال نے مٹر کے دانے قالین پر پھیلا رکھے تھے اور کسی پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"لیکن اگر تم خواجہ نصر الدّین کو نہ ڈھونڈ سکیں۔" وہ بولا۔ "تو تمہارے اوپر مُصیبت آجائے گی۔ تمہارا شوہر تمہیں سدا کے لیے چھوڑ دے گا!"

خواجہ نصر الدّین نے طے کیا کہ اس رمال کو ذرا سبق سکھایا جائے۔ وہ قالین کے پاس بیٹھ گئے:

"ذرا میری قسمت کا حال تو بتانا، دوسروں کی قسمتوں کے دانش مند پارکھ۔"

آدمی نے اپنے دانے پھیلا دیے۔

"اے عورت!" وہ اچانک چلّایا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ "عورت، تیرے اوپر مصیبت آ گئی، موت کا سیاہ ہاتھ تیرے سر پر سایہ کر چُکا ہے!"

کئی لوگ جو اِدھر اُدھر کھڑے تھے اشتیاق سے قریب آ گئے۔

"میں موت کی چوٹ سے تجھے بچانے میں مدد تو کر سکتا ہوں لیکن اکیلا نہیں۔" رمال نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے خواجہ نصر الدّین سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اگر تو اس کو ڈھونڈ نکالے اور مجھے بتائے کہ وہ کہاں ہیں تو تیری جان بچ سکتی ہے۔"

"بہت اچھا، میں خواجہ نصر الدّین کو تیرے پاس لاؤں گی۔"

"تو اُن کو لائے گی؟" رمال نے خوشی سے چونک کر کہا۔ "کب؟"

"میں ان کو ابھی لا سکتی ہوں۔ وہ بہت قریب ہی ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"یہیں، بہت قریب۔"

رمال کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہو گئی۔

"لیکن کہاں ہیں وہ؟ میں ان کو نہیں دیکھتا۔"

"اور تم رمال بنے ہو! اتنا بھی نہیں جان سکتے؟ یہ رہے وہ!"

تیزی کے ساتھ عورت نے اپنا نقاب اُٹھا دیا۔ خواجہ نصر الدّین کا چہرہ دیکھ کر رمال پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ رہے وہ!" خواجہ نصر الدّین نے دہرایا۔ "تم مجھ سے کیا مشورہ کرنا چاہتے تھے؟ تم جھوٹے ہو، تم رمال نہیں بلکہ امیر کے جاسوس ہو! مسلمانو، اس پر مت اعتبار کرو! یہ تم کو دھوکہ دے رہا ہے! وہ یہاں بیٹھا خواجہ نصر الدّین کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے!"

جاسوس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی سپاہی نہ تھا۔ نا اُمّیدی سے تقریباً روتے ہوئے اس نے خواجہ نصر الدّین کو جاتے دیکھا۔ غصّے سے بھرے مجمع نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

"امیر کا جاسوس، پاجی کتّا!" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ قالین لپیٹتے ہوئے رمال کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر وہ محل کی طرف بگٹٹ بھاگا۔

۲۳

گندے، میلے، بدبو دار اور دھوئیں سے بھرے ہوئے پہرے داروں کے کمرے میں سپاہی ایک پرانے نمدے پر جو چیلڑوں سے بھرا تھا بیٹھے اپنا بدن کھجلا رہے تھے اور خواجہ نصر الدّین کو پکڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

"تین ہزار تانگے۔" وہ بولے۔ "سوچو تو، تین ہزار تانگے اور جاسوسوں کے داروغہ کا منصب!"

"کوئی نہ کوئی تو خوش قسمت ہو گا ہی!"

"کاش کہ میں وہ خوش قسمت ہوتا!" ایک موٹے، کاہل سپاہی نے جو سب سے احمق تھا آہ بھر کر کہا۔ وہ ابھی تک اس لیے برخاست نہیں کیا گیا تھا کہ وہ کچا انڈا ابلا چھلکا توڑے مسلم نگل جانے کا آرٹ جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی امیر کا دل اس کرتب سے بہلاتا تھا اور اس سے کچھ انعام حاصل کر لیتا تھا حالانکہ بعد کو اسے سخت درد کی اذیت برداشت کرنی پڑتی تھی۔

چیچک رو جاسوس پہرے داروں کے کمرے میں بالکل بگولے کی طرح داخل ہوا:

"وہ یہاں ہے! خواجہ نصر الدّین بازار میں ہے! وہ عورت کے بھیس میں ہے!"

سپاہی اپنا اسلحہ اُٹھا کر پھاٹک کی طرف بھاگے۔

چیچک رو جاسوس بھی ان کے پیچھے پیچھے چیختا ہوا بھاگا:

"انعام میرا ہے! سُنتے ہو نا! میں نے اس کو پہلے دیکھا! انعام میرا ہے!"

پہرے داروں کو دیکھ کر لوگ جلدی اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور بھگدڑ کی وجہ سے بازار میں ہلچل مچ گئی۔ سپاہی مجمع کے اندر گھُس گئے۔ ان میں سے ایک بے دھڑک سپاہی نے ایک عورت کو پکڑ کر اس کا نقاب چاک کر دیا۔ وہ سارے مجمع کے سامنے بے نقاب ہو گئی۔

عورت نے زور کی چیخ ماری۔ دوسری سمت سے ایک اور چیخ گونجی۔ پھر تیسری عورت سپاہیوں کے پنجے سے نکلنے کی کشمکش کرتی ہوئی چیخی۔ اب چوتھی اور پانچویں۔۔۔ سارا بازار عورتوں کی چیخوں، آہ و بکا اور سسکیوں سے گونج اٹھا۔

متحیر مجمع پر جمود طاری تھا۔ بخارا میں تو ایسا نراج کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ بعض کے چہرے زرد اور بعض کے سُرخ پڑ گئے۔ ہر دل بے چین ہو گیا۔ سپاہی اپنا کام کرتے رہے۔ وہ عورتوں کو پکڑتے تھے، ان کو اِدھر اُدھر کھینچتے تھے، ان کو مارتے تھے اور ان کے کپڑے پھاڑ رہے تھے۔

"مدد! مدد!" عورتیں چلّا رہی تھیں۔

یوسف لوہار کی آواز مجمع کے اوپر زور سے گونجی اور چھا گئی:

"مسلمانو! تم کیوں ہچکتے ہو؟ کیا یہ کم ہے کہ سپاہی ہم کو لوٹتے ہیں؟ اس پر وہ دن دوپہر ہماری عورتوں کی بے عزّتی کرتے ہیں!"

مجمع غصّے سے گرج کر آگے بڑھا۔ ایک سقے نے اپنی بیوی کی آواز پہچان لی اور اس کو چھڑانے لپکا۔ سپاہیوں نے اسے الگ دھکیل دیا لیکن دو جولاہوں اور تین ٹھٹھیروں نے اس کی مدد کی اور سپاہیوں کو پیچھے دھکیلا۔ اب لڑائی شروع ہو گئی۔

رفتہ رفتہ ہر ایک لڑائی میں شامل ہو گیا۔ سپاہیوں نے اپنی تلواریں کھینچ لیں۔ ہر طرف سے ان پر برتن، کشتیاں، صراحیاں، کیتلیاں، نعلیں اور لکڑی کے جوتے برسنے لگے۔ ان کو بچنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سارے بازار میں لڑائی پھیل گئی۔

اسی دوران میں امیر اپنے محل میں آرام سے اونگھ رہا تھا۔ اچانک وہ اُچھلا اور بھاگ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اس کو کھولا اور پھر دہشت کی حالت میں یک دم بند کر دیا۔

بختیار دوڑا ہوا آیا۔ وہ زرد تھا اور کانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" امیر نے پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟ توپیں کہاں ہیں؟ ارسلان بیک کہاں ہے؟"

ارسلان بیک دوڑتا ہوا آیا اور مُنہ کے بل گر پڑا:

"آقا میرا سر قلم کرنے کا حکم دیجیے!"

"یہ کیا ہے؟ کیا معاملہ ہے؟"

ارسلان بیک نے پڑے پڑے جواب دیا:

"آقا، آفتابِ جہاں اور۔۔۔"

"بند کر!" امیر نے بے تاب ہو کر غصّے میں پیر پٹکے۔ "یہ سب بعد کو کہہ لینا! کیا ہو رہا ہے؟"

"خواجہ نصر الدّین ۔۔۔۔ اس نے عورت کا بھیس بدلا۔ یہ سب اُسی کا قصور ہے، یہ سب خواجہ نصر الدّین کا کیا دھرا ہے! میرا سر قلم کرنے کا حکم دیجئے!"

لیکن امیر کو دوسری فکر پڑی تھی۔

۲۴

آج کی ہر گھڑی خواجہ نصر الدّین کے لیے بیش قیمت تھی۔ اس لیے انہوں نے بازار میں آوارہ گردی نہیں کی۔ لیکن ایک سپاہی کا جبڑا اور دوسرے کے دانت توڑ کر اور تیسرے کی ناک چپٹی کر کے وہ صحیح سلامت اپنے دوست علی کے چائے خانے لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے زنانی پوشاک اُتار دی اور رنگین بدخشانی عمامہ اور مصنوعی داڑھی لگالی۔ اس طرح بھیس بدل کر وہ ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے وہ ساری لڑائی کا مشاہدہ کر سکیں۔

مجمع میں گھِرے ہوئے سپاہی اپنے آپ کو پوری طاقت کے ساتھ بچا رہے تھے۔ خواجہ نصر الدّین کے بالکل پاس چائے خانے کے برابر ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ ان سے کسی طرح ضبط نہ ہوا اور انہوں نے اپنی چائے دانی سپاہیوں پر خالی کر دی اور یہ اس مہارت سے کیا کہ انڈے گٹ کر جانے والے موٹے اور کاہل سپاہی کی گردن پر پانی دوڑ گیا۔ وہ چلّا کر زمین پر چِت گر پڑا اور اپنے ہاتھ پیر ہوا میں پھینکنے لگا۔ اس پر نگاہ ڈالے بغیر خواجہ نصر الدّین پھر اپنے خیالات میں ڈوب گئے۔ اچانک انہوں نے کسی بڈّھے کی کانپتی ہوئی چیخ کی آواز سنی:

"مجھے راستہ دو، راستہ دو، خدا کے واسطے! یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

چائے خانے سے ذرا دور جہاں زوروں کی گُتھم گتھا ہو رہی تھی بیچوں بیچ ایک سفید ریش، عقاب جیسی ناک والا بُڈّھا اونٹ پر بیٹھا تھا۔ دیکھنے میں وہ عرب معلوم ہوتا تھا۔ اپنے عمامے کے سِرے کے پیچ کی وجہ سے وہ صاحبِ علم و فضل معلوم ہوتا تھا۔ وہ انتہائی خوف کی حالت میں اپنے

اونٹ کے کوہان سے لپٹا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف لڑائی ہو رہی تھی۔ کوئی اس کا پیر پکڑ کر اونٹ سے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا اور بُڈھّا بچنے کے لیے بے تحاشہ جدوجہد کر رہا تھا۔ غُل غپاڑے اور چیخوں کی گونج کانوں کو بہرہ کیے دے رہی تھی۔

پناہ پانے کی انتہائی کوشش میں بُڈھّا کسی نہ کسی طرح چائے خانے تک پہنچ گیا۔ بار بار چونک کر اور گھوم گھوم کر دیکھتے ہوئے اس نے خواجہ نصر الدّین کے گدھے کے برابر اپنا اونٹ باندھا اور برآمدے پر چڑھ آیا۔

"خدا کی قسم! تمہارے شہر میں کیا ہو رہا ہے؟"

"بازار ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے مختصر سا جواب دے دیا۔

"کیا بخارا میں ہمیشہ ایسے ہی بازار ہوتے ہیں؟ بھلا ایسے مجمع میں مَیں کبھی محل تک پہنچ سکوں گا؟"

"محل" کا لفظ سنتے ہی خواجہ نصر الدّین تاڑ گئے کہ بڈّھے سے یہ ملاقات وہ موقع فراہم کرتی ہے جس کے وہ منتظر تھے اور وہ اب امیر کے حرم تک پہنچ کر گُل جان کو رہا کرا سکیں گے۔"

لیکن سبھی جانتے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ دانائے روزگار شیخ سعدی شیرازی کہہ گئے ہیں "دیر آید درست آید" اس لیے خواجہ نصر الدّین نے بے صبری سے کام نہیں لیا۔

بُڈّھا کراہ کراہ کر آہیں بھر رہا تھا:

"اللہ اکبر! اے مومنوں کے محافظ! میں محل تک کیسے پہنچوں؟"

"یہاں کل تک انتظار کیجئے۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔

"میں انتظار نہیں کر سکتا۔" بُڈّھے نے زور سے کہا۔ "محل میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔"

خواجہ نصر الدّین نے قہقہہ لگایا:

"محترم، سفید ریش بزرگ! میں آپ کا پیشہ اور کام تو نہیں جانتا ہوں لیکن کیا آپ کو قطعی یقین ہے کہ محل میں لوگ آپ کے بغیر کل تک کام نہیں چلا سکتے؟ بخارا میں بڑے بڑے حکماو عقلا ہفتوں تک محل میں باریابی کا انتظار کرتے ہیں۔ آپ کو آخر اس سے مستثنیٰ کیوں دیا جائے گا؟"

"اچھا تو سن لو۔" بُڈّھے نے خواجہ نصر الدّین کی بات کا بُرا مان کر غرور سے کہا۔ "میں مشہور عاقل نجومی اور حکیم ہوں۔ میں امیر کی دعوت پر بغداد سے آیا ہوں تا کہ ان کی ملازمت میں رہ کر امورِ ریاست میں اُن کی مدد کروں۔"

"اوہ!" خواجہ نصر الدّین نے ادب سے جھک کر کہا۔ "خوش آمدید، شیخ دانا! میں بغداد جا چُکا ہوں اور میں اس شہر کے عقلا سے واقف ہوں۔ اپنا نام بتائیے!"

"اگر تم بغداد جا چکے ہو تو تم نے ان خدمات کا ذکر ضرور سُنا ہو گا جو میں نے خلیفہ کے لیے کی ہیں۔ میں نے اُن کے پیارے بیٹے کی جان بچائی تھی جس کا اعلان سارے ملک میں کیا گیا۔ میرا نام مولانا حسین ہے۔"

"مولانا حسین!" خواجہ نصر الدّین نے حیرت سے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ بذاتِ خود مولانا حسین ہوں؟"

بوڑھا یہ دیکھ کر اطمینان سے مُسکرایا کہ اس کی شہرت اپنے شہر بغداد سے باہر نکل کر اتنی پھیل چکی ہے۔

"تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟" اس نے کہا۔ "ہاں، میں بذاتِ خود مولانا حسین ہوں، وہ دانا جس کی عقل و دانش میں، ستارہ شناسی میں اور مسیحائی میں کوئی جواب نہیں۔ لیکن مجھ میں غُرور و فخر نہیں ہے۔ دیکھو نا میں تم جیسے معمولی آدمی سے کس سادگی کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔"

بُڈّھے نے ایک تکیے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کی ٹیک لے لی۔ وہ اپنی عقل و دانش کا تفصیلی حال بتا کر اپنے ہم نشین کو نوازنا چاہتا تھا۔ اس کو اُمّید تھی کہ وہ بڑے فخر کے ساتھ دوسرے لوگوں کو مشہور دانا مولانا حسین سے ملاقات کے بارے میں تفصیل سے بتائے گا، اس کی دانائی کے گُن گائے گا اور سُننے والوں کے دل میں دانا کا احترام بڑھانے کے لیے اس میں مبالغہ بھی کرے گا اور اس طرح اپنے لیے بھی عزّت کمائے گا۔ کیونکہ وہ لوگ یہی رویّہ اختیار کرتے ہیں جن پر بڑے لوگ عنایات کرتے ہیں۔

"اس طرح یہ عام لوگوں میں میری شہرت کو بڑھائے گا جن کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔" مولانا حسین نے سوچا۔ "عوام کی باتیں جاسوسوں اور خبر رسانوں کے ذریعہ امیر کے کانوں تک پہنچیں گی اور میری دانائی کی تصدیق کریں گی۔ کسی بات کی باہر سے تصدیق بلا شُبہ بہترین تصدیق ہے۔ اس طرح آخر میں مجھے ہی فائدہ ہو گا۔

اپنے ہم نشین پر رُعب جمانے کے لیے دانا نے اُس کو تاروں کے جھرمٹوں اور ان کے درمیان روابط کے بارے بتانا شروع کر دیا اور بہت سے پرانے داناؤں کے حوالے بھی دیے۔

خواجہ نصرالدّین اس کی باتیں بڑے غور سے سنتے رہے اور یہ کوشش کی ان کے ذہن میں سب محفوظ ہو جائیں۔

"نہیں!" آخر میں انہوں نے کہا۔ "ابھی تک مجھے یقین نہیں آتا! کیا آپ واقعی مولانا حسین ہیں؟"

"واقعی!" بُڈّھے نے چلّا کر کہا۔ "اس میں کیا عجیب بات ہے؟"

خواجہ نصرالدّین پیچھے ہٹ گئے جیسے وہ ڈر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے خوف وہراس کی آواز میں کہا۔ "بدقسمت انسان! آپ تباہ ہو گئے!"

بوڑھے کا گلا رندھ گیا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا گلاس چھٹ پڑا۔ اس کا سارا گھمنڈ اور اہمیّت غائب ہو گئی۔

"کیسے؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے کہ سب ہنگامہ آپ کی وجہ سے ہے؟" خواجہ نصر الدّین نے بازار کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں ابھی لڑائی بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ "امیر کے کانوں تک یہ بات پہنچی ہے کہ بغداد چھوڑتے وقت آپ نے اعلانیہ فرمایا کہ آپ امیر کے حرم میں دخل حاصل کریں گے اور ان کی بیویوں کو ورغلائیں گے۔ ہائے افسوس، مولانا حسین۔"

بُڈّھے کا مُنہ کھلا رہ گیا، اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور خوف سے ہچکیاں لینے لگا۔ "میں؟" وہ ہکلا رہا تھا۔ "میں۔۔۔ حرم میں۔۔۔؟"

"آپ نے تخت خداوندی کی قسم کھا کر کہا کہ آپ یہی کریں گے۔ نقیبوں نے آج اسی طرح اعلان کیا اور امیر نے حکم دیا ہے کہ شہر میں قدم رکھتے ہی آپ کو پکڑ لیا جائے اور اسی جگہ گردن مار لی جائے۔"

دانا نے ہراساں ہو کر ایک آہ سرد بھری۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے کس دشمن نے اس پر یہ بلا نازل کی ہے۔ اس کو اس بات کی سچائی پر ذرا بھی شبہ نہیں ہوا۔ درباری سازشوں کے دوران اس نے خود متعدد بار اپنے دُشمنوں کو اسی طرح تباہ کیا تھا اور ان کے سر بانسوں پر چڑھے دیکھ کر اس کا دل ٹھنڈا ہوا تھا۔

''تو آج۔'' خواجہ نصر الدّین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جاسوسوں نے امیر کو خبر سنائی کہ آپ آگئے ہیں۔ انہوں نے آپ کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور سپاہی آپ کو جلدی جلدی تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے سب دُکانوں کو چھان مارا۔ کاروبار رُک گیا اور امن و امان نہیں رہا۔ غلطی سے سپاہیوں نے ایک آدمی کو پکڑ لیا جو آپ کا ہم شبیہ تھا اور عجلت میں انہوں نے اُس کا سر قلم کر دیا۔ اتّفاق سے وہ ایک ملا تھا جو اپنے زہد و تقویٰ کے لیے مشہور تھا۔ اس کی مسجد کے لوگ بگڑ کھڑے ہوئے۔ دیکھئے یہ سب کیا ہو رہا ہے اور محض آپ کی وجہ سے۔''

"ہائے کیسا بد قسمت ہوں میں۔" دانا نے خوف و ہراس سے کہا۔

وہ پریشان ہو کر بڑبڑاتا، کراہتا اور فریاد کرتا رہا۔ اس طرح خواجہ نصر الدّین کو یقین ہو گیا کہ ان کی چال کامیاب ہو گئی ہے۔

اس دوران میں لڑائی محل کے پھاٹکوں کی طرف منتقل ہو گئی تھی جدھر بُری طرح پٹے ہوئے سپاہی بھاگ رہے تھے۔ اس دوران میں وہ اپنے ہتھیار بھی کھو بیٹھے تھے۔ بازار میں اب بھی ہل چل اور ہنگامہ تھا لیکن سکون ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے بغداد واپس جانا چاہیے!" بُڈّھے نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بغداد واپس جانا چاہیے!"

"آپ کو شہر کے پھاٹک پر پکڑ لیا جائے گا۔" خواجہ نصر الدّین نے جھٹ سے جواب دیا۔

"ہائے میری قسمت! ہائے مصیبت! خدایا میں معصوم ہوں! میں نے ایسا توہین آمیز اور ناپاک اعلان کبھی نہیں کیا۔ میرے دشمنوں نے امیر سے یہ تہمت تراشی کی ہے۔ ارے مہربان مومن، میری مدد کرو!"

خواجہ نصر الدّین تو اسی بات کے منتظر ہی تھے کیونکہ وہ خود مدد کی پیش کش کر کے دانا کو شُبہ کرنے کی گنجائش نہیں دینا چاہتے تھے۔

"آپ کی مدد کروں؟" انہوں نے کہا۔ "میں آپ کی مدد کیسے کر سکتا ہوں؟ اپنے آقا کے وفادار اور مخلص خادم کی حیثیت سے تو مجھے آپ کو بِلا تاخیر سپاہیوں کے حوالے کر دینا چاہیے تاکہ مجھے پر سازش کا الزام نہ عائد کیا جاسکے۔"

ہچکیاں لیتے اور کانپتے ہوئے دانا نے التجا آمیز نظروں سے خواجہ نصر الدّین کو دیکھا۔

"پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ آپ بے گناہ ہیں اور لوگوں نے آپ کے خلاف تہمت تراشی کی ہے۔ میں تو اس بات کا یقین کرنے کے لیے تیّار ہوں۔" خواجہ نے اس کو یقین دلایا۔ "کیونکہ اس بزرگی کی عمر میں بھلا آپ کا حرم میں کیا کام۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو!" بُڈّھے نے کہا۔ "لیکن میرے لیے نجات کا راستہ کیا ہے؟"

"ایک راستہ ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ وہ بڈّھے کو پچھلی والی اندھیری کوٹھری میں لے گئے اور وہاں انہوں نے اس کو عورت والے کپڑوں کی پوٹلی دی۔ "میں نے آج یہ اپنی بیوی کے لیے خریدے تھے۔ اگر آپ چاہیں تو اس آپ اس کا تبادلہ اپنی عمامے اور عبا سے کر لیں۔ عورت کی نقاب میں آپ جاسوسوں اور سپاہیوں سے محفوظ رہیں گے۔"

بڑی خوشی اور شکریے کے ساتھ بُڈّھے نے کپڑے لے کر پہن لیے۔
خواجہ نصر الدّین نے اس کی سفید عبا پہنی، اس کا طرح دار عمامہ سر پر رکھا اور چوڑا استاروں والا پٹکا باندھا۔ پھر انہوں نے بڈّھے کو اپنے اونٹ پر چڑھنے میں مدد دی۔

"خدا آپ کی حفاظت کرے، اے دانائے روز گار! دیکھیے، عورتوں کی طرح ذرا باریک آواز میں بولنا نہ بھولیے گا۔"

بُڈّھا اپنی سواری پر بگٹٹ بھاگا۔

خواجہ نصر الدّین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ محل کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

۲۵

یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ بازار میں جھگڑا ختم ہو رہا ہے تقدس مآب امیر نے فیصلہ کیا کہ وہ دربار خاص میں درباریوں کے پاس جائے گا۔ اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ وہ پُر سکون ہے لیکن اس کو کچھ تکلیف ضرور ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی درباری یہ سوچنے کی جرأت کر سکے کہ اس کے شاہانہ دل میں خوف نے جگہ پائی ہے۔

امیر جب وہاں پہنچا تو درباری خاموش رہے کیونکہ ان کو یہ ڈر تھا کہ کہیں ان کی آنکھیں اور چہرے اس بات کی غمازی نہ کر دیں کہ وہ امیر کے صحیح جذبات سے بخوبی واقف ہیں۔

امیر اور درباری دونوں خاموش تھے۔ آخر کار یہ خوفناک سکوت امیر نے یہ کہہ کر توڑا:

"تم ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو؟ تمہارا کیا مشورہ ہے؟ یہ سوال ہم تم سے پہلی بار نہیں پوچھ رہے ہیں!"

سب چپکے سے سر جھکائے سناٹے میں کھڑے رہے۔ اچانک امیر کا چہرہ غصّے سے بگڑ گیا۔ نہ معلوم کتنے سر جلّاد کے تیغے کے نیچے جھک جاتے۔ نہ جانے کتنی خوشامدی زبانیں ہمیشہ کے لیے بند کر دی جاتیں جو موت کی اذیّت سے اس طرح خون سے عاری ہونٹوں سے باہر لٹک پڑتیں جیسے وہ زندہ لوگوں کو ان کی دولت ناپائیدار، اپنی پُرغرور اور بیکار تمناؤں، کوششوں کی یاد دلا رہی ہوں۔

لیکن سر شانوں پر برقرار رہے، زبانیں فی البدیہہ خوشامد کے لیے تیز رہیں کیونکہ اس وقت داروغہ محل نے آ کر اعلان کیا:

"خدا مرکز جہاں کو سلامت رکھے! محل کے پھاٹک پر ایک اجنبی کھڑا ہے اور اپنا نام بغداد کا دانا مولانا حسین بتا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ بہت ضروری کام سے آیا ہے اور اسے فوراً جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہونا چاہیے۔

"مولانا حسین!" امیر نے اشتیاق سے کہا۔ "اس کو آنے دو! اس کو یہاں لے آؤ!"

دانا اندر آیا نہیں بلکہ بھاگ کر اندر گھُسا حتیٰ کہ جلدی میں اپنے گرد آلود جوتے بھی اُتارنا بھول گیا۔ تخت کے سامنے مُنہ کے بل گِر گیا:

"مشہور اور پُر عظمت امیر کو، سارے جہاں کے آفتاب و ماہتاب کو، دنیا کے لیے رحیم و قہار کو میرا سلام! میں دن رات منزلیں طے کرتا آیا ہوں تاکہ امیر کو ایک ہولناک خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ امیر بتائیں کہ کیا آج وہ کسی عورت کے پاس گئے؟ امیر، میرے آقا، اس خادم کی بات کا جواب دیجئے۔۔۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔۔۔!"

"عورت؟" امیر نے متحیر ہو کر دہرایا۔ "آج۔۔؟ نہیں۔ ہمارا ارادہ تھا لیکن ابھی تک ہم نے ایسا نہیں کیا ہے۔"

دانا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس نے انتہائی ہیجان کی حالت میں امیر کے جواب کا انتظار کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک طویل اور گہری آہ نکلی۔ رفتہ رفتہ اس کے گالوں کا رنگ واپس آیا۔

"الحمد للہ۔" اس نے زور سے کہا۔ "اللہ نے عقل اور رحمت کی روشنی کو گُل ہونے سے بچا لیا۔ اے امیر! رات کو ستارے اور سیّارے ایسے برجوں میں تھے جو حضور کے بے حد خلاف پڑتے ہیں۔ اور میں نے، اس ناچیز نے جو امیر کے پیروں کی گرد کو بھی بوسہ دینے کے قابل نہیں ہے مشاہدہ کر کے سیّاروں کے مقام کا حساب لگایا۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک وہ پھر سازگار اور نیک فال کے مقامات تک نہ پہنچ جائیں امیر کو کوئی عورت چھونا نہ چاہیے، نہیں تو ان کی تباہی لازمی ہے۔"

"رکو، مولانا حسین۔" امیر نے بیچ میں کہا۔ "تم ایسی باتیں کر رہے ہو جو سمجھ میں نہیں آتیں۔۔۔"

"الحمد للہ کہ میں وقت پر پہنچا۔" دانا کہتا رہا (جو حقیقت میں خواجہ نصر الدّین تھے) "میں اپنی آخری سانس تک اس بات پر فخر کروں گا کہ میں نے امیر کو آج عورت چھونے سے روک دیا۔ اس طرح میں نے دنیا کو ایک زبردست غم سے بچا لیا۔"

اس نے یہ بات اس قدر مسرّت اور خلوص سے کہی کہ امیر کو اس پر یقین ہی کرنا پڑا۔

"جب مجھ کو جو ایک حقیر چیونٹی کی مانند ہے اعلیٰ حضرت نے سرفراز کیا، مجھ ناچیز کو یاد کیا اور مجھے بخارا آکر امیر کی خدمت میں رہنے کا فرمان ملا تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں بے مثال مسرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں امیر کا فوراً حکم بجالایا اور سفر کے لیے چل پڑا۔

"لیکن پہلے میں نے چند دن امیر کا زائچہ کھینچنے میں گزارے۔ پھر میں نے فوراً ان کی خدمت اس طرح شروع کی کہ ان کی قسمت کے سیّاروں اور ستاروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کل رات آسمان دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ستارے اور سیّارے دونوں امیر کے لیے بُری طرح خطرناک ہو رہے ہیں۔ ستارہ الشعلہ جو ضرب کی علامت ہے ستارہ القلب کی طرف جو دل کی علامت ہے خراب رُخ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تین اور ستارے الغفر جو عورت کے نقاب کی علامت ہے، دو ستارے الاکلیل جو تاج کی علامت ہیں اور ستارے السرطان دیکھے جو سینگوں کی علامت ہیں۔

"یہ سب منگل کو تھا جو سیارہ مریخ کا دن ہے اور یہ دن جمعرات کے برخلاف، بڑے آدمیوں کی موت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور امیروں کے لیے انتہائی مضرت رساں ہے۔ ان تمام علامتوں کو دیکھ کر اس ناچیز نے جانا کہ موت کی ضرب کسی صاحبِ تاج کے دل پر پڑنے والی ہے اگر

اس نے عورت کی نقاب کو چھوا۔ اسی لیے میں انتہائی تعجیل کے ساتھ صاحبِ تاج کو آگاہ کرنے کے لیے آیا۔ میں نے دن رات سفر کیا۔ دو اونٹ مر گئے اور میں بخارا میں پیدل داخل ہوا۔

"اے خدائے برتر!" امیر نے بے حد متاثر ہو کر کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کو ایسا خطرہ درپیش ہو؟ کیا تم کو قطعی یقین ہے کہ تم غلطی نہیں کر رہے ہو، مولانا حسین؟"

"غلطی؟ میں؟" دانا نے زور سے کہا۔ "اے امیر، بغداد سے بخارا تک دانائی، علم نجوم اور دستِ شفا میں میرا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں غلطی نہیں کر سکتا۔ آقا، آفتابِ جہاں، امیر اعظم آپ اپنے حکما سے پوچھیے کہ میں نے ستاروں کے صحیح نام بتائے ہیں یا نہیں۔ اور زائچے میں ان کو ٹھیک مقام دیے ہیں یا نہیں؟"

امیر کا اشارہ پا کر ٹیڑھی گردن والا دانا آگے بڑھا۔

"مولانا حسین، دانائی میں میرے بے نظیر ہم عصر نے ستاروں کے صحیح نام بتائے ہیں جن سے ان کے علم و فضل کا پتہ چلتا ہے جس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن۔" دانا نے اپنی بات ایسے لہجے میں جاری رکھی جو خواجہ نصر الدّین کو کینہ آمیز معلوم ہوتا تھا۔ "مولانا حسین نے امیر کو چاند کا سولھواں بُرج اور وہ جھرمٹ نہیں بتایا جس میں یہ برج پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس نشان دہی کے بغیر یہ دعویٰ بے بنیاد ہو گا کہ منگل جو سیّارہ مریخ کا دن ہے قطعی طور پر بڑے آدمیوں کی موت کی نشانی کا دن ہے جن میں تاجدار بھی شامل ہیں کیونکہ مریخ قیام ایک جھرمٹ میں کرتا ہے، اس کا عروج دوسرے میں اور زوال تیسرے میں ہوتا ہے اور چوتھے جھرمٹ میں وہ غروب ہو جاتا ہے۔ ان کے مطابق سیّارہ مریخ کی چار مختلف علامتیں ہیں نہ کہ صرف ایک جیسا کہ انتہائی لائق اور دانا مولانا حسین نے کہا ہے۔"

دانا چالاکی سے مُسکراتا ہوا خاموش ہو گیا۔ درباری ایک دوسرے سے اس بات پر خوش ہو کر کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ نووارد گھبرا گیا ہے۔ اپنی آمدنیوں اور اعلیٰ عہدوں کی حفاظت کے لیے وہ باہر کے تمام آدمیوں کو دور ہی رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہر نووارد کو خطرناک حریف سمجھتے تھے۔

لیکن جب خواجہ نصر الدّین کوئی بات اٹھاتے تھے تو پھر ہار نہیں مانتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دانا، درباریوں اور خود امیر کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے ذرا بھی گھبرائے بغیر بڑے سر پرستانہ انداز میں جواب دیا:

"شاید میرے دانش مند اور لائق ہم عصر مجھ سے علم کی کسی شاخ میں بالاتر ہوں لیکن جہاں ستاروں کا تعلّق ہے ان کے الفاظ ابنِ بجاع کی تعلیم سے قطعی لا علمی کا اظہار کرتے ہیں جو دانائے روز گار تھا اور جس نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ سیّارہ مریخ کا قیام جھرمٹ حمل و عقرب میں،

اس کا عروج جھرمٹ جدّی میں، زوال جھرمٹ سرطان میں اور غروب جھرمٹ میزان میں ہوتا، بہرحال یہ صرف منگل کی خصوصیت ہے جس پر سیّارہ مریخ اثر انداز ہوتا ہے جو تاجداروں کے لیے مہلک ہے۔"

یہ جواب دیتے ہوئے خواجہ نصر الدّین ذرا بھی نہیں ڈرے کہ ان پر جاہل ہونے کا الزام لگایا جائے گا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے مباحثوں میں اُسی کی جیت ہوتی ہے جو سب سے زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اور اس میں اُن کا مقابلہ شاید ہی کوئی کر سکتا ہو۔

وہ اب دانا کے اعتراضات کا اعتراض کرنے اور مناسب جواب دینے کے لیے تیّار کھڑے تھے لیکن دانا نے معاملے کو نہیں اُٹھایا اور خاموش رہا۔ اس کی یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ بحث کو زیادہ طول دے حالانکہ اس کو کافی شک تھا کہ خواجہ نصر الدّین جاہل اور دھوکے باز ہیں لیکن اس کو اپنی جہالت کا خود کافی علم تھا۔ اس لیے اس نے نووارد کو گھبرانے کی جو کوشش کی تھی اس کا اثر اُلٹا ہوا اور درباریوں نے اُسے خاموش کر دیا۔

اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ حریف سے کھلم کھلا مقابلہ کرنا خطرناک ہے۔

یہ اشارے کنائے خواجہ نصر الدّین نے بھی دیکھ لیے اور دل ہی دل میں کہا:

"ذرا ٹھہرو، بتاؤں گا تمہیں!"

امیر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ہر ایک ساکت تھا مبادا امیر کے غور و فکر میں خلل انداز نہ ہو۔

اگر تم نے تمام ستاروں کا نام و قیام صحیح بتایا ہے، مولانا حسین۔" امیر نے آخر کار کہا۔ "تو واقعی تمہاری پیش گوئی ٹھیک ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دو ستارے السرطان جن کی علامت سینگوں کی ہیں ہمارے زائچے میں کیسے آئے؟ واقعی مولانا حسین، تم عین وقت پر پہنچے کیونکہ آج

صُبح ہی کو ایک دوشیزہ ہمارے حرم میں لائی گئی ہے اور ہم تیّاری کر رہے تھے کہ۔۔۔"

خواجہ نصر الدّین نے بناوٹی دہشت سے اپنے ہاتھ ہلائے۔

"اس کو اپنے دماغ سے نکال دیجئے، امیرِ محترم، اس کو نکال دیجئے!" وہ چلّائے جیسے یہ بھول گئے ہوں کہ امیر کو براہِ راست حاضر کے صیغے میں مخاطب نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جانتے تھے کہ اس بے ادبی کو امیر سے وفاداری اور اُن کی جان کی سلامتی کے لیے خوف کا زبردست جذبہ سمجھا جائے گا اور ان کے خلاف نہیں پڑے گا بلکہ اُس کے برعکس امیر کے دل میں ان کے خلوص کے لیے زیادہ وُقعت پیدا ہو گی۔

انہوں نے ایسے زور دار لہجے میں امیر سے درخواست اور التجا کی کہ وہ لڑکی سے اپنے کو مَس نہ کرے تا کہ اُس کو یعنی مولانا حسین کو آنسوؤں کا سیلاب نہ بہانا پڑے اور سیاہ ماتمی لباس نہ پہننا پڑے کہ امیر اس سے بہت متاثر ہوا۔

"مطمئن رہو، مولانا حسین۔ ہم اپنی رعایا کے دُشمن تھوڑے ہی ہیں کہ ان کو رنج و غم میں مبتلا ہونے دیں۔ ہم تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی قیمتی جان کی حفاظت کریں گے اور نہ صرف یہ کہ اس لڑکی کے پاس نہیں جائیں گے بلکہ عام طور پر اس وقت تک حرم میں داخل نہ ہوں گے جب تک تم ہمیں یہ نہ بتاؤ گے کہ اب ہمارے ستارے ساز گار ہیں۔ یہاں آؤ۔"

یہ کہہ کر امیر نے اپنے حقّہ بردار کو اشارہ کیا اور ایک لمبا کش کھینچ کر خود اپنے ہاتھ سے حقّے کی طلائی نال نووارد دانا کی طرف بڑھا دی جو اس کے لیے بری عزّت و عنایت کا باعث تھا۔ گھٹنوں کے بل جھک کر اور نگاہیں زمین کی طرف کر کے دانا نے امیر کی عزت افزائی کو قبول کیا اور اس کے بدن میں جھر جھری آ گئی۔ حاسد درباریوں کے خیال میں یہ جھر جھری خوشی کی تھی۔

"ہم مولانا حسین ایسے دانا کے لیے اپنی عنایتوں اور مہربانیوں کا اعلان کرتے ہیں۔" امیر نے کہا۔ "اور ان کو اپنی سلطنت کا دانائے اعظم مقرر کرتے ہیں۔ ان کا علم و فضل اور عقل و دانش اور ہمارے ساتھ ان کی زبردست وفاداری ہر ایک کے لیے مثال بنی چاہئیں۔"

درباری واقعہ نویس نے، جس کا فرض یہ تھا کہ وہ امیر کے ایک ایک لفظ اور کاروائی کو مدحیہ انداز میں لکھے تاکہ ان کی عظمت آنے والی نسلوں کے لیے قائم رہے (جس کے لیے امیر سب سے زیادہ مشتاق تھا) اپنا قلم چلانا شروع کیا۔

"جہاں تک تمہارا تعلّق ہے۔" امیر نے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے برعکس، ہم تم پر اپنے عتاب کا اعلان کرتے ہیں کیونکہ خواجہ نصر الدّین نے جو کچھ بدمزگی پیدا کر دی ہے اور اس کے علاوہ تمہارے آقا کی جان تک کا خطرہ تھا پھر تم نے مدد کے لیے ایک انگلی تک بھی نہ اُٹھائی! ان کو دیکھو! مولانا حسین، اِن حماقت بھرے گاؤدیوں کو

دیکھو۔ ہیں نہ یہ بالکل گدھوں کی طرح؟ واقعی کسی بادشاہ کے بھی ایسے بیوقوف اور لاپرواہ وزیر نہ رہے ہوں گے!"

"محترم امیر کا فرمانا بالکل بجا ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے ساکت درباریوں کی طرف دیکھ کر اس طرح کہا جیسے وہ پہلی چوٹ کے لیے نشانہ لے رہے ہوں۔ "جہاں تک میں دیکھتا ہوں اِن کے چہروں پر دانشمندی کی کوئی نشانی نہیں ہے۔"

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔" امیر نے بہت خوش ہو کر تصدیق کی۔ "بالکل ٹھیک، ان کے چہروں پر دانشمندی نہیں ہے، سُنتے ہو تم احمقو؟"

"میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔" خواجہ نصر الدّین نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کہ نہ تو ان کے چہروں پر نیک صفات اور ایمانداری ہی کی نشانی ہے۔"

"یہ چور ہیں۔" امیر نے دِلی یقین کے ساتھ کہا۔ "سب کے سب چور ہیں۔ یہ ہم کو دن رات لوٹتے رہتے ہیں۔ ہم کو محل کی میں ایک ایک چیز کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ ہر بار جب ہم اپنی املاک کا جائزہ لیتے ہیں کوئی نہ کوئی چیز غائب ہوتی ہے۔ ابھی آج صُبح ہی ہم اپنا ریشمی پٹکا باغ میں بھول گئے اور آدھ گھنٹے میں وہ غائب ہو گیا!۔۔ ان میں سے کوئی اس کو۔۔۔ سمجھے نا، مولانا حسین۔۔!"

جب امیر یہ کہہ رہا تھا تو ٹیڑھی گردن والے دانا نے اپنی نگاہ بڑی ریاکاری سے نیچے جھکالی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اس طرف توجّہ نہ جاری لیکن اس وقت تو خواجہ نصر الدّین بہت چوکنے ہو رہے تھے۔ انہوں نے فوراً بات تاڑ لی۔

بڑے اعتماد کے ساتھ وہ دانا کے پاس گئے، اپنا ہاتھ اس کی خلعت کے اندر ڈال کر ایک مرصع کار ریشمی پٹکا باہر کھینچ لیا۔

"کیا امیر اعظم اس پٹکے کے ضائع ہونے پر افسوس کر رہے تھے؟"

حیرت و خوف سے تمام درباری پتھر ہو گئے۔ واقعی نیا دانا بہت خطرناک ثابت ہو رہا تھا کیونکہ پہلے ہی آدمی کو جس نے اس کی مخالفت کی جرأت کی تھی اس نے بے نقاب کر کے کچل دیا تھا۔ بہت سے داناؤں، شاعروں، عمائدین اور وزرا کے دل خوف سے کانپ گئے۔

"خدا کی قسم۔" امیر نے زور سے کہا۔ "یہی میرا پڑکا ہے، واقعی مولانا حسین عقل و دانش میں تمہارا کوئی جواب نہیں! آہا!" اور وہ درباریوں کی طرف مُڑا۔ اس کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا۔ اس نے کہا۔ "آہا، آخر کار رنگے ہاتھوں پکڑے گئے! اب تم ہمارا ایک تاگہ بھی چُرانے کی جرأت نہ کرو گے! تمہاری لوٹ مار سے ہم کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے! جہاں تک اس کمبخت چور کا تعلّق ہے اس کے سر، ٹھڈی اور جسم سے تمام بال اُکھاڑ لیے جائیں۔ اس کے تلوؤں پر سو ضربیں لگائی جائیں اور مُنہ کی طرف پیٹھ کر کے گدھے پر ننگا بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جائے اور اس کو عام طور پر چور مشتہر کیا جائے!"

ارسلان بیک کا اشارہ پاتے ہی جلّادوں کے فوراً دانا کو پکڑ لیا، اس کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ چند لمحے بعد اس کو پھر کھینچ کر ہال میں بالکل ننگا، بے بال اور انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں لایا گیا۔ اب سب پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ابھی تک اس کی داڑھی اور زبردست عمامہ اس کی کوتاہی، عقل اور حماقت کو چھپائے تھے جو اس کے چہرے مہرے سے نمایاں تھیں اور ایسا ریاکارانہ چہرے والا آدمی سوائے بدمعاش اور چور کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

"لے جاؤ اس کو۔" امیر نے حقارت سے حکم دیا۔

جلّاد اس کو گھسیٹ کر لے گئے۔ ذرا دیر بعد ہی کھڑکی سے ڈنڈوں اور لاتوں کی دھمک کے تال پر چیخوں کی آواز آنے لگی۔ آخر میں اس کو ایک گدھے پر ننگا بٹھا دیا گیا، اس کا مُنہ گدھے کی دم کی طرف کر کے نفیریوں اور نقّاروں کی گونج میں بازار لے جایا گیا۔

امیر بڑی دیر تک نئے دانا سے باتیں کرتا رہا۔ درباری چاروں طرف بے حس و حرکت کھڑے تھے جو ان کے لیے شدید ترین اذیت تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی اور قبا کے اندر ان کی پیٹھوں میں بُری طرح کھجلی ہو رہی تھی۔

وزیر اعظم بختیار جو سب سے زیادہ نئے دانا سے ڈرا ہوا تھا کوئی منصوبہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے وہ اپنے حریف کو ختم کرنے کے لیے درباریوں کی مدد حاصل کر سکے۔ دوسری طرف درباری متعدّد علامتوں سے یہ اندازہ لگا کر کہ اس مقابلے کا نتیجہ کیا ہو گا، یہ سوچ رہے تھے کہ بختیار کے ساتھ ایسے وقت غدّاری کس طرح کی جائے جو ان کے لیے بہت ہی اچھا ہو اور اس طرح نئے دانا کا اعتماد اور خوشنودی حاصل کی جائے۔

امیر نے خواجہ نصر الدّین سے خلیفہ کی خیریت دریافت کی، بغداد کی خبروں اور ان کے سفر کے واقعات کے بارے میں پوچھا جن کا جواب

انہوں نے بڑی ہوشیاری سے دیا۔ سب کچھ ٹھیک رہا اور امیر نے باتوں کے تکان سے تھک کر آرام گاہ ٹھیک ٹھاک کرنے کا حکم دیا ہی تھا کہ اچانک ہنگامہ اور ایک چیخ سنائی دی۔ داروغہ محل تیزی سے دیوان کے اندر داخل ہوا اور اعلان کیا:

"آقائے نامدار کی خدمت میں عرض ہے کہ کافر اور امن شکن خواجہ نصرالدّین گرفتار کر لیا گیا ہے اور محل لایا گیا ہے!"

ابھی اس نے یہ اعلان کیا ہی تھا کہ اخروٹ کی لکڑی کے نقشیں پھاٹک پٹو پٹ کھل گئے۔ اسلحہ کی فاتحانہ جھنکار ہوئی اور پہرے دار ایک عقابی ناک، سفید داڑھی والے آدمی کو سامنے لائے جو زنانے لباس میں تھا۔ انہوں نے تخت کے نیچے قالین پر اس کو دھکیل کر گرا دیا۔

خواجہ نصرالدّین کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ ہال کی دیواریں اُن کی نگاہ کے سامنے ناچ رہی تھیں اور درباریوں کے چہرے سبزی مائل دُھند میں چھپے معلوم ہونے لگے۔۔۔

۲۶

بغداد کا دانا، اصلی مولانا حسین، اسی پھاٹک پر دھر لیا گیا جس کے پار وہ نقاب کے اندر سے ہر سمت جانے والی سڑکیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر سڑک اس کو بدبختی سے نجات پانے کی راہ معلوم پڑتی تھی۔

لیکن پھاٹک کے پہرے داروں نے اس کو ٹوکا۔ "اے عورت، کہاں جا رہی ہے تو؟"

دانا نے آواز بنا کر اس طرح جواب دیا کہ معلوم ہوا کوّا بول رہا ہے:

"میں عجلت میں ہوں، اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔ بہادر سپاہیو، مجھے جانے دو۔"

آواز پر شُبہ کرتے ہوئے پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے اونٹ کی مہار تھام لی۔

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"یہیں، بالکل قریب۔" دانا نے اور بھی باریک آواز میں جواب دیا۔ اس کوشش میں اس کو کھانسی آ گئی اور دم پھول گیا۔ پہرے داروں نے اس کا نقاب پھاڑ دیا۔ ان کو بے حد خوشی ہوئی۔

"وہی ہے، وہی!" وہ چلّائے۔ "پکڑ لو! باندھ لو! پکڑ لو!"

اس کے بعد وہ بڈّھے کو محل لائے اور راستے میں اس پر بات چیت کرتے رہے کہ کس طرح اس کو موت کی سزا ملے گی اور تین ہزار تانگے کا انعام

جو اُن کو ملنے کی اُمّید تھی۔ ان کا ایک ایک لفظ بڈّھے کے لیے جلتے ہوئے انگارے کی طرح تھا۔

وہ تخت کے نیچے پڑا کانپ رہا تھا اور رو رو کر رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"اس کو ہٹاؤ۔" امیر نے حکم دیا۔

پہرے داروں نے اس کو پیروں پر کھڑا کیا۔ ارسلان بیک درباریوں کے مجمع سے آگے آیا اور بولا:

"حضور، غلام کی بھی ایک بات سنیں۔ یہ آدمی خواجہ نصر الدّین نہیں ہے۔ خواجہ نصر الدّین نوجوان ہے، تیس سال سے کچھ اوپر اور یہ آدمی کافی معمّر ہے۔"

پہرے دار ہراساں ہو گئے۔ انعام ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ ہر آدمی خاموش اور چکرایا ہوا تھا۔

"تو نے عورت کا بھیس کیوں بدلا؟" امیر نے دھمکی آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں امیر معظم و محترم کے محل کی طرف آ رہا تھا۔" بُڈّھے نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میری ملاقات ایک آدمی سے ہوئی جو بالکل اجنبی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے بخارا آنے سے پہلے ہی امیر نے میرا سر قلم کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ میں نے خوف سے بھیس بدل کر بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔"

امیر نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ سب سمجھتا ہے قہقہہ لگایا:

"تم ایک آدمی سے ملے۔۔۔ ایک اجنبی سے اور فوراً اس کی بات کا یقین کر لیا۔۔۔؟ کیا لاجواب قصّہ ہے! ہم تمہارا سر کیوں قلم کرنے والے تھے؟"

"کیونکہ کہا جاتا ہے کہ میں نے الاعلان اس بات کی قسم کھائی تھی کہ امیر معظّم کے حرم میں گھسوں گا۔۔۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں کیا! میں بُڈّھا اور ضعیف ہوں اور مدّتوں ہوئے خود اپنے حرم تک کو ترک کر چکا ہوں۔"

"ہمارے حرم میں گھس جاؤ گے؟" امیر نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے دُہرایا۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ بڈّھے کے خلاف اس کے شکوک میں اضافہ ہو رہا ہے۔ "تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟"

"میں ہوں بغداد کا دانا حکیم مولانا حسین۔ میں امیر معظّم کے حکم کے مطابق بخارا آیا ہوں۔"

"مولانا حسین؟" امیر نے دہرایا۔ "تم مولانا حسین ہو! تمہارا نام مولانا حسین ہے! ارے کمبخت بڈّھے، یہ تو سفید جھوٹ ہے!" وہ اتنی زور سے گرجا کہ ملک الشعراء اچانک گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ "جھوٹ بولتا ہے! یہ رہے مولانا حسین!"

امیر کا اشارہ پا کر خواجہ نصر الدّین بڑی فرمانبرداری کے ساتھ آگے بڑھے اور بڈّھے کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے اور نڈر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

بُڈّھا حیرت سے پیچھے ہٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے کو سنبھال کر چلّایا:

"آقا، ارے یہ تو وہی آدمی ہے جو مجھے بازار میں ملا تھا اور اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ امیر میرا سر قلم کر دینا چاہتے ہیں!"

"یہ کیا کہہ رہا ہے، مولانا حسین!" امیر نے انتہائی پریشان ہو کر کہا۔

"یہ مولانا حسین نہیں ہے!" بُڈّھا چیخا۔ "میں مولانا حسین ہوں۔ یہ دھوکے باز ہے! اس نے میرا نام چُرا لیا ہے!"

خواجہ نصر الدّین نے امیر کے سامنے بہت جھک کر کہا:

"معظّم بادشاہ میری گستاخی معاف ہو لیکن یہ بُڈّھا واقعی بے حد بے حیا ہے! کہتا ہے کہ میں نے اس کا نام چُرا لیا اور شاید یہ بھی کہے گا کہ میں نے اس کی عبا پر قبضہ جما لیا ہے؟"

"ہاں ہاں!" بُڈّھا چلّایا۔ "یہ عبا میری ہی ہے!"

"ممکن ہے کہ یہ عمامہ بھی تمہارا ہی ہو؟" خواجہ نصر الدّین نے مذاق اُڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ضرور! یہ میرا ہی عمامہ ہے! تم نے میری عبا اور عمامے کو زنانے لباس سے بدل لیا تھا۔"

"اچھا!" خواجہ نصر الدّین نے اور طنز سے کہا۔ "اور یہ پٹکا بھی غالباً تمہارا ہی ہے؟"

"میرا ہی ہے!" بُڈّھے نے غصّے کے ساتھ زور دے کر کہا۔

خواجہ نصر الدّین تخت کی طرف مڑے اور بولے:

"حضورِ والا، امیر معظّم نے خود دیکھ لیا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ آج یہ جھوٹا اور بے ہودہ بُڈّھا یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کا نام چُرا لیا، یہ عبا اس کی ہے، یہ عمامہ اس کا ہے اور یہ پٹکا اس کا ہے اور کل یہ کہے گا کہ یہ محل اس کا ہے اور ساری سلطنت اس کی ہے اور بخارا کا اصلی امیر وہ عظیم اور آفتاب جیسا بادشاہ نہیں ہے جو اس وقت ہمارے سامنے تخت پر جلوہ فرما ہے بلکہ یہ بے ہودہ جھوٹا ہے! اس سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ بخارا کیوں آیا؟ کیا وہ امیر کے حرم میں اس طرح گھسنے نہیں آیا جیسے کہ اس کا خود کا حرم ہو؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو، مولانا حسین۔" امیر نے کہا۔ "ہاں، ہم کو یقین ہو گیا۔ بُڈّھا مشکوک اور خطرناک آدمی ہے اور اس کے ارادے بد ہیں۔ ہماری رائے میں اس کا سر فوراً جسم سے جدا کر دیا جائے۔"

بُڈّھا آہ بھر کر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

بہر حال خواجہ نصر الدّین یہ نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے اُوپر جو الزامات تھے ان کی بنا پر کسی بے گناہ کو موت کے گھاٹ اُتارا جائے چاہے وہ آدمی درباری داناہی کیوں نہ ہو جو اپنے جعل سے بہتوں کی تباہی کا باعث بن چکا تھا۔ اس لیے انہوں نے امیر کے سامنے بہت جھک کر عرض کیا:

"امیر معظّم میری بات سُننے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اس کا سر جب چاہے قلم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پہلے کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ اس کا اصلی نام اور بخارا آنے کا سبب معلوم کیا جائے؟ ممکن ہے کہ سازش میں اس کے ساتھی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی بد طینت جادُوگر ہو جو ستاروں کی خرابی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو امیر معظّم کے قدموں کے نیچے کی مٹّی لے گا اور اس کو چمگادڑ کے بھیجے میں ملا دے گا اور پھر اس کو امیر کے حُقّے میں رکھ دے گا اور اس طرح ان کی صحت کو نقصان پہنچائے گا۔ امیرِ معظّم اس کی جان بخشی کریں اور اس کو مجھے حوالے کریں۔ وہ معمولی

پہرے داروں پر اپنے جادُو سے قابو پالے گا لیکن میرے خلاف اس کا زور نہیں چل سکتا کیونکہ اپنے علم سے میں جادُوگروں کی ساری چالیں جانتا ہوں اور ان کے جادُو کے توڑ کے سب طریقے معلوم ہیں۔ میں اس کو بند کرکے قفل پر ایسی دُعا پڑھ دوں گا جو صرف مجھ کو معلوم ہے۔ اس طرح صرف اپنے جادُو کی طاقت سے وہ قُفل نہیں کھول سکے گا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو اذیت پہنچا کر میں اس کو سب کچھ قبولنے پر مجبور کروں گا۔"

"اچھا۔" امیر نے کہا۔ "مولانا حسین، تم معقول بات کہہ رہے ہو۔ اس کو لے جاؤ اور جو جی چاہے کرو لیکن ہوشیار رہنا کہیں یہ بھاگ نہ جائے۔"

"میرا سر قلم کر دیجیئے گا۔"

آدھ گھنٹہ بعد خواجہ نصرالدّین جو اب امیر کے مشیر خاص اور نجومی بن چکے تھے اپنی نئی جائے رہائش پر آ گئے جو ان کے لیے محل کی فصیل کے ایک برج میں خاص طور سے سجائی گئی تھی۔ ان کے پیچھے سخت پہرے میں سر جھکائے ملزم تھا، اصلی مولانا حسین۔

خواجہ نصرالدّین کی قیام گاہ سے اوپر برج میں ایک چھوٹا سا گول کمرہ تھا جس میں سلاخ دار کھڑکی تھی۔ خواجہ نصرالدّین نے ایک بہت بڑی کنجی سے زنگ لگا ہوا پیتل کا قُفل اور بکتر بند دروازہ کھولا۔ پہرے داروں نے بُڈّھے کو اندر دھکیل دیا۔ اسے کولی بھر پیال لیٹنے کے لیے دی۔ خواجہ نصر الدّین نے دروازے میں قفل لگا دیا اور اس پیتل کے قفل پر بڑی تیزی سے کچھ اس طرح پڑھتے رہے کہ پہرے داروں کی سمجھ میں صرف جا بجا اللہ کا نام آتا تھا۔

خواجہ نصرالدّین اپنی قیام گاہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ امیر نے اُن کو بارہ گدے، آٹھ تکیے اور سامانِ خانہ داری دیا تھا اور ایک ٹوکری نان، شہد اور بہت سی دوسری لطیف اور مزیدار چیزیں کھانے کے لیے اپنے دستر خوان سے بھیجی تھیں۔ خواجہ نصرالدّین بہت تھکے اور بھوکے تھے لیکن کھانا کھانے سے پہلے انہوں نے چھ گدّے اور چار تکیے قیدی کو پہنچا دیے۔

بُڈّھا ایک کونے میں سمٹا سمٹایا پڑا تھا، اس کی آنکھیں اندھیرے میں غضبناک بلّی کی طرح چمک رہی تھیں۔

"اچھا۔" خواجہ نصرالدّین نے سہج سے کہا۔ "ہم اس برج میں تم تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ میں نیچے ہوں اور تم اوپر جیسا کہ تمہاری عمر اور دانائی کے لیے زیبا ہے۔ ارے یہاں کتنی گرد ہے! میں ذرا اس کو صاف کر دوں۔"

وہ نیچے سے پانی کا ایک گھڑا اور جھاڑو لائے۔ انہوں نے اچھی طرح پتھر کا فرش دھویا، گدّے بچھائے اور تکیے لگائے۔ پھر انہوں نے نیچے کا ایک اور چکّر لگایا اور نان، شہد، حلوہ اور پستے لائے جن کو انہوں نے ایمانداری کے ساتھ قیدی کے سامنے دو حصّوں میں تقسیم کیا اور کہا:

"تم بھوکے نہیں رہو گے، مولانا حسین، ہم کھانے کا کافی انتظام کر لیں گے۔ یہ رہا حقّہ اور تمبا کو۔"

ہر چیز انہوں نے اس طرح سجا دی کہ یہ چھوٹا سا کمرہ خود اُن کے اپنے کمرے سے بہتر معلوم ہونے لگا۔ اب خواجہ نصر الدّین رخصت ہوئے اور دروازے میں قفل لگا دیا۔

بُڈّھا اکیلا پڑا رہا۔ وہ بہت بد حواس تھا۔ بڑی دیر تک وہ سوچتا اور گتھیاں سلجھاتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ گدّے بہت نرم تھے اور تکیے بھی آرام دہ تھے۔ نہ تو نان میں اور نہ شہد یا تمبا کو میں کوئی زہر تھا۔۔ سارے دن کے ہنگامے سے تھکے چُور بُڈّھے نے اپنی قسمت کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ کر سونے کا ارادہ کیا۔

اس دوران میں وہ آدمی جو اس کی تمام مصیبتوں کا باعث تھا نیچے کے کمرے میں کھڑکی پر بیٹھا شفق کو رات میں ڈھلتے دیکھ رہا تھا اور اپنی غیر معمولی طوفانی زندگی اور محبوبہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو یہاں اس سے بہت ہی قریب تھی لیکن اس کے متعلّق کچھ نہیں جانتی تھی۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی۔ مؤذنوں کی گونجتی ہوئی پُر سوز آواز شہر کے

اوپر کسی نقرئی فیتے کی طرح پھیل گئی۔ سیاہ آسمان میں تارے جھلملانے لگے۔ ان کی چمک اور جھلملاہٹ ایک خالص، سرد اور دور دراز کی آگ سے ملتی تھی۔ وھاۃ ستارہ القلب چمک رہا تھا جو دل سے تعلّق رکھتا ہے اور تین ستارے الغفر تھے جو کسی دوشیزہ کے نقاب کی نشانی ہیں اور دو ستارے السرطان تھے جو دو سینگیں پیش کرتے ہیں اور صرف ستارہ الشعلہ جو نجس اور موت کی نشانی ہے آسمان کی تاریک بلندیوں پر نہیں دکھائی دے رہا تھا۔۔۔

حصّہ سوئم

سلام اس پر جو جاودانی اور لافانی ہے!

"الف لیلہ"

۲۷

خواجہ نصر الدّین نے امیر کا اعتماد اور عنایات حاصل کر لیں اور تمام معاملات میں اس کے خاص مشیر بن گئے۔ خواجہ نصر الدّین فیصلے کرتے تھے۔ امیر کا کام صرف ان پر دستخط کرنا اور وزیر اعظم بختیار کا فرضِ منصبی صرف ان پر مہر لگانا تھا۔

"اللہ اکبر! ہماری ریاست میں اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے!"

بختیار نے ٹیکس کے خاتمے، سڑکوں اور پُلوں کے مُفت استعمال اور بازار کے نرخ کم کرنے کے بارے میں امیر کا فرمان پڑھ کر کہا۔ "جلد ہی خزانہ

خالی ہو جائے گا! یہ نیا مشیر، خدا اس کو غارت کرے، اس نے تو ایک ہفتے میں وہ سب ڈھا دیا جو میں نے دس سال میں بنایا تھا!"

ایک دن اس نے اپنے شبہات امیر کے گوش گزار کرنے کی جرأت کی لیکن امیر نے جواب دیا:

"مجہول انسان تو کیا جانتا ہے اور کیا سمجھتا ہے؟ ہم کو بھی یہ فرمان جاری کر کے رنج ہوتا ہے جو ہمارے خزانے کو خالی کرتے ہیں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں اگر ستاروں کا یہی حکم ہے؟ بختیار گھبراؤ نہیں! یہ صرف تھوڑے دن کے لیے ہے جب تک ستارے سازگار نہیں ہوتے۔ مولانا حسین، اس کو یہ سمجھاؤ!"

خواجہ نصرالدّین وزیر اعظم کو علیحدہ لے گئے اور اس کو گدّوں پر بٹھا بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا کہ لوہاروں، ٹھٹھیروں اور اسلحہ سازوں کے مزید ٹیکس فوراً ختم کرنے کی ضرورت کیوں ہے۔

"جھرمٹ قوس میں البلدہ ستارے جھرمٹ عقرب میں صد باز ستاروں کے خلاف ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "دانائے روزگار وزیر آپ سمجھتے جیں ناں کہ وہ خلاف ہیں اور دونوں کے قران کا امکان نہیں ہے۔"

"اچھا، تو اس سے کیا ہوتا ہے؟" بختیار نے جواب دیا۔ "وہ پہلے بھی قران میں نہیں تھے پھر انہوں نے ہم کو ٹیکس وصول کرنے سے نہیں روکا۔"

"لیکن آپ جھرمٹ ثور میں ستار الدبران کو بھول گئے!" خواجہ نصر الدّین نے زور سے کہا۔ "وزیر محترم، آپ آسمان کو دیکھئے خود پتہ چل جائے گا۔"

"میں آسمان کیوں دیکھوں۔" ضدّی وزیر نے کہا۔ "میرا کام ہے خزانے کی حفاظت کرنا اور اس کو دولت سے بھرنا اور میں دیکھتا ہوں کہ جب سے آپ محل میں آئے ہیں خزانے کی آمدنی گھٹ گئی ہے اور ٹیکسوں کا

آنا کم ہو گیا ہے۔ یہی وقت شہر کے کاریگروں سے ٹیکس وصول کرنے کا ہے، بتایئے، ہم انہیں کیوں نہ وصول کریں؟"

"کیوں؟" خواجہ نصر الدّین چیخے۔ "میں ایک گھنٹے سے آپ کو یہی سمجھا رہا ہوں۔ کیا اب بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہر منطقہ البروج پر چاند کے دو محل ہوتے ہیں ایک تہائی کے ساتھ۔۔۔"

"لیکن مجھے ٹیکس تو وصول کرنا ہی ہیں!" وزیر نے پھر بات کاٹ کر کہا "ٹیکس، سمجھتے ہیں نا آپ۔"

"صبر کیجئے۔" خواجہ نصر الدّین نے بختیار کو روک دیا۔ "ابھی میں نے آپ سے الثریا کے مجموعہ نجوم اور انعیم کے آٹھ ستاروں کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔۔۔"

اب خواجہ نصر الدّین نے ایسا پیچیدہ اور طویل بیان شروع کر دیا کہ وزیر اعظم کے کان سنسنانے لگے اور آنکھیں دُھندلی پڑ گئیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا چلا گیا اور خواجہ نصر الدّین نے امیر کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

"آقائے نامدار، چاہے عمر نے ان کے سر کو چاندی سے ڈھک دیا ہو اور اس سے ان کا سر بیش قیمت ہو گیا ہو لیکن جو کچھ اندر ہے وہ سونا نہیں بنا ہے۔ وہ میرے علم و فضل کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھے آقا! کاش کہ ان کو امیر کی ذہانت کا جو خود لقمان کی فراست کو مات کرتی ہے ہزارواں حصّہ ہی ملا ہوتا!"

امیر بڑی مہربانی اور خود پسندی سے مسکرایا۔ ان دنوں خواجہ نصر الدّین بڑی محنت سے اس کو یقین دلا رہے تھے کہ اس کی فراست کا کوئی جواب نہیں ہے اور اس کوشش میں خواجہ پوری طرح کامیاب ہوئے تھے چنانچہ جب وہ کوئی بات امیر کے سامنے ثابت کرنے لگتے تو امیر اس کو

بڑے غور سے سنتا اور اس پر بحث نہ کرتا کیونکہ اس کو یہ ڈر تھا کہ کہیں اس کی ذکاوت کا پول نہ کھل جائے۔

۔۔۔دوسرے دن بختیار نے اپنے دل کی بات درباریوں کے ایک گروہ سے کہی:

"یہ نیا دانا، مولانا حسین ہم سب کو تباہ کر دے گا! جس دن ٹیکس جمع کیے جاتے ہیں اسی دن ہم بھی اس اُبلتے ہوئے چشمے سے سیراب ہوتے ہیں جو امیر کے خزانے کی طرف بہتا ہے۔ لیکن جب سیراب ہونے کا وقت آتا ہے تو یہ مولانا حسین ہماری ساری اُمّیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے! وہ ستاروں کا محل بتانے لگتا ہے۔ بھلا کبھی کسی نے یہ سُنا ہے کہ یہ ستارے جو اللہ کے احکام کے تابع ہیں امرا و شرفا کے بھی خلاف پڑے ہوں اور حقیر کاریگروں کے لیے سازگار رہے ہوں جو، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، اپنی کمائی ہمیں دینے کی بجائے خود بڑی بے شرمی سے چٹ کر رہے ہیں! بھلا کسی نے ستاروں کی ایسی گردش کے بارے میں سنا ہے؟

اس طرح کی کوئی کتاب نہیں لکھی جا سکتی تھی کیونکہ وہ کتاب فوراً جلا دی جاتی اور اس کے مصنّف کو بہت بڑا کافر، منکر اور مجرم ٹھہرا کر سولی پر چڑھا دیا جاتا!"

درباریوں نے کچھ نہیں کہا کیونکہ انہیں قطعی یقین نہیں تھا کہ کس کی طرفداری کرنا مفید ہو گا بختیار کی یا نئے دانا کی؟

"ٹیکس کی وصول یابی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔" بختیار نے اپنی بات جاری رکھی۔" اور کیا ہو گا؟ اس مولانا حسین نے امیر کو یہ کہہ کر دھوکا دیا ہے کہ ٹیکس چند دن کے لیے ختم کئے گئے ہیں اور بعد میں پھر ان کو لگا کر اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ امیر کو اس بات کا یقین ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کسی ٹیکس کو ختم کرنا آسان ہے لیکن کوئی نیا لگانا بہت ہی مشکل ہے۔ آدمی اپنا پیسہ اس وقت جلدی دے دیتا ہے جب وہ اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ پیسے کو کسی دوسرے کا سمجھے لیکن ایک بار وہ اپنے

اوپر یہ رقم خرچ کرلے تو پھر دوسری بار اس کو اسی طرح خرچ کرنا چاہے گا۔"

"خزانہ خالی ہو جائے گا اور ہم یعنی امیر کے درباری تباہ ہو جائیں گے۔ زربفت کے لباس کی بجائے ہمیں موٹے کپڑے پہننا پڑیں گے۔ بیس بیویوں کی بجائے ہمیں دو ہی پر قناعت کرنی پڑے گی۔ چاندی کی پلیٹوں میں کھانے کی بجائے مٹّی کے برتن ہوں گے اور نرم میمنے کے نرم گوشت کے بجائے ہمیں گائے کے سخت گوشت کا پلاؤ کھانا پڑے گا جو صرف کتّوں اور دستکاروں کے لیے ہی موزوں ہے۔ یہی مولانا حسین ہمارے لیے کرنے والا ہے۔ جو اس کو نہیں سمجھتا وہ اندھا ہے اور لعنت ہو اس پر!"

اس طرح کہہ کر بختیار نے نئے دانا کے خلاف درباریوں کو بہکانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی کوششیں بے سُود رہیں۔ مولانا حسین کو اپنے منصب میں برابر کامیابیاں ہوتی گئیں۔ وہ خاص طور سے "یومِ مدح

سرائی" کے موقع پر ممتاز رہا۔ ایک پرانے رواج کے مطابق ہر مہینے تمام وزراء و امراء، حکما و شعراء کا امیر کے سامنے مقابلہ ہوتا تھا جس میں امیر کی مدح و ثنا کی جاتی تھی۔ مقابلے میں جیتنے والے کو انعام ملتا تھا۔

ہر شخص نے اپنا قصیدہ پیش کیا لیکن امیر خوش نہیں ہوا۔ اس نے کہا:

"یہی باتیں تم نے پچھلی بار بھی کہی تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں تم اپنی تعریفوں میں زیادہ گہرے نہیں ہو۔ تم اپنے دماغوں پر زور دینا نہیں چاہتے ہو۔ ہم تم سے سوالات کریں گے اور تم ان کا جواب اس طرح دو کہ تعریف و تشبیہ دونوں کا امتزاج ہو جائے۔ غور سے سُنو، ہمارا پہلا سوال ہے۔ اگر ہم، امیر اعظم بخارا تمہارے دعوے کے مطابق طاقتور اور ناقابلِ تسخیر ہیں تو پڑوسی اسلامی ممالک کے حکمرانوں نے ابھی تک ہمارے یہاں اپنے ایلچی اور قیمتی تحائف ہماری مکمل اطاعت کے پیغام کے ساتھ کیوں نہیں بھیجے ہیں؟ ہم تمہارے جواب کے منتظر ہیں۔"

درباری گھبرا گئے۔ وہ براہِ راست جواب دینے کی بجائے مُنہ ہی مُنہ میں بُدبُدانے لگے۔ صرف خواجہ نصرالدّین پُرسکون تھے۔ جب ان کی باری آئی تو وہ بولے:

"میں اپنے حقیر الفاظ امیر کے گوش گزار کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ ہمارے شاہ کے سوال کا جواب آسان ہے۔ پڑوسی ملکوں کے تمام حکمران ہمارے آقا کی قدرتِ کامل سے برابر لرزاں وترساں رہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں، اگر ہم بخارا کے عظیم، صاحب شان و شوکت امیر کو بیش قیمت تحفے بھیجیں تو وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہمارا ملک زرخیز ہے جو ان کے لیے اس بات کی ترغیب ہو گی کہ وہ فوجیں لے کر ہم پر چڑھ آئیں اور ہمارے ملک پر قبضہ کرلیں۔ اگر اس کے برعکس ہم ان کو حقیر تحفے بھیجیں تو وہ ناراض ہو جائیں گے اور اپنی فوج ہمارے خلاف بھیج دیں گے۔ بخارا کے امیر عظیم، صاحب شان و شوکت اور طاقتور ہیں اس لیے یہی بہتر ہے کہ ہم ان کو اپنے وجود کی یاد ہی نہ دلائیں۔۔۔"

”یہ ہیں خیالات جو بادشاہوں کے دماغوں میں ہیں اور اس کا سبب کہ وہ بیش بہا تحفوں کے ساتھ اپنے سفیر بخارا کیوں نہیں بھیجتے ہمارے بادشاہ کی قدرتِ کامل کے مستقل خوف میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

”آہا۔“ خواجہ نصر الدّین کے جواب سے مسرور ہو کر امیر نے کہا۔ ”امیر کے سوال کا جواب اسی طرح دینا چاہیے۔ سُنی تم لوگوں نے مولانا حسین کی بات، ارے بیوقوفو، گاؤدیو ان سے سیکھو! واقعی مولانا حسین کی عقل و دانش تم سے دسیوں گنی زیادہ ہے۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

درباری باورچی نے فوراً لپک کر خواجہ نصر الدّین کا مُنہ حلوے اور شیرینی سے بھر دیا۔ خواجہ نصر الدّین کے گال پھُول گئے اور گلا گھٹنے لگا۔ میٹھی رال ان کی ٹھڈی تک بہہ نکلی۔

امیر نے اور کئی ٹیڑھے سوال کئے لیکن ہر بار خواجہ نصر الدّین ہی کا جواب بہترین رہا۔

”درباری کا اوّلین فرض کیا ہے؟“ ایک ایسا ہی سوال تھا جس کا جواب خواجہ نصر الدّین نے یوں دیا:

”اے صاحب شان و شوکت اور باعظمت بادشاہ! درباری کا اوّلین فرض ہے کہ وہ روزانہ ریڑھ کی کسرت کرتا رہے تا کہ اس میں ضروری لچک پیدا ہو جائے کیونکہ اس کے بغیر وہ بجا طور پر اپنی وفاداری اور احترام کا اظہار نہیں کر سکتا۔ درباری کی ریڑھ کی ہڈی میں جھکنے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف گھومنے مُڑنے کی خوبی بھی ہونی چاہیے۔ اس میں عام آدمی کی پتھرائی ہوئی ریڑھ کی ہڈّی سے امتیاز ہونا چاہیے جس کو ٹھیک سے جھک کر سلام کرنا بھی معلوم نہیں ہے۔“

”بالکل ٹھیک!“ امیر نے خوش ہو کر زور سے کہا۔ ”بالکل ٹھیک! اپنی ریڑھ کی ہڈّی کی روزانہ کسرت! ہم دوسری بار مولانا حسین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

ایک بار پھر خواجہ نصر الدّین کا مُنہ حلوے اور شیرینی سے بھر دیا گیا۔

اس دن بہت سے درباری بختیار کے گٹ کو چھوڑ کر خواجہ نصر الدّین سے آن ملے۔

اس دن شام کو بختیار نے ارسلان بیک کو اپنے گھر مدعو کیا۔ نیا دانا دونوں کے لیے مساوی طور پر خطرناک تھا اور اس کو ختم کرنے کی خواہش نے ان کی پرانی دُشمنی کو عارضی طور پر دبا دیا تھا۔

"اگر اس کے پلاؤ میں کچھ ملا دیا جائے تو اچھا رہے گا۔" ارسلان بیک نے تجویز کی جو ایسے کاموں میں بڑا اُستاد تھا۔

"اور اس کے بعد امیر ہمارے سر قلم کر دے گا۔" بختیار جھٹ سے بولا۔ "نہیں محترم ارسلان بیک ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں مولانا حسین کی عقلمندی کی ہر طرح تعریف کرنی چاہیے یہاں تک وہ امیر کے دل میں یہ شُبہ پیدا ہو جائے کہ درباری مولانا حسین کو خود امیر سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ ہمیں متواتر مولانا حسین کی تعریفوں کے پُل باندھ دینا چاہیے اور ایک دن ایسا آئے گا جب امیر رشک کرنے لگے گا۔

وہ دن مولانا حسین کے عروج کا آخری دن اور اس کے زوال کی ابتدا ہو گی۔"

لیکن قسمت خواجہ نصر الدّین پر مہربان تھی اور ان کی غلطیاں بھی ان کے لیے مفید بن جاتی تھیں۔

جب بختیار ارسلان بیک نے نئے دانا کی مسلسل اور مبالغہ آمیز مدح و ثنا سے تقریباً اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا اور امیر دل ہی دل میں اس سے رشک کرنے لگا تھا تو اتّفاق سے خواجہ نصر الدّین سے ایک فاش غلطی ہو گئی۔

خواجہ امیر کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے، پھولوں کی مہک اور چڑیوں کی چہکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ امیر خاموش تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے یہ محسوس کیا کہ اس خاموشی میں کچھ ناراضگی پنہاں ہے لیکن اس کی وجہ نہ سمجھ سکے۔

”اور وہ بُڈّھا، تمہارا قیدی کیسا چل رہا ہے؟“ امیر نے پوچھ لیا۔ ”کیا تم نے اس کا اصلی نام اور بخارا آنے کا سبب معلوم کر لیا؟“

خواجہ نصر الدّین اس وقت گُل جان کے خیال میں محو تھے۔ اس لیے انہوں نے کھوئے پن سے جواب دیا:

”جہاں پناہ غلام کو معاف کریں! میں ابھی تک اس بڈّھے سے ایک لفظ بھی معلوم نہیں کر سکا۔۔۔ بس، وہ تو بُت کی طرح گونگا ہے۔“

”لیکن کیا تم نے اس کو اذیّت پہنچانے کی کوشش کی؟“

”ہاں، ہاں، خداوندِ نعمت! پرسوں میں نے اس کے جوڑوں کو کس دیا، کل میں نے گرم چمٹی سے اس کے دانت ہلانے میں سارا زور صرف کیا۔“

”دانت ہلانا بڑی اچھی اذیّت ہے۔“ امیر نے تصدیق کی۔ ”حالانکہ یہ عجیب بات ہے کہ وہ خاموش ہے۔ کیا میں کوئی۔۔۔ اور تجربے کار جلّاد تمہاری مدد کے لیے بھیجوں؟“

"نہیں، حضورِ والا اس فکر کی زحمت نہ کریں۔ کل میں ایک نئی اذیّت آزماؤں گا۔ کل میں بُڈّھے کی زبان اور مسوڑھے ایک لال انگارہ برمے سے چھیدوں گا۔"

"ٹھہرو! ٹھہرو!" امیر نے زور سے کہا۔ اس کا چہرہ یکایک خوشی سے چمک اٹھا۔ "بھلا وہ تمھیں اپنا نام کیسے بتائے گا اگر تم نے اس کی زبان جلتے ہوئے برمے سے چھید دی! مولانا حسین! تم نے اس کی بابت کبھی نہیں سوچا تھا، ہے نا، اور ہم نے، امیر اعظم نے فوراً سوچ لیا اور تم کو ایک زبردست غلطی کا مرتکب ہونے سے بچا لیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ تم دانائے بے نظیر ہو، ہماری عقل و فراست تم سے کہیں زیادہ ہے، جیسا کہ تم نے ابھی ابھی دیکھا۔"

وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ مسرّت میں سرشار اس نے درباریوں کو فوراً طلب کیا۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو اس نے اعلان کیا کہ اس دن وہ

مولانا حسین سے عقل و دانش میں سبقت لے گیا ہے اور ایسی غلطی سے بچالی ہے جو دانا کرنے ہی والا تھا۔

درباری واقعہ نویس نے آنے والی نسلوں کے لیے امیر کے ایک ایک لفظ کو بڑی محنت سے لکھ لیا۔

اس دن سے امیر کے دل میں رشک و حسد نہیں رہا۔

اس طرح ایک اتفاقیہ غلطی نے خواجہ نصر الدّین کے دُشمنوں کی عیّارانہ سازشوں کو ناکام بنادیا۔

لیکن رات کی تنہائی میں ان کی پریشانی زیادہ بڑھنے لگی۔ پورا چاند شہر بخارا پر بلند ہو چکا تھا۔ بے شمار میناروں کے سروں پر روغن دار کھپرے چمک رہے تھے اور پتھر کی زبردست بنیادیں ایک نیلگوں دُھندلکے میں مستور تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ چھتوں پر تو خنک تھی لیکن نیچے جہاں زمین اور دھوپ سے جلتی ہوئی دیواروں کو ٹھنڈا ہونے کے لیے کافی

وقت نہیں ملا تھا یہی ہوا گھٹن پیدا کر رہی تھی۔ سب چیزوں پر نیند چھائی ہوئی تھی، محل، مسجدوں اور جھونپڑیوں پر۔ صرف اُلّو اپنی تیز چیخوں سے اس مقدس شہر کے امن و سکوت میں خلل انداز ہو رہے تھے۔

خواجہ نصرالدّین کھلی کھڑکی پر بیٹھے تھے۔ ان کا دل یہ کہتا تھا کہ گُل جان بھی نہ سوئی ہو گی اور انہی کے بارے میں سوچ رہی ہو گی۔ شاید اس وقت وہ دونوں ایک ہی مینار کو دیکھ رہے ہوں لیکن ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہ دیواروں، سلاخوں، خواجہ سراؤں اور مُغلانیوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جُدا تھے۔ خواجہ نصرالدّین محل میں تو آ گئے تھے لیکن ابھی حرم تک پہنچ نہیں ہوئی تھی جس کا موقع قسمت ہی سے مل سکتا تھا۔ وہ ان تھک اس موقع کے بارے میں سوچتے رہتے لیکن سب بے سُود ہوتا! وہ گُل جان کو کوئی پیغام تک نہ بھیج سکے تھے۔ وہ کھڑکی میں بیٹھے ہوا کو چوم کر یہ کہہ رہے تھے:

”تیرے لیے تو یہ بہت آسان ہے! آہستہ سے اس کی کھڑکی کے اندر جا کر اُس کے ہونٹ چوم لے۔ گُل جان کو میرا بوسہ اور پیام پہنچا! اسے بتا کہ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔ اس سے کہہ کہ میں اسے نجات دلاؤں گا۔“

لیکن ہوا خواجہ نصرالدّین کو غم میں ڈوبا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

پھر حسبِ معمول ایک اور دن کاموں اور فکروں کے ساتھ شروع ہو جاتا۔ پھر خواجہ نصرالدّین کو دربار میں حاضر ہونا پڑتا۔ امیر کی آمد کا انتظار کرنا ہوتا، درباریوں کی چاپلوسیاں سُننا پڑتیں، بختیار کی عیّارانہ سازشوں کو سمجھنا اور اس کی خفیہ زہریلی نگاہوں کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ پھر امیر کے سامنے جھکنا پڑتا، اس کے قصیدے پڑھنے پڑتے اور اس کے بعد امیر کے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں رہ کر، اس کے پھولے اور مسخ چہرے سے نفرت کے باوجود، اس کی احمقانہ باتوں کو غور سے سننا پڑتا اور اس کو ستاروں کی گردش کے بارے میں بتانا پڑتا۔ خواجہ نصر

الدّین ان باتوں سے اتنے تنگ آ چکے تھے کہ وہ کوئی نئی بات نہ کہتے اور ہر چیز کی خواہ وہ امیر کا درد ہو یا فصل کی خشک سالی اور غلّے کی گرانی ایک ہی الفاظ میں اور ایک ہی ستاروں کے جھرمٹ سے تاویل کر دیتے۔ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں کہتے:

"سعد الذبیح کے ستارے جھرمٹ قوس کے خلاف ہیں جبکہ سیّارہ عطارد اب جھرمٹ عقرب کے بائیں طرف آ گیا ہے۔ امیر کو کل رات نیند نہ آنے کی وجہ یہ ہے۔"

"سعد الذبیح کے ستارے سیّارہ عطارد کے خلاف ہیں جبکہ۔۔۔ مجھے یہ یاد رکھنا چاہیے۔۔۔ مولانا حسین اس کو دہراؤ۔"

بہرحال امیر اعظم کے ہاں حافظے کا فقدان تھا۔

دوسرے دن پھر اسی پر نئے سِرے سے بات چیت شروع ہوتی:

"امیر اعظم، پہاڑی علاقوں میں مویشیوں کی ہلاکت کو سبب یہ ہے کہ سعد الذبیح کے ستارے جھرمٹ قوس سے مطابقت کر رہے ہیں جبکہ عطارد عقرب کے خلاف ہیں۔"

"اچھا تو سعد الذبیح کے ستارے۔" امیر کہتا۔ "مجھے یہ یاد رکھنا چاہیے۔"

"اللہ اکبر! کتنا احمق ہے یہ!" خواجہ نصر الدّین عاجز ہو کر سوچتے۔ "یہ تو میرے سابق مالکان سے بھی زیادہ گدھا ہے! میں تو اس سے تنگ آ گیا۔ نہیں معلوم مجھے اس محل سے کب نجات ملے گی!"

اس دوران میں امیر کوئی اور موضوع چھیڑ دیتا:

"مولانا حسین، ہماری سلطنت میں امن و امان کا دور دورہ ہے۔ اب خواجہ نصر الدّین کی کوئی خبر نہیں آتی۔ وہ کہاں چلا گیا؟ وہ کیوں خاموش ہے؟ ہمیں یہ بتاؤ۔"

"شہنشاہ معظم، مرکز عالم! سعد الذبیح کے ستارے۔۔۔" خواجہ نصر الدّین نے اکتائی اور تھکی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا اور وہ سب باتیں دہرا ڈالیں جو پہلے نجانے کتنی بار کہہ چکے تھے۔ "اور اس کے علاوہ، امیر معظم، یہ بد معاش خواجہ نصر الدّین بغداد جا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ اس نے میری عقل و دانش کی شہرت سنی ہو گی اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں بخارا آ گیا ہوں تو وہ خوف وہراس سے پوشیدہ ہو گیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کو آسانی سے گرفتار کر سکتا ہوں۔"

"اس کو گرفتار کر سکتے ہو؟ یہ تو بہت اچھا رہے گا! لیکن تم یہ کام کیسے کرنے والے ہو؟"

"اس کے لیے میں سعد الذبیح کے ستاروں اور سیّارہ مشتری کے قران السعدین کا انتظار کروں گا۔"

"سیارہ مستری کے ساتھ۔" امیر نے دہرایا۔ "مجھے یہ یاد رکھنا چاہیے۔ مولانا، جانتے ہو کل رات میرے دماغ میں ایک لاجواب خیال آیا ہے۔

ہم نے سوچا کہ بختیار کو بر طرف کر کے اس کی جگہ پر تم کو وزیر اعظم مقرّر کیا جائے۔"

خواجہ نصر الدّین کو امیر کے سامنے جھک کر اس کی تعریف کرنی پڑی اور شکریہ ادا کرنا پڑا اور یہ وضاحت کرنی پڑی کہ فی الحال سعد الذبیح کر ستارے وزیروں میں کسی تبدیلی کے لیے ناساز گار ہیں۔

"جلدی جلدی بھاگو یہاں سے!" خواجہ نصر الدّین نے سوچا۔

اس طرح محل میں ان کی زندگی خوشیوں سے خالی اور اداس گزر رہی تھی۔ وہ بازار، بھیڑ بھکڑ، چائے خانوں اور دھوئیں بھرے باورچی خانوں کے لیے بے تاب تھے۔ وہ امیر کے پورے لذیذ دستر خوان کو لات مار کر بھیڑ کے پایوں کے گرم گرم پیاز کٹے خوب چٹ پٹے شوربے کے پیالے یا بھیڑ کی سخت بوٹیوں کے سستے بازاری پلاؤ کو خوشی سے ترجیح دیتے۔ خوشامد اور تعریف کی جگہ وہ سیدھی سادی بات چیت اور زندہ

دلانہ قہقہے سننے کے لیے اپنے زر تار لباس کا تبادلہ چیتھڑوں سے کر سکتے تھے۔

لیکن قسمت کو خواجہ کی آزمائش منظور تھی اس لیے وہ ساز گار موقع نہیں ہاتھ آرہا تھا جس کا مدّتوں سے انتظار تھا۔ اس دوران امیر برابر یہ پوچھتا رہتا کہ آخر کب ستارے اس کو اپنی نئی داشتہ کا نقاب الٹنے کی اجازت دیں گے۔

۲۸

ایک دن امیر نے خواجہ نصر الدّین کو بے وقت طلب کر لیا۔ صُبح کا تڑکا تھا، محل سویا ہوا تھا، فوّارے کلبلا رہے تھے اور قمریاں کُو کُو کر کے اپنے پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"اس کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟" خواجہ نصر الدّین نے شاہی کمرے کی طرف جانے والے یشب کے زینوں پر چڑھتے ہوئے سوچا۔

خواجہ کی مڈ بھیڑ بختیار سے ہوئی جو خوابگاہ سے نکل کر چپکے سے سائے کی طرح غائب ہو گیا۔ انہوں نے بلا رُکے ہوئے صاحب سلامت کی۔

خواجہ نصر الدّین تاڑ گئے کہ کچھ سازش ہے اور پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگے۔

خوابگاہ میں خواجہ سراؤں کا داروغہ موجود تھا۔ حضور عصمت مآب شاہی بستر کے پاس پٹ پڑے ہوئے بُری طرح کراہ رہے تھے۔ سونے سے منڈھے ہوئے پام کے ایک بید کے ٹکڑے ٹوٹے ہوئے ان کے پاس قالین پر بکھرے ہوئے تھے۔

مخمل کے بھاری پردوں نے خوابگاہ میں صُبح کی تازہ ہوا، سورج کی شعاعیں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ کو آنے سے روک رکھا تھا۔ کمرے میں ایک ٹھوس سونے کے لیمپ کی دھیمی روشنی تھی جو سونے کا ہونے کے باوجود معمولی مٹّی کے چراغ کی طرح دھواں اور بُو دے رہا تھا۔ ایک کونے میں نقشی عود دان سے بڑی بھینی بھینی تیز خوشبو نکل رہی تھی لیکن وہ بھیڑ کی چربی کی بُو کو نہیں دُور کر سکی تھی۔ خوابگاہ کی فضا اتنی بھاری تھی کہ خواجہ نصر الدّین کی ناک میں کھجلی ہونے لگی اور گلا گھٹنے سا لگا۔

امیر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بال دار پیر ریشمی لحاف سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ خواجہ نصر الدّین نے دیکھا کہ شاہ کی ایڑیاں ایسی زرد تھیں جیسے اس نے ان کو اکثر اپنے ہندی عود دان کے اوپر سینکا ہو۔

"مولانا حسین ہم سخت پریشان ہیں۔" امیر نے کہا۔ "اور ہمارے خواجہ سراؤں کا داروغہ جس کو تم یہاں دیکھتے ہو اس کا سبب ہے۔"

"شہنشاہ معظم!" خواجہ نصر الدّین نے زور سے کہا لیکن اندر سے برف ہو گئے۔ "اس کی یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"ارے، نہیں!" امیر نے تیوری چڑھا کر ہاتھ جھٹکا۔ "وہ کیسے کر سکتا تھا جبکہ ہم نے حسبِ معمول اپنی فراست و دانائی سے ہر چیز پہلے سے دیکھ لی اور اس کو خواجہ سراؤں کا داروغہ مقرّر کرنے سے پہلے ہر بات اچھی طرح جانچ لی تھی۔ نہیں، نہیں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں آج یہ معلوم ہوا کہ یہ بدمعاش، ہمارے خواجہ سراؤں کا داروغہ، اس

بات کو بھول گیا کہ ہم نے اس کو ہم نے اپنی سلطنت میں ایک بہت ہی اونچا منصب عطا کیا ہے اور اپنے فرائض سے غفلت برتنے لگا۔"

"اس بات سے فائدہ اٹھا کر کہ ہم آج کل اپنی داشتاؤں کے پاس نہیں جا رہے ہیں اس نے تین دن حرم سے غائب رہ کر حشیش پینے کی لت میں مست رہنے کی جرأت کی۔ حرم کا نظم و نسق بگڑ گیا۔ ہماری داشتائیں بے مہار ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے، ایک دوسرے کا مُنہ اور بال نوچنے لگیں۔ اس سے ہمارا کافی نقصان ہوا کیونکہ ہماری نگاہ میں وہ عورت حسین نہیں ہو سکتی جس کے چہرے پر کھرونچے ہوں اور سر کے کافی بال غائب ہو چکے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات نے ہم کو رنج و غم میں غرق کر دیا ہے۔ ہماری نئی داشتہ بیمار پڑ گئی ہے اور تین دن سے کھانا نہیں کھا رہی ہے۔"

خواجہ نصر الدّین چونک پڑے لیکن امیر نے ان کو اشارے سے روکا:

"رکو، ابھی ہم نے بات ختم نہیں کی ہے۔ وہ بیمار پڑ گئی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اپنی جان ہی گنوا بیٹھے۔ اگر ہم اس کے پاس صرف ایک ہی بار گئے ہوتے تو ہم کو اس کی بیماری، حتیٰ کہ اس کی موت کا بھی اتنا غم نہ ہوتا۔ لیکن تم سمجھ سکتے ہو، مولانا حسین، کہ موجودہ حالت میں ہم کس قدر ناراض ہیں۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔" امیر نے اپنی آواز بُلند کر دی "کہ مزید کوفتوں اور فکروں سے بچنے کے لیے ہم اس حشیش پینے والے بدمعاش، پاجی کو برطرف کر دیں، اس کو اپنی عنایات سے محروم کر دیں اور اس کو دو سو دُرّے لگوائیں۔ جہاں تک تمہارا تعلّق ہے، مولانا حسین، ہم نے اس کے برعکس فیصلہ کیا ہے کہ تم پر عنایت کرتے ہوئے اپنے حرم میں خواجہ سراؤں کے داروغہ کے عہدے پر فائز کریں۔"

خواجہ نصرالدّین کو محسوس ہوا جیسے ان کے پیر سن ہو گئے ہیں، ان کی سانس گلے ہی میں رک گئی ہے اور ان کے پیٹ کے اندر کسی نے برف کی سل رکھ دی ہے۔

امیر نے تیوری چڑھا کر دھمکی آمیز لہجے میں دریافت کیا:

"مولانا حسین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہم سے بحث کرنے پر تُلے ہو۔ کیا ایسا ہے کہ تم بیکار اور وقتی خوشیوں کو مابدولت کی خدمت کرنے کی عظیم مسرت پر ترجیح دیتے ہو؟"

خواجہ نصر الدّین نے اب تک اپنے کو سنبھال لیا تھا۔ وہ بہت جھک کر تعظیم بجالائے اور بولے:

"خدا ہمارے مہربان بادشاہ کو سلامت رکھے۔ مجھ پر امیر کی عنایات بے انتہا ہیں۔ شہنشاہ معظم میں اپنی رعایا کے انتہائی خفیہ اور اندرونی آرزوؤں کو معلوم کرنے کی معجزنما خوبی ہے۔ اس طرح وہ اپنی رعایا پر متواتر اکرام کی بارش کرتے رہتے ہیں۔ میں نے، اس ناچیز نے اکثر یہ تمنّا کی ہے کہ اس کاہل اور بیوقوف آدمی کی جگہ حاصل کروں جو منصفانہ سزا پانے کے بعد جس کا وہ خود سبب بنا ہے قالین پر پڑا کراہ رہا ہے اور فریاد

کر رہا ہے۔ کتنی بار یہ خواہش میرے دل میں آئی لیکن میں نے امیر سے عرض نہیں کیا۔ لیکن اب خود شہنشاہ اعظم نے فرمایا۔"

"تو پھر دیر کیوں ہو؟" امیر نے خوش ہو کر دوستانہ انداز میں ان کی بات کاٹ دی۔ "ہم حکیم کو طلب کرتے ہیں۔ وہ اپنے چاقو ساتھ لائے گا اور تم اس کے ساتھ تنہا جگہ میں چلے جاؤ گے۔ اس دوران میں ہم بختیار کو حکم دیں گے کہ وہ تم کو خواجہ سراؤں کا داروغہ مقرر کرنے کا فرمان تیار کر لے۔ ارے!" اس نے زور سے کہا اور تالی بجائی۔

"حضورِ اعلیٰ میری حقیر بات بھی سُن لیں۔" خواجہ نصر الدّین نے ہراساں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "میں بڑی خوشی کے ساتھ حکیم کے ساتھ فوراً کسی تخلیے کی جگہ جانے کو تیّار ہوں لیکن صرف حضور کی سلامتی کی فکر مجھے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اس عمل کے بعد مجھے کئی دن تک صاحبِ فراش رہنا پڑے گا۔ اس دوران میں نئی داشتہ مر سکتی ہے اور پھر امیر کے دل پر غم کے سیاہ بادل چھا جائیں

گے جس کا خیال ہی ان کے غلام کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ پہلے داشتہ صحت مند ہو جائے اس کے بعد میں حکیم کے پاس جاؤں اور خواجہ سراؤں کے داروغہ کے منصب کے لیے تیّاری کروں۔"

"ہونہہ۔" امیر خواجہ نصر الدّین کی طرف بے اعتباری سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"آقا، اس نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

"ہونہہ۔" امیر نے دھرایا۔ پھر وہ کراہتے ہوئے خواجہ سرا کی طرف مڑ گیا "ارے، کمبخت مکڑی کے بچّے جواب دے، کیا ہماری نئی داشتہ بہت بیمار ہے، کیا اس کی جان کا خطرہ ہے؟"

خواجہ نصر الدّین بڑی بے چینی سے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا۔

خواجہ سرا نے کہا:

"شہنشاہ معظم، وہ ہلال کی طرح دبلی اور زرد ہو گئی ہے۔ اس کا چہرہ مومی ہو گیا ہے اور انگلیاں ٹھنڈی پڑ گئی ہیں۔ مغلانیاں کہتی ہیں کہ یہ بہت بُری علامتیں ہیں۔۔۔"

امیر سوچ میں پڑ گیا۔ خواجہ نصر الدّین تاریکی میں ہٹ گئے۔ وہ خواب گاہ کی اس دھواں دھواں سی نیم تاریکی کے شکر گزار تھے جس نے ان کے چہرے کی زردی چھپالی تھی۔

"ہاں!" آخر کار امیر بولا۔ "اگر ایسا ہے تو ممکن ہے کہ وہ مر جائے اور اس سے ہمیں بڑا رنج ہو گا۔ لیکن کیا تمہیں یقین ہے، مولانا حسین، کہ تم اس کو شفایاب کر سکو گے؟"

"بادشاہ سلامت جانتے ہیں کہ بخارا اور بغداد کے درمیان میرا جیسا کوئی حکیم نہیں ہے۔"

"جاؤ، مولانا، اس کے لیے دوا تیّار کرو۔"

"بادشاہ سلامت، پہلے مجھے اس کی بیماری معلوم کرنی ہو گی۔ مجھے اسے دیکھنا چاہیے۔"

"اسے دیکھنا چاہیے؟" امیر نے حقارت سے ہنس کر کہا۔

"مولانا حسین، جب تم خواجہ سراؤں کے داروغہ ہو جاؤ گے تو تم کو اسے دیکھنے کے لیے کافی وقت ملے گا۔"

"اعلیٰ حضرت!" خواجہ نصر الدّین زمین تک جھک گئے۔ "مجھے ضرور۔۔۔"

"ذلیل غلام!" امیر چیخا۔ "کیا تو نہیں جانتا کہ ہماری داشتاؤں کے چہرے پر کسی آدمی نگاہ پڑنے کا انجام اس کی اندوہناک موت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں، اعلیٰ حضرت!" خواجہ نصرالدّین نے جواب دیا۔ "لیکن میرا مطلب اس کے چہرے سے نہ تھا۔ میں اس کے چہرے کو دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا۔ میرے لیے تو صرف اس کا ہاتھ دیکھنا کافی ہو گا کیونکہ میں اپنے پیشے میں کافی ماہر ہوں اور میں ہر بیماری کی تشخیص ناخنوں کا رنگ دیکھ کر کر سکتا ہوں۔"

"اس کا ہاتھ؟" امیر نے دہرایا۔ "تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا تاکہ ہمیں غصّہ نہ آتا؟ اس کا ہاتھ؟ ہاں، یہ ممکن ہے۔ ہم تمہارے ساتھ حرم میں چلیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ کسی عورت کا ہاتھ دیکھنا ہمارے لیے نقصان کا باعث نہ ہو گا۔"

"اس کے ہاتھ پر نگاہ ڈالنے سے اعلیٰ حضرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" خواجہ نصرالدّین نے جواب دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ چونکہ وہ گُل جان سے کبھی تنہا نہیں مل سکیں گے کسی نہ کسی کی موجودگی

لازمی ہے۔ اس لیے اگر وہ آدمی امیر خود ہی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اس طرح امیر کو شک بھی نہ ہو گا۔

۲۹

اتنے دن انتظار میں بیکار گزارنے کے بعد بالآخر حرم کے دروازے خواجہ نصرالدّین پر کھل گئے۔

پہرے دار تعظیم بجالاتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ خواجہ نصرالدّین امیر کے پیچھے ایک پتھر کے زینے پر چڑھے اور پھر ایک چھوٹے دروازے کے ذریعہ حسین باغ میں آ گئے۔ یہاں گلاب اور سوسن و سنبل کے تختے کھلے تھے اور ان کے درمیان سنگِ مرمر اور سنگِ اسود کے حوضوں میں فوّارے اُچھل رہے تھے۔ ان پر پانی کی ایک لطیف چادر

سی پھیلی ہوئی تھی۔ پھولوں اور گھاس پر صُبح کی شبنم چمک اور تھِرک رہی تھی۔

خواجہ نصر الدّین کا ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ خواجہ سرا نے اخروٹ کا نقشیں دروازہ کھول دیا۔ مشک و عنبر اور گلاب کے عطر کا ایک زور دار بھبکا اندر کے پُراسرار حصّے سے آیا۔ یہ تھا حرم، امیر کے حسین قیدیوں کی غم انگیز رہائش گاہ۔

خواجہ نصر الدّین نے ایک ایک کونے، گزر گاہ اور موڑ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تا کہ جب وہ فیصلہ کن لمحہ آئے تو راستہ نہ بھولیں کیونکہ اس کا مطلب اپنی گُل جان دونوں کی موت تھا۔

"دائیں طرف۔" انہوں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ "پھر بائیں۔ یہاں ایک زینہ ہے جس پر ایک بڈّھی عورت پہرہ دے رہی ہے۔ اب پھر بائیں کو۔۔۔"

گزر گاہوں میں بہت مدہم روشنی تھی جو نیلے، سبز اور گلابی چینی شیشوں سے چھِن چھِن کر آرہی تھی۔ خواجہ سرا ایک تنگ سے دروازے کے پاس رُک گیا:

"آقا، وہ یہاں ہے۔"

خواجہ نصرالدّین نے امیر کے پیچھے اس چوکھٹ کو پار کیا جو ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تھی۔

چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواریں اور فرش قالین سے ڈھکے ہوئے تھے۔ طاقچوں میں سیپ کے ڈبّے رکھے تھے جن میں کنگن، بالیاں اور ہار بھرے ہوئے تھے اور دیوار پر ایک چاندی کے فریم کا آئینہ تھا۔ بے چاری گُل جان نے تو یہ زر و جواہر خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے! خواجہ نصرالدّین کی نگاہ اس کی موتیوں سے مرصع چھوٹی سی جوتیوں پر پڑی اور وہ کانپ گئے۔ گُل جان نے اُن کے تلے گھس دیے تھے۔ اُن کو اپنے جذبات کا گلا گھونٹنے کے لیے اپنی تمام قوّتِ ارادی سے کام لینا پڑا۔

خواجہ سرا نے ایک کونے میں ریشمی پردے کی طرف اشارہ کیا۔ گُل جان وہاں لیٹی تھی۔

"وہ سو رہی ہے۔" خواجہ سرا نے سرگوشی میں کہا۔

خواجہ نصر الدّین کے اندر ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ ان کی محبوبہ اتنی قریب تھی۔ "اپنے دل کو فولاد کا بنا لو، سب جھیل جاؤ، خواجہ نصر الدّین!" انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

جب وہ پردے کے قریب گئے تو انہوں نے سوتی ہوئی گُل جان کی سانس لینے کی آواز سُنی۔ مسہری کے سرہانے کی طرف ریشمی کپڑا آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ خواجہ نصر الدّین کو ایسا لگا جیسے کسی کی آہنی گرفت نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے، ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان کی سانس پھول گئی۔

"مولانا حسین، تم اس قدر سُست کیوں پڑ گئے؟" امیر نے پوچھا۔

"اعلیٰ حضرت، میں اس کی سانس کی آواز سُن رہا ہوں۔ میں اس پردے کے پیچھے سے آپ کی خاتون کے دل کی حرکت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام گُل جان ہے۔" امیر نے کہا۔

"گُل جان!" خواجہ نصر الدّین نے نرمی سے پکارا۔

مسہری کے سرے پر پردے کی حرکت اچانک رُک گئی۔ گُل جان جاگ اُٹھی تھی اور بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اس کو یہ یقین نہیں تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے یا وہ واقعی اپنے محبوب کی آواز سُن رہی ہے۔

"گُل جان!" خواجہ نصر الدّین نے پکارا۔ گُل جان کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن خواجہ نصر الدّین نے تیزی سے کہا:

"میرا نام مولانا حسین ہے۔ میں نیا دانا، نجومی اور حکیم ہوں جو بغداد سے امیر کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ تم سمجھیں نا، گُل جان۔ میں ہوں نیا دانا، نجومی اور حکیم مولانا حسین۔"

"کسی وجہ سے وہ میری آواز سُن کے ڈر گئی۔ غالباً اعلیٰ حضرت کی غیر موجودگی میں یہ خواجہ سرا اس کے ساتھ سختی سے پیش آیا ہے۔"

امیر نے خواجہ سرا کو گھور کر دیکھا جو اپنی صفائی دینے کے لیے آواز نکالے بغیر کانپ کر زمین تک جھک گیا۔

"گُل جان، تمہارے لیے خطرہ ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں بچا لوں گا۔ تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے کیونکہ میرا فن ہر چیز پر قابو پا سکتا ہے۔"

"میں تمہاری بات سُن رہی ہوں، مولانا حسین، بغداد کے حکیم۔ میں تم کو جانتی ہوں اور تم پر اعتماد کرتی ہوں اور یہ میں بادشاہ سلامت کے حضور

میں کہتی ہوں جن کے قدم میں پردے کی درازوں سے دیکھ رہی ہوں۔"

یہ لحاظ رکھتے ہوئے کہ امیر کی موجودگی میں ان کے لیے باوقار اور عالمانہ رویہ اختیار کرنا لازمی تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے درشتی سے کہا:

"مجھے اپنا ہاتھ دو تاکہ میں ناخنوں کے رنگ سے تمہاری بیماری کی تشخیص کر سکوں۔"

ریشمی پردہ ہلا اور بیچ سے کھُل گیا۔ خواجہ نصر الدّین نے نرمی سے گُل جان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس کو دبا کر ہی اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے۔ گُل جان نے بھی ہلکے سے اُن کا ہاتھ دبا کر جواب دیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پلٹا اور بڑی دیر تک غور سے ہتھیلی کو دیکھتے رہے۔ "کتنی دُبلی ہو گئی ہے۔" ان کے دل میں ایک ٹیس اُٹھی۔ امیر ان کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ اس کی سانس خواجہ کے کان میں لگ رہی تھی۔ خواجہ نصر الدّین نے اس کو گُل جان کی چھنگلیا کا ناخن دکھا کر اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے کوئی

خطرہ ہو۔ حالانکہ یہ ناخن بھی دوسرے ناخنوں کی طرح تھا لیکن امیر کو اس میں کوئی خرابی معلوم ہوئی اور اس نے اپنے ہونٹ چبا کر خواجہ نصر الدّین کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

"تمہارے درد کہاں ہوتا ہے؟" خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔

"دل میں۔" گُل جان نے آہ بھر کر جواب دیا۔ "میرا دل غمگین اور اداس ہے۔"

"تمہارے غم کا سبب کیا ہے؟"

"میں اپنے محبوب سے جدا ہوں۔"

خواجہ نصر الدّین نے چپکے سے امیر سے کہا:

"وہ اعلیٰ حضرت سے جدائی کی وجہ سے بیمار ہے۔"

امیر کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس کی سانس اور تیز ہو گئی۔

"میں اپنے محبوب سے جدا ہوں۔" گُل جان نے کہا۔ "اور اب میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا محبوب مجھ سے قریب ہے لیکن نہ تو میں اس کو چوم سکتی ہوں اور نہ اس سے بغل گیر ہو سکتی ہوں۔ ارے وہ دن کب آئے گا جب وہ مجھ سے بغل گیر ہو گا اور مجھے اپنے آغوش میں لے گا۔"

"اللہ اکبر!" خواجہ نصر الدّین نے مصنوعی حیرت سے کے ساتھ کہا۔ "اعلیٰ حضرت نے اس مختصر مدّت میں عشق کا کیسا شعلہ اس کے اندر روشن کر دیا ہے!"

امیر خوشی سے بد مست ہو گیا۔ وہ نچلا نہ رہ سکا اور ٹہلنے لگا۔ ساتھ ہی مُنہ پر ہاتھ رکھ کر ہی ہی کر رہا تھا۔

"گُل جان!" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "اطمینان رکھو، جس سے تم محبّت کرتی ہو وہ تمہاری باتیں سُن رہا ہے!"

صراحی کے قلقل کی طرح پردے کے پیچھے سے ہنسنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ خواجہ نصرالدّین نے اپنی بات جاری رکھی:

"تمہارے لیے خطرہ ہے، گُل جان، لیکن ڈرو نہیں۔ میں مشہور دانا، نجومی اور حکیم مولانا حسین، تم کو بچالوں گا۔"

"یہ تم کو بچالیں گے!" امیر نے خوشی کے ساتھ دہرایا۔ "یہ تم کو قطعی بچا لیں گے!"

"اعلیٰ حضرت نے جو کچھ کہا تم نے سُنا؟" خواجہ نصرالدّین نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں تم کو خطرے سے نجات دلاؤں گا۔ تمہاری مسرّتوں کا دن اب قریب ہے۔ فی الحال بادشاہ سلامت تمہارے پاس نہیں آسکتے کیونکہ میں نے ان کو ستاروں کے اس حکم سے آگاہ کر دیا ہے کہ ان کو عورت کی نقاب نہ چھونا چاہیے۔ لیکن ستاروں کا مقام بدل رہا ہے، تم سمجھتی ہو نہ گُل جان؟ جلد ہی ستارے راس آئیں گے اور تم اپنے محبوب سے ہم آغوش ہو سکو گی۔ جس دن میں تم کو

دوا بھیجوں گا اس کے ایک دن بعد تمہاری مسرت کا دن آئے گا۔ تم سمجھتی ہونا، گُل جان۔ دوا ملنے پر تم کو تیّار ہو جانا چاہیے!"

"تمہارا بہت بہت شکریہ، مولانا حسین!" گُل جان نے خوشی سے ہنستے اور روتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارا شکریہ، لا جواب اور دانا حکیم! میرا محبوب قریب ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ ہمارے دل ایک ساتھ مل کر دھڑک رہے ہیں۔"

امیر اور خواجہ نصر الدّین باہر نکلے۔ خواجہ سراؤں کا داروغہ دروازے پر آ کر اُن سے ملا۔

"آقا!" وہ گھٹنوں کے بل گر کر چلّایا۔ "سچ مچ دنیا نے ایسا ماہر حکیم کبھی نہیں دیکھا ہے۔ تین دن سے وہ بے حس و حرکت پڑی تھی اور اب اچانک اس نے اپنی مسہری چھوڑ دی ہے، وہ گا رہی ہے، ہنس اور ناچ رہی ہے اور جب میں اس کے قریب گیا تو اس نے میرے کان پر ایک مکہ بھی عنایت فرمایا۔"

"یہ ہے میری گُل جان۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا۔ "وہ ہمیشہ ہاتھ کی تیز تھی۔"

ناشتے پر امیر نے تمام درباریوں پر عنایات کی بارش کر دی۔ خواجہ نصر الدّین کو دو تھیلیاں عطا ہوئیں۔ بڑی تھیلی چاندی کے سکوں سے بھری تھی اور چھوٹی میں طلائی سکے تھے۔

"ہم نے کیا جذبات اُکسا دیے ہیں!" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ "تمھیں ماننا پڑے گا، مولانا حسین کہ تم نے ایسی لگن کم ہی دیکھی ہو گی۔ اس کی آواز کیسی کانپ رہی تھی، کیسی وہ رو اور ہنس رہی تھی۔ لیکن یہ تو اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو تم خواجہ سراؤں کے داروغہ کا منصب سنبھالنے کے بعد دیکھو گے۔"

مؤدب درباریوں کی صفوں میں کچھ سرگوشی ہوئی۔ بختیار کینہ آمیز انداز میں مُسکرایا۔ اب خواجہ نصر الدّین کو پتہ چلا کہ اس کو خواجہ سراؤں کا داروغہ بنانے کی بات کس نے امیر کو سمجھائی ہے۔

"اب وہ صحت یاب ہو گئی ہے۔" امیر نے کہا۔ "اور اب تمہاری تقرّری کو ملتوی رکھنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اب ہمارے ساتھ چائے پیو اور اس کے بعد تم حکیم کے پاس جا سکتے ہو۔ ارے سننا۔" وہ حکیم کی طرف مڑا اور حکم دیا۔ "جاؤ اپنے نشتر لاؤ۔ بختیار فرمان لاؤ۔"

خواجہ نصر الدّین کے گلے میں گرم چائے اٹک گئی اور وہ کھانسنے لگے۔ بختیار تیّار شدہ فرمان لے کر آگے بڑھا۔ وہ انتقامانہ مسرّت سے سرشار تھا۔ امیر کے سامنے قلم حاضر کیا گیا اور اس نے دستخط کر کے فرمان بختیار کو واپس کر دیا۔ بختیار نے جلدی سے اس پر مہر لگائی۔ یہ سب کام چٹکی بجاتے ہو گیا۔

"لائق اور عقلمند مولانا حسین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرطِ مسرّت سے تمہارے ہونٹوں پر مہر لگ گئی ہے۔" بختیار نے فاتحانہ مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بہر حال آداب کا تقاضا یہ ہے کہ تم امیر کا شکریہ ادا کرو۔"

خواجہ نصر الدّین تخت کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئے۔

"آخرکار میری دِلی تمنّا بَر آئی۔" انہوں نے کہا۔ "مجھے اس تاخیر کے لیے بڑا رنج ہے جو امیر کی داشتہ کی دوا تیّار کرنے میں لگے گی۔ ہمیں علاج کو پختہ کر لینا چاہیے ورنہ بیماری پھر اس کے جسم کو ستا سکتی ہے۔"

"کیا دوا کی تیّاری کے لیے اتنے وقت کی ضرورت ہے؟" بختیار نے بے چینی سے سوال کیا۔ "یقیناً وہ آدھ گھنٹے میں تیّار کی جا سکتی ہے۔۔۔"

"بالکل ٹھیک۔" امیر نے تصدیق کی۔ "آدھ گھنٹے کا وقت کافی ہے۔"

"آقا! اس کا انحصار تو سعد الذبیح کے ستاروں پر ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے ترکش کا آخری تیر استعمال کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ان کے محل کے مطابق مجھے دو دن سے پانچ دن تک لگ سکتے ہیں۔"

"پانچ دن!" بختیار نے زور سے کہا۔ "فاضل بزرگ، میں نے تو کبھی کسی دوا کی تیّاری میں پانچ دن لگتے نہیں سُنے۔"

خواجہ نصرالدّین امیر سے مخاطب ہو گئے:

"شاید اعلیٰ حضرت عنایت کر کے اپنی نئی داشتہ کا علاج آئندہ کے لیے میرے نہیں بلکہ وزیر اعظم بختیار کے سپرد کر دیں گے۔ اب وہی اس کا علاج کریں۔ میں اس کی زندگی کی ذمّہ داری نہیں لیتا۔"

"کیا ہوا مولانا، تم کیا کہہ رہے ہو؟" امیر نے گھبرا کر کہا۔ "بختیار دوا علاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور وہ کچھ ایسا ہوشیار بھی نہیں ہے جیسا کہ میں نے تم سے اسی وقت کہا تھا جب تم کو وزیر اعظم کا عہدہ عطا کرنے کی تجویز کی تھی۔"

وزیر اعظم کے جسم میں ہلکی سی جھرجھری دوڑ گئی اور انہوں نے زہر آلود نگاہوں سے خواجہ نصر الدّین کو دیکھا۔

"جاؤ دوا تیّار کرو۔" امیر نے کہا۔ "لیکن پانچ دن بہت ہوئے مولانا، کیا اس سے جلدی نہیں تیّار کر سکتے؟ ہم چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد اپنا عہدہ سنبھال لو۔"

"شہنشاہ معظّم، میں خود بھی مشتاق ہوں!" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "میں جلد از جلد دوا تیّار کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ پچھلے پیروں ہٹتے ہوئے رُخصت ہوئے اور متعدّد بار جھک کر تعظیم بجا لائے۔ بختیار نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دشمن اور حریف کو اتنا صاف جاتے ہوئے دیکھ کر کیسا سلگ رہا ہے۔

"سانپ! مکّار لکڑ بگھے!" خواجہ نصر الدّین نے سوچا اور غصّے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔ "لیکن بختیار تم چوک گئے۔ اب تم میرا بال بھی بیکا نہ کر سکوگے کیونکہ میں نے امیر کے حرم کے تمام راستے، آنے اور جانے کے معلوم کر لیے ہیں جو میں جاننا چاہتا تھا۔ ارے پیاری گُل جان! تم کتنی ہوشیار ہو کہ عین موقع پر بیمار پڑیں اور خواجہ نصر الدّین کو درباری جرّاح کے چاقو سے بچا لیا! حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ تم صرف اپنے ہی بارے میں سوچ رہی تھیں!"

وہ اپنے بُرج کو واپس گئے جس کے سائے میں پہرے دار بیٹھے مزے میں چوسر کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک جو سب کچھ ہار چکا تھا اپنے جوتے داؤ پر لگانے کے لیے اُتار رہا تھا۔ سخت گرمی تھی لیکن بُرج کے اندر اس کی موٹی دیواروں کی وجہ سے کافی خُنکی اور تازگی تھی۔ خواجہ نصر الدّین تنگ زینے سے اُوپر گئے۔

بڈّھے کی صورت بہت وحشیانہ ہو گئی تھی کیونکہ قید کے دوران اس کی داڑھی اور بال بڑھ گئے تھے اور پریشان ہو گئے تھے۔ گھنی بھوؤں کے نیچے سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے خواجہ نصر الدّین پر لعنت کی بوچھار کر دی:

"ارے کمبخت حرام زادے، خدا کرے تیرے سر پر بجلی گرے اور تلوے سے نکلے! ارے بدمعاش، دھوکے باز، جعلئے! تو نے میرا نام، میرا لباس، میرا عمامہ اور پٹکا سب چُرا لیا! خدا کرے تجھے کیڑے مکوڑے زندہ ہڑپ کر جائیں!"

خواجہ نصر الدّین کو اس طرح کی باتوں کی عادت ہو گئی تھی اس لیے وہ ناراض نہیں ہوئے:

"محترم مولانا حسین، میں نے آج آپ کے لیے ایک نئی اذیّت ایجاد فرمائی ہے۔ یعنی ایک رسّی کے پھندے اور ڈنڈے کی مدد سے آپ کا سر دبایا جائے۔ پہرے دار نیچے ہیں۔ آپ اس طرح چلّائیں کہ وہ سُن لیں۔"

سلاخ دار کھڑکی کے پاس جا کر بڈّھے نے یکساں آواز میں چلّانا شروع کیا:

"ارے اللہ! اب تو یہ مصیبتیں برداشت نہیں ہوتیں! ارے میرا سر پھندے اور ڈنڈے سے نہ دباؤ! اس اذیت سے تو موت ہی اچھی ہے!"

"ٹھہرو، ایک منٹ ٹھہرو مولانا حسین!" خواجہ نصر الدّین بیچ میں بولے۔ "تم بڑے اطمینان سے اس طرح چلّا رہے ہو جس کا کسی کو یقین نہ آئے گا۔ یاد رکھو، پہرے دار اِن باتوں میں بڑے مشّاق ہیں۔ اگر اُن کو یہ

خیال ہو گیا کہ تم بن رہے ہو تو وہ تمہارے رپورٹ ارسلان بیک سے کر دیں گے اور تب تم واقعی جلّاد کے ہاتھ میں جا پڑو گے۔ یہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے کہ تم زیادہ زور سے چلّاؤ۔ دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

وہ کھڑکی کے پاس گئے، ایک گہری سانس لی اور اچانک اتنی زور سے چیخے کہ بُڈّھا کانوں میں انگلیاں دے کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ارے حرامزادے کے بچّے!" بُڈّھا چلّایا۔ "میں ایسا گلا کہاں سے لاؤں کہ میری چیخیں شہر کے دوسرے سِرے تک سنائی دیں۔"

"جلّاد کے ہاتھوں سے بچنے کا تمہارے لیے یہی واحد راستہ ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے جواب دیا۔

بڈّھے نے پھر کوشش کی۔ اپنی پوری قوّت لگا دی۔ وہ اس بُری طرح چیخا دھاڑا کہ پہرے داروں نے اس کا لطف لینے کے لیے اپنا کھیل روک دیا۔

بڈھا بُری طرح کھانس کھنکار رہا تھا۔

"ارے، ارے، میرا گلا۔" بڈھا فریاد کرنے لگا۔ "کتنی محنت پڑی ہے۔ اب تُو خوش ہوا، کمبخت بدمعاش؟ خدا تجھے جہنّم واصل کرے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "اور دانائے روزگار مولانا حسین یہ رہا آپ کی کوششوں کا انعام۔"

انہوں نے وہ تھیلیاں نکالیں جو امیر نے اُن کو عطا کی تھیں اور اُن کو ایک کشتی میں اُلٹ کر ساری رقم دو حصّوں میں تقسیم کر دی۔

بُڈّھا صلواتیں سناتا اور بڑبڑاتا رہا۔

"تم مجھے اس طرح بُرا بھلا کیوں کہہ رہے ہو؟" خواجہ نصر الدّین نے بڑے سکون سے پوچھا۔ "کیا میں نے مولانا حسین کا نام کسی طرح نیچا کیا ہے؟ کیا میں نے اُن کے علم و فضل کو ذلیل کیا ہے؟ یہ رقم دیکھ رہے ہو

نا؟ یہ رقم امیر نے مشہور نجومی اور حکیم مولانا حسین کو اپنے حرم کی ایک لڑکی کو شفایاب کرنے کے لیے دی ہے۔"

"تم نے کسی لڑکی کو اچھا کیا ہے؟" بڈّھے نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تمھیں بیماریوں کا کیا پتہ، جاہل، بدمعاش، مکّار!"

"میں بیماریوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا لیکن لڑکیوں کے بارے میں کچھ ضرور جانتا ہوں۔" خواجہ نصرالدّین نے جواب دیا۔ "اس لیے یہ بات معقول ہوگی اگر امیر کا انعام دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصّہ تمہارے علم کے لیے اور دوسرا حصّہ میرے فن کے لیے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، مولانا، کہ میں نے لڑکی کا علاج سرسری طور پر نہیں کیا بلکہ ستاروں کی گردش کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ہے۔ کل رات میں نے دیکھا کہ سعد السعود اور سعد الاجیہ کے ستاروں کا قران ہو رہا ہے اور جھرمٹ عقرب نے جھرمٹ سرطان کی طرف رُخ کر لیا ہے۔"

"کیا، کیا؟" بُڈّھے نے زور سے کہا اور غصّے میں کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ "جاہل کہیں کا، تُو تو صرف گدھے ہانک سکتا ہے! تجھے یہ تک تو پتہ ہے نہیں کہ سعد السعود کے ستاروں کا قران سعد الاجیہ کے ستاروں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو ایک ہی نظامِ فلکی کے ستارے ہیں! اور تمہیں سال کے اس وقت جھرمٹ عقرب دکھائی کہاں سے دیتا ہے؟ میں نے ساری رات ستارہ شماری کی ہے۔ سعد بولا اور السمک کے ستارے قران میں تھے اور الجہبہ کا زوال ہو رہا تھا۔ سُن رہا ہے نا، گدھے؟ عقرب اب آسمان میں نہیں ہے! تو نے سب کچھ گڈ مڈ کر دیا۔ گدھے ہنکانے والا خوامخواہ کو ایسی باتوں میں کود پڑا جو اس کی سمجھ سے بالاتر ہیں! تو غلطی سے الحق کے ستاروں کو جو آج کل البوطن کے ستاروں کے مقابل ہیں عقرب سمجھ بیٹھا!"

غصّے میں آکر، اس نیّت سے کہ خواجہ نصر الدّین کی جہالت کا بھانڈا پھوڑا جائے بُڈّھا بڑی دیر تک ستاروں کے صحیح مقام کے بارے میں بتاتا رہا۔

اس کا سُننے والا ہر ہر لفظ کو بڑی توجّہ سے سُن کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ وہ دوسرے داناؤں کی موجودگی میں امیر سے باتیں کرنے میں غلطی نہ کرے۔

"ارے جاہلوں کے سردار!" بُڈّھا بڑبڑاتا رہا۔ "تجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس وقت چاند کے انیسویں برج پر جس کو الشعلہ کہتے ہیں اور جو قوس رامی پر ہوتا ہے، صرف اُسی برج کے ستاروں سے انسان کی قسمت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے، کسی دوسرے سے نہیں۔ اس واقعہ کو دانائے روزگار شہاب الدینی محمود ابن کراجی نے بڑی وضاحت سے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔۔۔"

"شہاب الدّین محمود ابن کراجی۔" خواجہ نصرالدّین نے اچھی طرح یاد کر لیا۔ "کل میں امیر کی موجودگی میں اس لمبی داڑھی والے دانا کا بھانڈا پھوڑوں گا کہ وہ اس کتاب کے بارے میں لاعلم ہے اور میرے علم و فضل کی عظمت سے اس کا دل دُہل جائے گا اور میں محفوظ ہوں گا۔"

۳۰

جعفر سُود خور کے گھر میں سونے سے بھری ہوئی مہر بند بارہ دیگیں رکھی تھیں لیکن وہ اب کم از کم بیس جمع کرنے کی سوچ رہا تھا۔ قسمت نے اُس کو ایسی شکل و صورت دے کر جس سے اس کی حرص اور بے ایمانی ظاہر ہوتی تھی اس کے عیبوں کو اور عیاں کر دیا تھا۔ یہ عیب اعتبار کرنے والے نا تجربے کار احمقوں کو آگاہ کر دیتے تھے اور نیا شکار پھانسنا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے اس کی دیگیں اس کی خواہش سے کہیں زیادہ سست رفتاری سے بھر رہی تھیں۔

"کاش کہ میرے جسمانی عیب دُور ہو سکتے!" وہ آہ بھر کر کہتا۔ "لوگ میری صورت دیکھ کر تو نہ بھاگتے، مجھ پر شُبہ نہیں اعتبار کرتے۔ اس وقت ان کو دھوکہ دینا کتنا آسان ہوتا اور میری آمدنی کتنی تیزی سے بڑھتی۔"

جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ امیر کے نئے دانا مولانا حسین نے بیماریوں کے علاج میں مہارتِ تامہ دکھائی ہے تو جعفر سُود خور نے ایک ٹوکری میں بیش بہا تحائف بھرے اور محل میں حاضر ہوا۔

ارسلان بیک ٹوکری کا سامان دیکھنے کے بعد بڑی خوشی سے اس کی مدد کے لیے تیّار ہو گیا:

"محترم جعفر، آپ بڑے وقت سے آئے ہیں۔ آج جہاں پناہ بہت محظوظ ہیں اور وہ شاید ہی آپ کی درخواست کو رد کریں۔"

امیر نے سُود خور کی بات سُنی، ہاتھی دانت کے فریم کی شطرنج کی طلائی بساط نذرانے میں قبول فرمائی اور دانا کی طلبی کا حکم دیا۔

"مولانا حسین۔" امیر نے کہا جب خواجہ نصر الدّین آکر اس کے سامنے جھکے۔ "یہ آدمی، جعفر سُود خور، ہمارا وفادار خادم ہے۔ اس نے ہماری بڑی خدمت کی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ تم فوراً اس کا لنگڑا پن، کوبڑ، آنکھ کا جالا اور دوسرے عیب دُور کرو۔"

یہ کہہ کر امیر اس طرح مُڑ گیا جیسے وہ کوئی عذر سُننے کے لیے تیّار نہیں ہے۔ خواجہ نصر الدّین کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ تعظیم بجا لائیں اور چلے جائیں۔ ان کے پیچھے سُود خور بھی اپنا کوبڑ گھسیٹتا ہوا کچھوے کی طرح چلا۔

"ہمیں جلدی کرنی چاہیے، عقلمند مولانا حسین۔" اس نے نقلی داڑھی میں خواجہ نصر الدّین کو نہ پہچانتے ہوئے کہا۔ "ہمیں جلدی کرنی چاہیے کیونکہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا ہے اور میں رات ہونے سے پہلے شفایاب ہو

سکتا ہوں۔۔۔ آپ نے تو سُنا، امیر نے حکم دیا ہے آپ مجھے فوراً اچھا کر دیں۔"

خواجہ نصر الدّین دل ہی دل میں سُود خور، امیر اور اپنے کو کوس رہے تھے کہ انہوں نے اپنے علم و فضل کو مشتہر کرنے میں اتنا جوش و خروش کیوں دکھایا۔ سُود خور تیز رفتاری سے چلنے کے لیے ان کی آستین برابر کھینچ رہا تھا۔ سڑکوں پر سنّاٹا تھا۔ خواجہ نصر الدّین کے پیر گرم دھول میں دھنس رہے تھے۔ راہ چلتے انہوں نے سوچا "اس بلا سے کس طرح نجات ملے گی؟" وہ اچانک رُک گئے۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اپنی قسم پوری کرنے کا وقت آگیا ہے۔"

تیزی سے انہوں نے ایک منصوبہ تیّار کیا اور ہر ہر موقع کو اچھی طرح تول لیا۔ "ہاں۔" انہوں نے سوچا۔ "اب وقت آگیا ہے۔ سُود خور، غریبوں پر ظلم کرنے والے سنگ دل، آج ہی تجھ کو ڈبونا ہے۔" وہ مُڑ گئے تاکہ سُود خور ان کی سیاہ آنکھوں کی چمک نہ دیکھ سکے۔

وہ ایک گلی میں مڑ گئے جہاں ہوا سے گرد کے بگولے اُڑ رہے تھے۔ سُود خور نے اپنے گھر کا پھاٹک کھولا۔ صحن کے دوسری طرف جہاں ایک نیچی باڑ کے ذریعہ زنان خانہ الگ کیا گیا تھا خواجہ نصر الدّین نے سبز بیلوں کے پردے کے پیچھے سے چلنے پھرنے، چپکے چپکے کھُسر پھُسر اور ہنسی کی آوازیں سُنیں۔ سُود خور کی بیویاں اور داشتائیں کسی اجنبی کے آنے سے بہت خوش تھیں کیونکہ اس قید کی حالت میں ان کے لیے اور کوئی دلچسپی کا سامان نہ تھا۔ سُود خور نے ذرا رُک کر اُس طرف درشتی سے دیکھا۔ بالکل سنّاٹا ہو گیا۔

"حسین قیدیو، آج میں تمہیں نجات دلا دوں گا۔" خواجہ نصر الدّین نے سوچا۔

جس کمرے میں سُود خور اُن کو لے گیا اس میں کھڑکیاں نہ تھیں اور دروازے کو کوئی زنجیروں اور تین قفلوں سے محفوظ کیا گیا تھا جن کے کھولنے کا گُر صرف مالک مکان جانتا تھا۔ دروازہ کھولنے میں اس کو کافی

دیر لگی۔ یہاں اس کی سونے کی دیگیں رکھی تھیں اور تہہ خانے کے دھانے پر لکڑی کے تختے پڑے تھے جن پر وہ سوتا تھا۔

"کپڑے اتار دو!" خواجہ نصرالدّین نے حکم دیا۔

سُود خور نے اپنے کپڑے اُتار دیے اور عریانی کی حالت میں وہ اور کریہہ المنظر ہو گیا۔ خواجہ نصرالدّین نے دروازہ بند کر کے دعائیں پڑھنا شروع کیں۔

اس دوران میں جعفر کے بہت سے رشتے دار صحن میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے اس کے قرض دار تھے اور ان کو اُمّید تھی کہ وہ ان کے قرض معاف کر کے یہ خوشی کی تقریب منائے گا۔ لیکن اُن کی اُمّیدیں بے بنیاد تھیں۔ بند کمرے میں مقروض لوگوں کی آواز سُن کر اس کا دل کینہ پرور خوشی سے بھر گیا۔ "آج تو میں اُن سے کہہ دوں گا کہ میں نے اُن کا قرض معاف کیا۔" اس نے سوچا۔ "لیکن میں ان کے تمسک واپس نہیں دوں گا۔ وہ یقین کر کے بے فکر ہو جائیں گے۔ میں کچھ

نہیں کہوں گا اور ان کے قرض کا کھاتہ بنالوں گا۔ اور جب ان پر اصل کا سُود دس گنا ہو جائے گا اور پوری رقم اُن کے مکانات، باغات اور انگور کے باغیچوں کی مالیت سے زیادہ ہو جائے گی تو میں قاضی کے پاس جاؤں گا اور اپنے وعدے سے انکار کر کے رسیدیں پیش کروں گا۔ ان کا مال متاع بِکوا کر ان کو بھِک منگا بنوا دوں گا اور سونے سے ایک اور دیگ بھر لوں گا!"

"اٹھو! کپڑے پہنو!" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "ہم احمد پیر کے تالاب پر جائیں گے اور وہاں تم پاک پانی میں نہاؤ گے۔ شفا پانے کے لیے یہ لازمی ہے۔"

"احمد پیر کا تالاب!" سُود خور گھبرا کر بولا۔ "ایک بار تو میں اُس میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ دانائے روزگار مولانا حسین سمجھ لیجئے کہ میں تیرنا نہیں جانتا۔"

"تالاب کی طرف جاتے ہوئے تمھیں متواتر دعائیں پڑھتے رہنا چاہیے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "تمھیں دنیاوی باتوں کے بارے میں

نہ سوچنا چاہیے۔ تمہیں اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی ساتھ لے چلنا ہو گا اور راستے میں جس سے بھی ملو گے اُسے ایک اشرفی دینی ہو گی۔"

سُود خور کے مُنہ سے آہ نکل گئی لیکن اس نے ہدایت پر حرف بحرف عمل کیا۔ ان کی ملاقات ہر طرح کے لوگوں سے ہوئی۔ کاریگروں اور بھک منگوں سے اور سُود خور نے ہر ایک کو ایک ایک اشرفی دی حالانکہ اس سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے رشتے دار بھی پیچھے پیچھے تھے۔ خواجہ نصر الدّین نے خاص مقصد سے ان کو مدعو کر لیا تھا تا کہ آئندہ ان پر یہ الزام نہ لگایا جا سکے کہ انہوں نے جان بوجھ کر سُود خور کو ڈبو دیا۔

سورج چھتوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا، درختوں کا سایہ تالاب پر پھیل گیا تھا، ہوا میں مچھر گا رہے تھے۔ جعفر نے کپڑے اُتارے اور پانی کے قریب گیا۔

"یہاں بہت گہرا ہے۔" اس نے فریاد کی۔ "میں نے جو کچھ کہا تھا اس کو آپ بھولے تو نہیں ہیں، مولانا۔ میں تیر نہیں سکتا۔"

رشتے دار خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ سُود خور شرم سے اپنے کو ہاتھوں سے چھپائے، خوف سے سکڑا سکڑا یا کسی اتھلی جگہ کے لیے تالاب کا چکّر لگانے لگا۔

اکڑوں بیٹھ کر اس نے تالاب میں لٹکتی ہوئی جھاڑیوں کا سہارا لیا اور پانی میں ڈرتے ڈرتے ایک پیر ڈالا۔

"ٹھنڈا ہے پانی۔" وہ بڑبڑایا۔ اس کی آنکھیں پریشانی میں نکل پڑی تھیں۔

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" خواجہ نصر الدّین نے اُس کی طرف سے نگاہ ہٹاتے ہوئے کہا کیونکہ وہ اس رحم کے خلاف جس کا سُود خور سزاوار نہ تھا اپنے دل کو فولادی بنا رہے تھے۔ پھر انہوں نے ان مصیبتوں کا خیال کیا جو جعفر کے برباد کیے ہوئے غریب لوگ جھیلتے ہیں، بیمار بچّے کے خشک لب، بڈّھے نیاز کے آنسو۔ اور ان کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ اب وہ کھلم کھلا جرأت کے ساتھ سُود خور کی نگاہوں سے نگاہیں ملا سکتے تھے۔

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" انہوں نے بات دہرائی۔ "اگر شفا چاہتے ہو تو تالاب کے اندر اترو۔"

سُود خور نے پانی کے اندر جانا شروع کیا۔ وہ اتنا آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچا تو اس کی توند کنارے ہی سے لگی تھی۔ آخر کار جب وہ کھڑا ہوا تو کمر تک تھا۔ گھاس پھوس اِدھر اُدھر حرکت کر رہے تھے اور ان کا سرد مس اس کے جسم میں گدگدی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے شانے سردی سے کانپ رہے تھے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور مُڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی بے زبان جانور کی طرح التجا کر رہی تھیں لیکن خواجہ نصر الدّین نے کچھ نہیں کہا۔ اس وقت سُود خور کو چھوڑ دینے کا مطلب ہزاروں غریبوں کو مُصیبت میں مبتلا رکھنا تھا۔

پانی سُود خور کے کوبڑ تک پہنچ گیا لیکن خواجہ نصر الدّین اس سے برابر آگے بڑھنے کو کہتے رہے۔

"آگے بڑھو، آگے، پانی کانوں تک آ جانے دو۔ نہیں تو میں تمہارے علاج کا ذمّہ دار نہیں۔ چلو، ہمّت باندھو، محترم جعفر! دل مضبوط کرو! ایک قدم اور! ذرا سے اور آگے!"

"غہ غہ۔" سُود خور نے پانی کے اندر جاتے ہوئے غر غر کی آواز میں کہا۔

"غہ غہ۔" جب وہ اُوپر آیا تو یہی آواز پھر نکلی۔

"ڈوب رہا ہے! ڈوب رہا ہے!" اس کے رشتے دار چلّائے۔

ایک عام ہنگامہ ہو گیا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرف شاخیں اور چھڑیاں بڑھا دی گئیں۔ کچھ لوگ محض رحم دلی کی بنا پر اس کی مدد کرنا چاہتے تھے اور دوسرے محض بناوٹ کر رہے تھے۔ خواجہ نصر الدّین آسانی سے بتا سکتے تھے کہ جعفر کا کون اور کتنا قرض دار ہے۔ وہ خود ہر ایک سے زیادہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

"ارے یہاں! اپنا ہاتھ ہمیں دو، محترم جعفر! ارے سنو! اپنا ہاتھ ہمیں دو!"

ان کو یہ بخوبی علم تھا کہ سُود خور اپنا ہاتھ کبھی نہ دے گا کیونکہ "دینے" کا لفظ ہی اُسے مفلوج کرنے کے لیے کافی تھا۔

"اپنا ہاتھ ہمیں دو!" رشتے دار ایک ساتھ چلّائے۔

اب سُود خور غوطے کھا کھا کر اور دیر میں اوپر آنے لگا اور وہ اس مقدس پانی میں ڈوب مرتا اگر ایک سقّہ اپنی پیٹھ پر خالی مشک لیے ننگے پیر اُدھر سے دوڑتا نہ گزرتا۔

"ارے!" اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر کہا۔ "کہیں یہ جعفر سُود خور تو نہیں ہے!"

اور وہ کپڑے اتارے بغیر بلا جھجک پانی میں کود گیا اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے زور سے کہا:

"لو یہ رہا میرا ہاتھ، اس کو پکڑ لو!"

سُود خور نے ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو پانی سے باہر صحیح سلامت کھینچ لایا گیا۔

سُود خور کنارے پر پڑا دم لے رہا تھا اور اس کو نجات دِلانے والا بڑی تیزی سے اس کے رشتے داروں کو بتا رہا تھا:

"تم غلط طریقے سے اُن کی مدد کر رہے تھے۔ تم لو کی بجائے دو کہہ رہے تھے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ معزّز جعفر ایک بار اور اسی تالاب میں ڈوب رہے تھے اور ایک اجنبی نے جو بھورے گدھے پر اِدھر سے گزر رہا تھا انہیں بچایا تھا؟ اس اجنبی نے جعفر کو بچانے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور مجھے یاد رہ گیا۔ آج یہ کام آیا۔"

اس دوران میں سُود خور کی سانس ٹھکانے لگی اور اس نے شکایت آمیز لہجے میں منمنانا شروع کیا:

"ارے مولانا حسین! آپ نے تو میرا علاج کرنے کے لیے کہا تھا لیکن مجھ کو قریب قریب ڈبو ہی دیا تھا! خدا کی قسم، اب میں کبھی اس تالاب کے قریب نہیں پھٹکوں گا! آپ کیسے دانا ہیں اگر آپ کو ایک سقّہ یہ بتاتا ہے کہ کیسے آدمی کو ڈوبنے سے بچایا جا سکتا ہے؟ میری قبا اور عمامہ دو۔ آیئے، مولانا، اندھیرا ہو رہا ہے اور جو کچھ ہم نے شروع کیا ہے اسے ختم کرنا ہے۔ اور تم، میاں سقے۔" سُود خور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مت بھولنا کہ تمہارا قرض ایک ہفتے میں واجب الادا ہو جائے گا۔ لیکن میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں اور اس لیے میں تمہیں آدھا۔۔۔ میرا مطلب ہے چوتھائی۔۔۔ نہیں تمہارے قرض کا دسواں حصّہ معاف کر دوں گا۔ یہ کافی ہے کیونکہ میں تمہاری مدد کے بغیر آسانی سے اپنے کو بچا سکتا تھا۔"

"ارے محترم جعفر۔" سقے نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے کو میری مدد کے بغیر نہیں بچا سکتے تھے۔ کیا آپ میرا چوتھائی قرض معاف کر دیں گے؟"

"اچھا! تو تم نے مجھ کو اپنی غرض کی بنا پر بچایا!" سُود خور نے کہا۔ "تم نے نیک مسلمان کی حیثیت سے یہ نہیں کیا بلکہ لالچ کی وجہ سے! ارے سقے، تجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ میں تیرا ذرا سا قرض بھی نہیں معاف کروں گا!"

مغموم سقّہ وہاں سے ہٹ گیا اور خواجہ نصر الدّین اس کو رحم کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے جعفر کی طرف نفرت و حقارت سے دیکھا۔

"آیئے، مولانا حسین۔" جعفر نے جلدی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اس لالچی سقے سے کیا سرگوشی کر رہے ہیں؟"

''ٹھہرو۔؛ خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "تم بھول گئے کہ تمہیں ہر ملنے والے کو ایک اشرفی دینی چاہیے۔ تم نے اس سقے کو اشرفی کیوں نہیں دی؟''

''ہائے مصیبت! میں تباہ ہو جاؤں گا!'' سُود خور نے فریاد کی۔ ''سوچئے تو کہ میں ایسے بُرے اور لالچی آدمی کو اشرفی دینے پر مجبور ہوں گا!'' اس نے اپنی تھیلی کھول کر ایک اشرفی پھینک دی۔ ''بس یہ آخری ہے۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے اور واپسی کے راستے پر ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔''

لیکن خواجہ نصر الدّین نے سقے سے بلاوجہ کانا پھوسی نہیں کی تھی۔

وہ واپس روانہ ہو گئے۔ آگے سُود خور تھا، اس کے پیچھے خواجہ نصر الدّین اور پھر سُود خور کے رشتے دار۔ ابھی وہ مشکل سے پچاس قدم گئے ہوں گے کہ ایک گلی سے سقّہ نکلا۔ یہ وہی تھا جس کو یہ لوگ تالاب کے کنارے چھوڑ آئے تھے۔

سُود خور نے اُدھر سے مُنہ موڑ لیا جیسے اس کو دیکھنا ہی نہ چاہتا ہو لیکن خواجہ نصر الدّین نے اس کو پھٹکارا:

"جعفر یاد رکھو، ہر ایک کو جس سے بھی تم ملو!"

اندھیرے میں ایک انتہائی اذیت بھری کراہ گونجی۔ جعفر اپنی تھیلی کھول رہا تھا۔

سقے نے اشرفی لی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ کوئی پچاس قدم بعد پھر وہ ان کے سامنے آن موجود ہوا۔ سُود خور زرد پڑ گیا اور کانپنے لگا۔

"مولانا" اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو وہی ہے۔۔۔"

"ہر ایک کو جس سے تم ملو۔" خواجہ نصر الدّین نے دھرا دیا۔

پھر خاموش فضا میں ایک کراہ گونجی۔ جعفر اپنی تھیلی کھول رہا تھا۔

یہ واقعہ سارے راستے پیش آیا۔ سقّہ ہر پچاس قدم پر سامنے آ جاتا۔ وہ خوب ہانپ رہا تھا اور اس کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن وہ اشرفی لیتا اور تیز بھاگتا اور پھر آگے سڑک پر کسی جھاڑی سے بر آمد ہوتا۔

اپنا پیسہ بچانے کے لیے سُود خور تیز تیز چلنے لگا اور آخر میں دوڑنا شروع کر دیا لیکن وہ تو لنگڑا تھا۔ وہ سقے سے کیسے جیت سکتا تھا جو جوش میں ہوا ہوا جا رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں اور باڑوں کو پار کرتا بھاگ رہا تھا۔ اس نے سُود خور سے کم از کم پندرہ بار بھینٹ کی اور آخری بار بالکل اس کے گھر کے قریب۔ وہ ایک چھت پر سے کودا اور دروازے پر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ آخری اشرفی پانے کے بعد وہ تھک کر زمین پر گر پڑا۔

سُود خور جلدی سے اپنے صحن میں گھس گیا۔ خواجہ نصر الدّین اس کے پیچھے تھے۔ اس نے اپنی خالی تھیلی خواجہ نصر الدّین کے قدموں پر ڈال دی اور غصّے سے چلایا۔

"مولانا، میرا علاج بہت قیمتی ہے! میں ابھی تک تحفوں، خیرات اور اس کمبخت سقے پر تین ہزار تانگے خرچ کر چکا ہوں!"

"ذرا دم لو۔" خواجہ نصرالدّین نے جواب دیا۔ "بس، آدھ گھنٹے کے اندر تم کو اس کا انعام مل جائے گا۔ ایک بڑا سا الاؤ صحن کے بیچوں بیچ تیّار کرنے کا حکم دو۔"

نوکر ایندھن لا لا کر الاؤ تیار کر رہے تھے اور خواجہ نصرالدّین اس بات میں دماغ لڑا رہے تھے کہ کس طرح سُود خور کو چرکا دیا جائے اور اس کے شفا نہ پانے کا سارا الزام اسی کے سر تھوپ دیا جائے۔ انہوں نے کئی منصوبے سوچے لیکن ان کو نامناسب پا کر رد کر دیا۔ اس دوران میں الاؤ تیّار ہو گیا تھا، ہلکی ہوا میں شعلے بھڑک رہے تھے اور انگوروں کا باغیچہ سُرخ شعلوں سے روشن ہو گیا تھا۔

"جعفر، کپڑے اتار کر تین بار الاؤ کے گرد پھرو۔" خواجہ نصرالدّین نے کہا۔ وہ ابھی تک کوئی منصوبہ نہیں بنا سکے تھے اور تھوڑا سا وقت پانے کے لیے یہ کر رہے تھے۔ وہ خیالات میں ڈوبے نظر آتے تھے۔

رشتے دار خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ سُود خور الاؤ کے گرد اس طرح گھوم رہا تھا جیسے کوئی زنجیر سے بندھا ہوا بندر ہو۔ وہ اپنے ہاتھ ہلا رہا تھا جو گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔

خواجہ نصر الدّین کا چہرہ دمک اٹھا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لے کر انگڑائی لی:

"مجھے ایک کمبل تو دینا۔" انہوں نے گونجتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔ "جعفر اور تمام دوسرے لوگ ادھر آؤ۔"

انہوں نے تمام رشتے داروں کا ایک حلقہ بنا دیا اور جعفر کو بیچ میں زمین پر بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے کہا:

"میں جعفر کو اس کمبل سے ڈھک کر ایک دُعا پڑھوں گا۔ تم سب کو معہ جعفر کے آنکھیں بند کر کے دُعا کو دہرانا چاہیے۔ اس کے بعد جب میں کمبل اٹھاؤں گا تو جعفر شفایاب ہو گا۔ لیکن میں تم سب کو ایک انتہائی اہم

شرط سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک وہ پوری نہ ہو گی جعفر شفایاب نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ میں کہتا ہوں کان دھر کر سُنو اور یاد رکھو۔"

رشتے دار خاموشی سے سننے اور یاد رکھنے کی تیّاری کرنے لگے۔

"جب تم میرے ساتھ دُعا کو دہراتے ہو گے۔" خواجہ نصر الدّین نے زور سے صاف صاف کہا۔ "تم میں سے کسی کو بھی، اور سب سے زیادہ جعفر کو، بندر کا ہرگز ہرگز خیال نہ آنا چاہیے! اگر تم میں سے کوئی بھی اس کے بارے میں سوچے گا یا اس سے بھی بُرا یہ ہو گا کہ اس کو اپنے تصوّر میں دیکھے گا۔ اس کی دم، اس کے لال چوتڑ، کریہہ چہرہ اور زرد دانت۔ تو پھر شفا نہ ہو گی اور نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ کسی مقدس کام کا انجام بندر ایسے گندے جانور کے خیال کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ سمجھے نا تم لوگ؟"

"ہم لوگ سمجھ گئے۔" رشتے داروں نے کہا۔

"جعفر، تیّار ہو جاؤ اور اپنی آنکھیں بند کر لو۔" خواجہ نصر الدّین نے سُود خور پر کمبل ڈالتے ہوئے بڑی شان سے کہا۔ "اور اب تم اپنی آنکھیں بند کرو!" اس نے رشتے داروں سے کہا۔ "اور اس شرط کو یاد رکھنا، بندر کا خیال نہ آئے۔"

پھر انہوں نے دُعا پڑھنا شروع کی:

"خداوند تعالی اس مقدس دُعا کے اثر سے اپنے ناچیز خادم جعفر کو شفا بخش۔۔۔"

"خداوند تعالی اس مقدس دُعا کے اثر سے۔۔۔" مختلف آوازوں میں رشتے داروں کا کورس بلند ہوا۔۔۔ اس موقع پر خواجہ نصر الدّین نے دیکھا کہ ایک شخص کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے، دوسرے رشتے دار نے کھانسا شروع کیا، تیسرا الفاظ کو دہرانے میں ہکلانے لگا اور چوتھے نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ کوئی صورت سامنے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک لمحہ بعد جعفر خود بے چینی

سے کلبلانے لگا۔ ایک بہت ہی کریہہ المنظر اور انتہائی بدصورت بندر جس کی دُم لمبی اور دانت زرد تھے اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہو کر اس کو چڑا رہا تھا۔ کبھی وہ اس کو زبان نکال کر دکھاتا اور کبھی لال لال چوتڑ اور دوسرے اندام جو مومن کے تصوّر کے لیے بھی زیبا نہیں ہیں۔

خواجہ نصر الدّین اونچی آواز میں دُعا پڑھتے رہے۔ اچانک وہ چُپ ہو گئے جیسے وہ کوئی بات سُن رہے ہوں۔ رشتے دار بھی خاموش ہو گئے اور بعض تو پیچھے ہٹ گئے۔ جعفر کمبل کے نیچے دانت پیس رہا تھا کیونکہ اس کا بندر طرح طرح کی بدتمیزی کی شرارتوں پر اُتر آیا تھا۔

"ارے ناپاک، بے ایمانو!" خواجہ نصر الدّین گرج پڑے۔ "تم نے میری حکم عدولی کی جرأت کیسے کی۔ تمھیں یہ ہمّت کیسے ہوئی کہ دُعا پڑھتے وقت اسی بات کا تصوّر کرو جس کے لیے میں نے خاص طور سے تمھیں منع کیا تھا!" انھوں نے کمبل اُلٹ دیا اور جعفر پر پھوٹ پڑے۔ "تم نے میری مدد کیوں مانگی تھی؟ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ تم شفا نہیں چاہتے

تھے! تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ تم میرے دُشمنوں کے لیے یہ سب کر رہے تھے! جعفر ہوشیار رہنا! کل ہی امیر کو سارا قصّہ معلوم ہو جائے گا۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ کس طرح تم نے دُعا پڑھتے وقت جان بوجھ کر مرتدانہ خیالات سے بندر کا تصوّر کیا! جعفر ہوشیار رہنا اور تم سب بھی! تم آسانی سے نہیں چھٹکارا پاؤ گے۔ یقیناً تم کو کفر کی سزا تو معلوم ہی ہو گی۔۔۔"

چونکہ کفر کی سزا ہمیشہ انتہائی شدید ہوتی تھی اس لیے رشتے دار تو مارے خوف کے مفلوج ہو گئے۔ سُود خور اپنے کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے اس طرح ہکلانے لگا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خواجہ نصرالدّین اس کی بات سُننے کے لیے نہیں رکے۔ وہ وہاں سے مُڑ کر چل پڑے اور پھاٹک دھڑام سے بند کیا۔

جلد ہی چاند چاند بلند ہو گیا۔ شہر ہلکی ہلکی چاندنی میں نہا گیا۔ سُود خور کے گھر میں رات گئے تک تُوتُو مَیں مَیں جاری رہی۔ ہر شخص گرم ہو کر بحث کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ بندر کا تصوّر کرنے میں پہل کس نے کی۔

۳۱

سُود خور کو اس طرح بے وقوف بنا کر خواجہ نصر الدّین محل واپس روانہ ہوئے۔

دن بھر کی محنت مشقت کے بعد بخارا کے لوگ سونے کی تیّاریاں کر رہے تھے۔ گلیوں میں خنکی اور اندھیرا تھا اور پُلوں کے نیچے پانی کی موسیقی گونج رہی تھی۔ بھیگی مٹّی کی سوندھی مہک پھیلی ہوئی تھی اور خواجہ نصر الدّین کا پیر کیچڑ میں جا بجا پھسل رہا تھا کیونکہ کسی فیاض سقے نے بڑی دریا دِلی سے سڑک پر چھڑکاؤ کیا تھا تاکہ صحنوں اور چھتوں پر تھکے ہارے آرام کرنے والوں کو گرد آلود ہوا نہ ستائے۔ اندھیرے میں لپٹے ہوئے باغ

اپنی خوشگوار مہک دیواروں کے پار تک پہنچا رہے تھے۔ دور دراز آسمان پر ستارے خواجہ نصرالدّین کی طرف آنکھیں جھپکا جھپکا کر ان کی کامیابی کا وعدہ کر رہے تھے۔

"ہاں۔" انہوں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرحال دنیا کوئی ایسی بری جگہ نہیں ہے! کم از کم ایسے آدمی کے لیے تو نہیں جس کے دماغ ہو، خالی کدّو نہیں۔"

راستے میں وہ بازار کی طرف مُڑ گئے اور اپنے دوست علی کے چائے خانے میں انہوں نے مہمان نواز روشنیاں چمکتے ہوئے دیکھیں۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ مالک نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا۔ دونوں گلے ملے اور ایک اندھیرے کمرے میں چلے گئے۔ پتلی دیوار کے دوسری طرف سے باتوں، ہنسی اور برتنوں کی کھنکھناہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ علی نے دروازہ بند کر کے ایک چراغ جلا دیا۔

"سب تیار ہے۔" اس نے چپکے سے کہا۔ "میں گُل جان کا چائے خانے میں انتظار کروں گا۔ یوسف آہن گر نے اس کے چھپنے کے لیے ایک محفوظ جگہ تیّار کر لی ہے۔ تمہارے گدھے پر دن رات کا ٹھی کسی رہتی ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ خوب کھاتا ہے اور موٹا ہو گیا ہے۔"

"علی، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تمہارے احسان کے بار سے میں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکوں گا۔"

"ارے ہاں۔" علی نے کہا۔ "خواجہ نصر الدّین تم جو کچھ چاہتے ہو ہمیشہ کر لیتے ہو۔ اس لیے احسان وحسان کی بات چھوڑو۔"

یہ دونوں بیٹھ کر چپکے چپکے سر گوشیاں کرتے رہے۔ علی نے گُل جان کے لیے ایک مردانہ لباس دکھایا اور ایک بڑا سا عمامہ جو اس کے بالوں کو چھپا سکے۔

ہر بات پوری تفصیل سے طے ہو گئی۔ خواجہ نصر الدّین رخصت ہونے والے تھے کہ انہوں نے دیوار کے دوسری طرف ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ چائے خانے کی طرف کھلنے والے دروازے کو انہوں نے ذرا کھولا اور کان لگا کر سننے لگے۔ یہ چیچک رو جاسوس کی آواز تھی۔ خواجہ نصر الدّین نے دروازہ اور کھول دیا اور دیکھنے لگے۔

چیچک رو جاسوس ایک بھاری قبا پہنے، سر پر عمامہ رکھے اور مصنوعی داڑھی لگائے کچھ آدمیوں کے درمیان گھرا بیٹھا تھا اور بہت اہم بن کر کہہ رہا تھا:

"جو آدمی اپنے کو خواجہ نصر الدّین کہتا ہے وہ جعل ساز ہے۔ میں اصلی خواجہ نصر الدّین ہوں لیکن میں نے بہت دن ہوئے اپنی بُری حرکتوں سے توبہ کر لی ہے کیونکہ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ وہ واقعی بُری اور ناپاک تھیں۔ اس لیے میں یعنی اصلی خواجہ نصر الدّین تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ تم بھی میری مثال کی پیروی کرو اور میری طرح خیال کرو کہ ہمارے معظّم، مانندِ آفتاب امیر واقعی زمین پر اللہ کے نائب ہیں جس کا

ثبوت ان کی بے نظیر دانش مندی اور رحم و کرم ہے۔ میں، اصلی خواجہ نصر الدّین تم کو یہ بتاتا ہوں۔"

"اچھا!" خواجہ نصر الدّین نے علی کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "تو اب یہ ہو رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میں شہر چھوڑ کر جا چکا ہوں۔ میں ذرا ان کو اپنی یاد تو دلاتا چلوں۔ علی، میں اپنی داڑھی، مرصع قبا اور عمامہ اس کمرے میں چھوڑے جاتا ہوں۔ مجھے کچھ پرانے کپڑے دے دو۔"

علی نے ان کو گندی، چیلڑوں سے بھری ایک پھٹی قبا دے دی جو مدّتوں ہوئے اپنی خدمات انجام دے چکی تھی۔

"کیا تم چیلڑ پالتے ہو؟" خواجہ نصر الدّین نے قبا پہنتے ہوئے سوال کیا۔ "شاید تم اُن کی دُکان کھولنے والے ہو لیکن یہ اس سے پہلی ہی تم کو چٹ کر جائیں گے، دوست۔"

پھر خواجہ نصر الدّین باہر سڑک پر نکل گئے اور چائے خانے کا مالک اپنے گاہکوں کے پاس آ کر آئندہ ہونے والے واقعات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کو زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ خواجہ نصر الدّین ایک گلی سے آئے۔ وہ اس طرح تھکے تھکے سے اندر داخل ہوئے جیسے تمام دن سفر کیا ہے۔ وہ چائے خانے کے زینوں پر چڑھے اور ایک اندھیرے گوشے میں بیٹھ کر چائے مانگی۔ کسی نے ان کی طرف ذرا بھی توجّہ نہیں کی۔ بخارا کی سڑکوں پر تو طرح طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ چیچک رو جاسوس اب بھی اپنی ہانک رہا تھا:

"میری غلطیاں بے شمار ہیں لیکن اب میں، خواجہ نصر الدّین ان پر نادم ہوں اور قسم کھائی ہے کہ میں پاکباز رہوں گا، تمام اسلامی ہدایات پر عمل کروں گا اور امیر، ان کے وزیروں، صوبے داروں اور پہرے داروں کا حکم مانوں گا۔ یہ طے کرنے کے بعد میرے ذہن کو بڑا سکون اور خوشی مل رہی ہے اور میری دنیاوی ملکیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پہلے

میں ایک آوارہ گرد تھا جس کو ہر ایک حقیر سمجھتا تھا اور اب میں ایک نیک مومن کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔"

ایک ساربان نے جس کے پٹکے میں چابک لگی ہوئی تھی بڑے ادب سے اس کو چائے کی پیالی پیش کی اور کہا:

"بے نظیر خواجہ نصر الدّین، میں قوقند سے بخارا آیا ہوں۔ میں نے آپ کی دانشمندی کے بارے میں سُنا تو تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ کسی دن آپ کی زیارت ہو گی، حتیٰ کہ بات چیت بھی ہو گی۔ اب میں ہر ایک سے کہوں گا کہ آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی اور جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ بھی ان کو بتاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" چیچک رو جاسوس نے اُس کی تصدیق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "ہر ایک سے کہنا کہ خواجہ نصر الدّین اب سُدھر گئے ہیں، انہوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے اور پاکباز مسلمان بن کر امیر کے سچے

خادم ہو گئے ہیں۔ جس سے بھی تمہاری ملاقات ہو سبھی کو یہ خوش خبری سنانا۔"

"میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، بے مثال خواجہ نصر الدّین۔" ساربان بولا۔ "میں سچّا مسلمان ہوں اور انجانے میں بھی قانون کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مان لیجیے میں نہار رہا ہوں اور اذان کی آواز سنائی دیتی ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کس طرف کا رُخ مجھے کرنا چاہیے؟"

چیچک رو جاسوس بڑے مربّیانہ انداز میں مُسکرایا اور بولا:

"مکّے کی طرف قطعی طور پر۔۔۔"

تاریک کونے سے آواز آئی:

"اپنے کپڑوں کی طرف تاکہ گھر ننگے نہ جاؤ۔"

اس احترام کے باوجود جو جاسوس نے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا ساری محفل نے مُسکراہٹ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

جاسوس نے خواجہ نصر الدّین کو غور سے دیکھا لیکن دُھندلکے میں پہچان نہ سکا۔

"اس کونے میں کون بھونک رہا ہے؟" اس نے غرور سے پوچھا۔ "اے، بھک منگے، کیا تو خواجہ نصر الدّین کے مُقابلے میں اپنی عقل آزمانے کی کوشش کر رہا ہے؟"

"اس کے لیے میں ایک بہت چھوٹا آدمی ہوں۔" خواجہ نصر الدّین نے چائے پیتے ہوئے جواب دیا۔

اب ایک کسان نے پوچھا:

"محترم خواجہ نصر الدّین بتایئے کہ کسی جنازے میں حصّہ لیتے ہوئے اسلام کے مطابق کس جگہ کھڑے ہونا بہتر ہو گا۔ جنازے کے آگے یا پیچھے؟"

جاسوس نے بڑے اہم انداز میں ایک انگلی اٹھائی۔ وہ جواب دینے کی تیّاری کر رہا تھا کہ اس سے پہلے ہی کونے سے آواز آئی۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم جنازے کے آگے ہو یا پیچھے بشرطیکہ تم خود تابوت کے اندر نہ ہو۔"

چائے خانے کا ملک جو مزاحیہ باتوں سے بڑا لطف لیتا تھا اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا اور فلک شگاف قہقہے لگانے لگا۔ دوسرے بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ کونے میں بیٹھا ہوا آدمی بڑا چرب زبان تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواجہ نصر الدّین کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے۔

جاسوس نے جس کا غصّہ بڑھ رہا تھا آہستہ سے اپنا سُر گھمایا:

"ارے تیرا نام کیا ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ تیری زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ خبر دار، کہیں اس سے بالکل ہی ہاتھ نہ دھونا پڑے! میں ایک جملہ کہہ کر اس کو آسانی سے ختم کر سکتا ہوں۔" اس نے سامعین کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت ہم مقدس اور پاکیزہ باتیں کر رہے ہیں جہاں حاضر جوابی کی کوئی گنجائش نہیں۔ سب باتوں کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ فی الحال میں اس بھک منگے کو کوئی جواب نہیں دوں گا۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میں، خواجہ نصر الدّین تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ میری پیروی کرو۔ ملاؤں کی عزّت کرو، حکام کا حکم مانو اور پھر خوشحالی تمہارے قدم چومے گی۔ لیکن سب سے پہلے ان آوارہ گردوں کی بات نہ سنو جو جعل کرتے ہیں اور اپنے کو خواجہ نصر الدّین کہتے ہیں، جیسے یہ آدمی جس نے حال ہی میں بخارا میں تمام ہنگامہ کیا اور پھر یہ جان کر بے پتہ نشان غائب ہو گیا کہ اصلی خواجہ نصر الدّین آ گئے ہیں۔ ایسے تمام بہروپیوں کو پکڑو اور امیر کے پہرے داروں کے حوالے کر دو۔"

”بالکل ٹھیک!“خواجہ نصر الدّین نے زور سے کہا اور دُھندلکے سے روشنی میں آ گئے۔

تمام حاضرین نے ان کو فوراً پہچان لیا اور اس اچانک واقعہ سے ششدر رہ گئے۔ جاسوس زرد پڑ گیا۔ خواجہ نصر الدّین جاسوس کے قریب آ گئے اور علی بھی چپکے سے ان کے پیچھے لگ گیا تاکہ جاسوس کو جھپٹ لے۔

”اچھا، تو تم اصلی خواجہ نصر الدّین ہو؟“

جاسوس نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا، اس کے گال کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر نگران تھیں۔ بہر حال اس نے زور لگا کر جواب دیا:

”ہاں، میں اصلی خواجہ نصر الدّین ہوں، اور سب دھوکے باز ہیں اور تو بھی۔“

"مسلمانو! تم کیا کھڑے دیکھ رہے ہو؟" خواجہ نصر الدّین نے چیخ کر کہا۔ "اس نے خود ہی کہا ہے! پکڑو، پکڑو اس کو! کیا تم نے امیر کا حکم نہیں سنا ہے اور تمہیں پتہ نہیں ہے کہ خواجہ نصر الدّین کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ پکڑو اسے، نہیں تو تمہیں اس کو بچانے کے لیے جواب دہی کرنی ہو گی!"

انہوں نے جاسوس کی مصنوعی داڑھی نوچ لی۔

چائے خانے میں سبھی لوگوں نے اس نفرت انگیز چیچک رو، چپٹی ناک اور چالاک آنکھوں والے آدمی کو پہچان لیا۔

"اس نے خود ہی تسلیم کیا ہے!" خواجہ نصر الدّین دائیں طرف آنکھ مارتے ہوئے چیخے۔ "پکڑو خواجہ نصر الدّین کو!" اور انہوں نے بائیں طرف آنکھ ماری۔

چائے خانے کے مالک علی نے سب سے پہلے جاسوس پر ہاتھ ڈالا۔ جاسوس نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن سقے، کسان اور کاریگر جھگڑے میں کود

پڑے۔ کچھ دیر تک تو بس مکوں کے اوپر اٹھنے اور گرنے کا منظر دکھائی دیا۔ خواجہ نصرالدّین سب سے زیادہ زوروں سے کٹائی کر رہے تھے۔

"ارے میں تو مذاق کر رہا تھا!" جاسوس کراہتے ہوئے چلایا۔ "ارے مسلمانو، یہ تو مذاق تھا! میں خواجہ نصرالدّین نہیں ہوں! مجھے جانے دو!"

"تم جھوٹے ہو!" خواجہ نصرالدّین نے چلّا کر جواب دیا۔ ان کی مٹھیاں ایسی چل رہی تھیں جیسے کوئی نانبائی آٹا گوندھ رہا ہو۔ "تم نے خود اقرار کیا! ہم سب نے سُنا! ارے مسلمانو! ہم جتنے لوگ یہاں ہیں سب اپنے امیر کے سچّے وفادار ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے احکام کو وفاداری کے ساتھ بجالائیں۔ اس لیے مسلمانو، اس خواجہ نصرالدّین کو اچھی طرح دھنکنا چاہیے! اس کو گھسیٹ کر محل لے جاؤ اور پہرے داروں کے حوالے کر دو! اللہ اور امیر کی عظمت کا واسطہ، اس کو خوب پیٹو!"

مجمع نے جاسوس کو محل کی طرف گھسیٹنا شروع کیا اور راستے بھر اس کی مرمّت برابر ہوتی رہی۔ خواجہ نصرالدّین نے اس کو زور دار لات سے رُخصت کیا اور چائے خانے واپس آ گئے۔

"اف۔" انہوں نے اپنا پسینے سے تر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس بار ہم نے اس کی خوب مرمّت کر دی۔ اب بھی وہ پِٹ رہا ہے۔ آوازوں سے معلوم ہوتا ہے۔"

مشتعل آوازیں اور جاسوس کی فریاد بھری چیخیں اب بھی دور سے آ رہی تھیں۔ ہر ایک کو اس سے کچھ نہ کچھ بدلا لینا تھا اور امیر کے حکم کے زور پر ان کو اچھا موقع مل گیا تھا۔

چائے خانے کا مالک خوش ہو کر اپنی توند سہلا رہا تھا:

"اس کے لیے سبق ہو جائے گا۔ وہ اب میرے چائے خانے میں قدم نہیں رکھے گا۔"

پچھلے کمرے میں خواجہ نصر الدّین نے اپنا لباس تبدیل کیا، اپنی مصنوعی داڑھی لگائی اور پھر بغداد کے مولانا حسین بن گئے۔

جب وہ محل واپس ہوئے تو انہوں نے پہرے داروں کے کمرے سے آتی ہوئی کراہوں کی آواز سنی۔ انہوں نے اندر دیکھا تو چیچک رو جاسوس ایک نمدے پر پڑا تھا۔ اس کا بدن سوجا ہوا اور جا بجا زخمی تھا اور اس کی حالت ابتر تھی۔ ارسلان بیک اس کے پاس ایک لالٹین لیے کھڑا تھا۔
"جناب ارسلان بیک، کیا ہوا؟" خواجہ نصر الدّین نے معصومیت کے ساتھ پوچھا۔

"مولانا، بہت برا ہوا۔ وہ بدمعاش خواجہ نصر الدّین پھر شہر میں آ گیا۔ اس نے ہمارے سب سے ہوشیار جاسوس کو پیٹ دیا جو ہمارے حکم سے اپنے کو خواجہ نصر الدّین بتا کر نیک اور وفادارانہ تقریریں کر رہا تھا تاکہ اصلی خواجہ کے بُرے اثرات دور ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ دیکھیے؟"

"آہ، آہ!" جاسوس اپنا زخمی اور مسخ چہرہ اٹھاتے ہوئے کراہا۔ "میں اس کمبخت آوارہ گرد کے مُنہ کبھی نہ آؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس بار تو وہ مجھے ختم ہی کر دے گا۔ اب میں جاسوسی نہیں کروں گا۔ کل میں بہت دور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا اور کوئی ایمانداری کا کام کروں گا۔"

"میرے دوستوں نے واقعی اس کا بھرتا بنا دیا ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے لالٹین کی روشنی میں جاسوس کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اس پر ان کو تھوڑا سا ترس بھی آیا۔ "اگر محل دو سو قدم بھی اور آگے ہوتا تو وہ شاید یہاں زندہ نہ پہنچتا۔ اب دیکھنا ہے کہ اس نے کوئی سبق سیکھا ہے یا نہیں۔"

صُبح سویرے خواجہ نصر الدّین نے اپنے بُرج سے دیکھا کہ چیچک رو جاسوس ایک چھوٹی سی گٹھری لے کر محل سے نکل گیا۔ وہ لنگڑا رہا تھا اور بار بار اپنے سینے، بازوؤں اور پہلوؤں کو ہاتھوں سے سہلاتا جاتا تھا۔ بار بار

وہ دم لینے کے لیے بیٹھ جاتا۔ اس نے بازار کو پار کیا جو رفتہ رفتہ صُبح کی خنک شعاعوں سے روشن ہوتا جاتا تھا اور ڈھکے ہوئے اسٹالوں کی قطاروں میں غائب ہو گیا۔

صُبح سے رات کی تاریکی نے شکست کھائی۔ صُبح خالص، شفاف اور پُر سکون تھی۔ شبنم نے اس کو دھو کر اس پر دھوپ کے تار بکھیر دیے تھے۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور زفیلیں دے رہی تھیں۔ سورج کی پہلی کرنوں میں نہانے کے لیے تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ خواجہ نصرالدّین کے سامنے کھڑکی کے پٹرے پر ایک شہد کی مکھی آ کر رینگنے لگی۔ اس کو اس شہد کی تلاش تھی جو مرتبان میں تختے پر رکھا تھا۔

سورج خواجہ نصرالدّین کا پرانا اور وفادار دوست تھا۔ اب وہ بُلند ہو رہا تھا۔ ہر صُبح خواجہ نصرالدّین اس کو دیکھتے اور ایسا محسوس کرتے جیسے انہوں نے سورج کو سال بھر بعد دیکھا ہے۔ سورج بُلند ہو رہا تھا، مہربان اور فیاض دیوتا جو سب کو یکساں فیض پہنچاتا ہے اور ساری دنیا بھی اس کے

خیر مقدم کے لیے صُبح کی کرنوں میں چمکتا دمکتا اپنا شعلہ ور حسن پیش کر دیتی ہے۔ پھولے پھولے بادل، میناروں کے پالش کیے ہوئے ٹائل، بھیگی ہوئی پتیاں، پانی اور گھاس، حتیٰ کہ سنگِ خارا کی سپاٹ چٹان، قدرت کی دھتکاری ہوئی سوتیلی بیٹی بھی سورج کے خیر مقدم میں ایک انوکھا روپ دھار لیتی، اس کی ٹوٹی پھوٹی سطحیں اس طرح چمکنے دمکنے لگتیں جیسے ان پر ہیرے کا برادہ پھیلا دیا گیا ہو۔

خواجہ نصر الدّین اپنے دوست کے دمکتے ہوئے چہرے سے کیسے بے اعتنائی برت سکتے تھے۔ سورج کی چمکدار کرنوں میں ایک درخت کی پتیاں رقص کر رہی تھیں۔ خواجہ نصر الدّین بھی اس کے ساتھ جھوم گئے جیسے وہ بھی سر سبز پتّیوں میں ملبوس ہوں ۔ قریب کے مینار پر کبوتر غٹر غوں کر کے اپنے پر جھاڑ رہے تھے۔ تتلیوں کا ایک جوڑا کھڑکی کے سامنے لہرایا اور خواجہ کا دل چاہا کاش کہ وہ بھی ان کے اس نازک کھیل میں شریک ہو جاتے۔

خواجہ نصر الدّین کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ چیچک رو جاسوس کا خیال کر کے ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کاش کہ یہ صُبح اس جاسوس کی نئی زندگی کی صاف ستھری اور معقول صُبح ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ برائیاں اس جاسوس کی روح تک میں پیوست ہو چکی ہیں اور وہ پوری طرح صحت یاب ہوتے ہی پھر اپنی پرانی حرکتوں پر اتر آئے گا۔

بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ خواجہ نصر الدّین نے اپنی پیش گوئی میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ انسانوں کو اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے لیے غلطی کرنا مشکل تھا حالانکہ ان کو اپنی غلطی پر خوشی ہوتی اور وہ اس جاسوس کے روحانی نوجیون پر خوش ہوتے۔ بہر حال، سڑی ہوئی چیز پھر تازہ اور بار ور نہیں ہو سکتی۔ بدبُو خوشبو نہیں بن سکتی۔ خواجہ نصر الدّین نے افسوس کے ساتھ آہ بھری۔

ان کا محبوب خواب یہ تھا کہ ایسی دنیا ہوتی جہاں انسان بھائیوں کی طرف رہ سکتے، نہ تو ان میں حرص و حسد ہوتا اور نہ چوری چکاری اور غصّہ، بلکہ وہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتے اور ہر ایک کی خوشی کو سب کی خوشی سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر بھی ایسی خوشگوار دنیا کا تصوّر کرتے ہوئے وہ اس تلخ حقیقت کو بھی سمجھتے تھے کہ انسان اس طرح رہتے ہیں جو ان کے لیے زیبا نہیں ہے، ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، غلام بناتے ہیں اور اپنی روحوں کو ہر طرح کی برائیوں سے داغ دار کرتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو صاف سُتھرے اور ایماندارانہ وجود کے قوانین کو سمجھنے میں کتنی مدّت لگے گی؟

خواجہ نصر الدّین کو اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ انسان کسی نہ کسی دن ان قوانین کو سمجھے گا۔ ان کو اس بات پر قطعی یقین تھا کہ اس دنیا میں بُرے آدمیوں سے زیادہ بھلے آدمی ہیں۔ جعفر سُود خور اور چیچک رو جاسوس اور ان کی گلی سڑی روحیں کریہہ استثنا ہیں۔ ان کو قطعی یقین تھا

کہ فطرت نے انسان کو صرف بھلائیوں سے سنوارا ہے اور تمام برائیاں اس کوڑے کرکٹ کی طرح ہیں جو اس کی روح پر زندگی کے غلط اور غیر منصفانہ نظام نے باہر سے تھوپ دی ہیں۔ ان کو قطعی یقین تھا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب انسان اپنی زندگی کو پھر سے بنانا اور صاف کرنا شروع کر دیں گے تو وہ اپنی شریفانہ محنت کے ذریعہ اپنی روح کی تمام گندگیوں کو دھوڈالیں گے۔

خواجہ نصر الدّین کے خیالات کا یہ رجحان ان کے بارے میں بہت سے قصّوں سے ثابت ہوتا ہے جن پر ان کے روحانی جذبات کا ٹھپّہ ہے۔ ان میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ حالانکہ ان کی یاد کو داغ دادر بنانے کی بہتیری کوششیں کی گئیں، محض کمینے رشک و حسد کی وجہ سے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئیں کیونکہ جھوٹ سچ پر کبھی غالب نہیں آسکتا۔ خواجہ نصر الدّین کی یاد ہمیشہ اس ہیرے کی طرح درخشاں اور خالص رہے گی جو سب باتوں کے باوجود اپنی چمک دمک برقرار رکھتا ہے۔ آج تک جو

مسافر ترکی میں آک شہر کے سادے سے مقبرے کے سامنے رُکتے ہیں اب بھی بخارا کے اس زندہ دل جہاں گرد، خواجہ نصر الدّین کا نام کلمہ خیر سے ہی لیتے ہیں۔ ایک شاعر کے الفاظ میں وہ کہتے ہیں:

"انہوں نے اپنا دل دھرتی کو دے دیا حالانکہ وہ دنیا بھر میں ہوا کی طرح چکّر لگاتے رہے، اس ہوا کی طرح جو ان کی موت کے بعد ان کے دل کی گلاب جیسی مہک ساری دنیا میں پھیلا آئی۔ دنیا کے ہمہ گیر حسن کو ہی دیکھنا زندگی کا حسن ہے۔ وہی زندگی حسین ہے جو ختم ہونے کے بعد اپنی روح کے خالص جذبات چھوڑ جاتی ہے۔"

یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آک شہر کے مقبرے میں کوئی دفن نہیں ہے اور خواجہ نصر الدّین نے اس کو اسی مقصد کے تحت بنوایا تھا کہ ان کی موت کی خبر پھیل جائے اور پھر وہ جہاں گردی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ یہ سچ ہے یا نہیں؟ ہمیں بیکار قیاس آرائیوں میں وقت نہ گنوانا

چاہیے۔ ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ نصر الدّین سے ہر طرح کی باتوں کی توقع ہو سکتی ہے۔

۳۲

صُبح کا وقت جلد ہی گزر گیا اور پھر گرم اور امس بھری دوپہر آئی۔ اب فرار کے لیے سب کچھ تیّار تھا۔ خواجہ نصر الدّین اوپر اپنے قیدی کے پاس گئے۔

"آپ کی قید کی مدّت ختم ہونے والی ہے، دانائے روزگار مولانا حسین۔ آج رات کو میں محل چھوڑ دوں گا۔ میں آپ کا دروازہ ایک شرط پر کھلا چھوڑ سکتا ہوں ۔ آپ دو دن تک یہ جگہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر آپ جلدی نکلے تو مجھے محل میں پائیں گے اور پھر میں اس بات پر مجبور ہوں گا کہ آپ پر بھاگنے کا الزام لگا کر جلّاد کے حوالے کر دوں۔ بغداد کے دانا،

مولانا حسین، خدا حافظ۔ آپ میرے متعلّق بہت بُرا خیال نہ کریں۔ میں آپ کو یہ فریضہ سپرد کرتا ہوں کہ آپ امیر کو سچی بات بتائیں اور اس کو میرا نام بتائیں۔ میرا نام خواجہ نصر الدّین ہے۔"

"کیا؟" بُڈّھے نے حیرت سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ وہ نام کو سن کر ہی ہکّا بکّارہ گیا۔

دروازے کے بند ہونے کی چرچراہٹ ہوئی۔ زینوں پر خواجہ نصر الدّین کے قدموں کی آواز غائب ہو گئی۔ بُڈّھا احتیاط کے ساتھ دروازے تک گیا اور اس کو آزمایا۔ وہ مقفّل نہیں تھا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا، کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے زنجیر لگا لی۔

"نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں پورے ہفتے یہیں پڑے رہنے کو ترجیح دوں گا بمقابلہ اس کے کہ پھر خواجہ نصر الدّین سے پالا پڑے۔"

رات کو جب فیروزی آسمان پر پہلے ستارے جھلملائے، خواجہ نصر الدّین ایک مٹّی کی صراحی لے کر ان پہرے داروں کے پاس گئے جو امیر کے حرم کے پھاٹک پر متعیّن تھے۔ پہرے داروں نے اُن کو آتے نہیں دیکھا اور اپنی بات چیت جاری رکھی:

"وہ دیکھو، ایک اور ستارہ ٹوٹا۔" کچّے انڈے کھانے والے موٹے اور کاہل پہرے دار نے کہا۔ "اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ زمین پر ِگرتے ہیں تو لوگ ان کو پاتے کیوں نہیں؟"

"شاید وہ سمندر میں ِگرتے ہیں۔" دوسرے پہرے دار نے کہا۔

"ارے، بہادر سپاہیو!" خواجہ نصر الدّین بیچ میں بولے۔ "خواجہ سراؤں کے داروغہ کو تو بُلانا۔ میں بیمار داشتہ کے لیے دوا لایا ہوں۔"

خواجہ سراؤں کا داروغہ آیا اور ادب سے دونوں ہاتھ بڑھا کر چھوٹی سی صراحی سنبھالی جس میں چونے کے پانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا، دوا کے استعمال کی ہدایات سُنیں اور چلا گیا۔

"دانائے روزگار مولانا حسین۔" موٹے پہرے دار نے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تو دنیا کی ہر بات جانتے ہیں۔ آپ کا علم و فضل تو بے پناہ ہے۔ ہمیں بتایئے کہ آسمان سے ٹوٹ کر ستارے کہاں گرتے ہیں اور لوگ ان کو کیوں نہیں پاتے؟"

خواجہ نصر الدّین بھلا مذاق سے باز آسکتے تھے۔

"تم نہیں جانتے؟" انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ "جب ستارے گِرتے ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے چاندی کے سِکّوں میں ٹوٹ جاتے ہیں جو فقیر چُن لیتے ہیں۔ بہت سے آدمی تو اس طرح امیر بن گئے۔"

پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر سخت حیرت کے آثار تھے۔

خواجہ نصر الدّین ان کی حماقت پر ہنستے ہوئے اپنے راستے پر چلے گئے۔ ان کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ مذاق اتنا کارآمد ثابت ہو گا۔

وہ آدھی رات تک اپنے برج میں رہے۔ آخر کار شہر اور محل میں سنّاٹا چھا گیا۔ اب وقت گنوانا نہیں تھا۔ گرمیوں کی راتیں بڑی صبا رفتار ہوتی ہیں۔ خواجہ نصر الدّین نیچے اترے اور چپکے سے امیر کے حرم کی طرف روانہ ہوئے۔

"پہرے دار اب تو سوتے ہوں گے۔" انہوں نے سوچا۔

لیکن جب وہ قریب پہنچے تو ان کو بڑی نا اُمّیدی ہوئی کیونکہ پہرے دار چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔

"اگر ایک ہی ستارہ یہاں گر جاتا۔" موٹا کاہل پہرے دار کہہ رہا تھا۔ "تو ہم چاندی بٹور کر یک دم امیر بن جاتے۔"

"مجھے یقین نہیں ہے کہ ستارے چاندی کے سکوں میں ٹوٹ جاتے ہیں۔" اس کا ساتھی بولا۔

"لیکن بغداد کے دانا نے ایسا ہی بتایا ہے۔" پہلے نے جواب دیا۔ "واقعی وہ بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اور غلطی نہیں کر سکتے ہیں۔"

"لعنت ہو اُن پر!" خواجہ نصر الدّین نے اندھیرے میں چھپتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ "میں نے ان کو ستاروں کے بارے میں بتایا ہی کیوں؟ اب وہ صُبح تک اس پر بحث کریں گے۔ کیا بھاگنا ملتوی کرنا پڑے گا؟"

بخارا کے اوپر ہزاروں ستاروں کی صاف اور پر سکون روشنی تھی۔ اچانک ایک چھوٹا سا ستارہ ٹوٹا اور آسمان کے پار انتہائی تیز رفتاری سے ترچھا گرنے لگا۔ ایک اور ستارہ اس کے بعد روانہ ہوا اور اپنے پیچھے ایک جلتی

ہوئی لکیر چھوڑتا گیا۔ یہ موسم گرما کا وسطی دور تھا جس میں ستارے کافی ٹوٹتے ہیں۔

"اگر وہ واقعی ٹوٹ کر چاندی کے سکے بن جاتے۔۔۔" دوسرے پہرے دار نے اپنی بات شروع کی۔

اچانک خواجہ نصر الدّین نے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی تھیلی نکالی جو چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ ستاروں کے گِرنے میں ایک لمبا وقفہ ہو گیا۔ آخر کار ایک ٹوٹا۔ خواجہ نصر الدّین نے ایک سِکّہ پہرے داروں کے قدموں کے پاس پھینکا۔ پتھر کے فرش پر سکے کی جھنکار ہوئی، پہلے تو پہرے دار پتھرا سے گئے۔ پھر وہ ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم نے یہ سنا؟" پہلے پہرے دار نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں میں نے سُنا۔" دوسرے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

خواجہ نصر الدّین نے ایک اور سِکّہ پھینکا جو چاندنی رات میں چمک اٹھا۔ کاہل پہرے دار ہلکی سی چیخ مار کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

"تم۔۔۔ کو مل۔۔۔ گیا؟" دوسرے پہرے دار نے مشکل سے کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس نے اٹھتے ہوئے سِکّہ دکھایا۔

اچانک کئی اور ستارے ایک ساتھ ٹوٹے اور خواجہ نصر الدّین نے مٹھی بھر بھر کر سکے پھینکنا شروع کر دیے۔ پُرسکون رات سکوں کی لطیف کھنکھناہٹ سے گونج سی گئی۔ پہرے دار بالکل بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے اپنے نیزے تو الگ پھینکے اور جھک کر سکے تلاش کرنے لگے۔

"یہ رہا!" ایک کی بھاری گھٹی گھٹی ہوائی آواز آئی۔ "یہ رہا!"

دوسرا خاموشی سے رینگ رہا تھا۔ پھر وہ کثرت سے سکے پھیلے ہوئے دیکھ کر گھگیا گیا۔

خواجہ نصر الدّین نے ایک اور مٹھی سکے پھینکے اور بلا روک ٹوک پھاٹک کے اندر داخل ہو گئے۔

باقی کام آسان تھا۔ نرم، گداز ایرانی قالینوں پر ان کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تمام موڑوں اور پیچیدہ راستوں سے واقف تھے۔ خواجہ سرا سو رہے تھے۔۔۔

گُل جان نے ان کا خیر مقدم ایک محبّت بھرے بوسے سے کیا اور کانپتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

"جلدی کرو۔" انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

کوئی ان کو روکنے والا نہ تھا۔ ایک خواجہ سرا نے کروٹ لی اور نیند میں بڑبڑایا۔ خواجہ نصر الدّین اس پر جھک گئے لیکن اس کی زندگی ابھی باقی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ چاٹے اور پھر خرّاٹے بھرنے لگا۔ رنگین شیشوں سے ہلکی چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔

پھاٹک پر خواجہ نصر الدّین رکے اور انہوں نے چاروں طرف سے نظر دوڑ آئی۔ صحن میں پہرے دار اپنے چاروں ہاتھوں پیروں پر ٹکے ہوئے گردنیں اوپر اٹھا اٹھا کر دیکھ آسمان کو تک رہے تھے کہ کوئی اور ستارہ ٹوٹے۔ خواجہ نصر الدّین نے ایک مٹھی بھر اور سکے پھینکے جو کچھ درختوں کے دوسری طرف جا کر گرے۔ پہرے دار اپنے بوٹ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے آواز کی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے اپنے ہیجان میں چاروں طرف کچھ نہیں دیکھا اور زور زور سے ہانپتے اور شور مچاتے ہوئے خار دار جھاڑیوں کے اس پار دوڑے جن کے کانٹوں میں ان کی قباؤں اور شلواروں کے چیتھڑے پھٹ کر لٹک گئے۔

اس رات کو تو حرم سے ایک کیا ساری داشتائیں اغوا کی جا سکتی تھیں۔

"جلدی کرو، جلدی۔" خواجہ نصر الدّین برابر کہتے جاتے تھے۔

وہ دوڑ کر برج تک گئے اور زینوں پر چڑھے۔ خواجہ نصر الدّین نے اپنے بستر کے نیچے سے ایک رسّی نکالی۔ یہ انہوں نے پہلے سے تیّار کر لی تھی۔

"بہت اونچا ہے۔۔۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" گُل جان نے چپکے سے کہا لیکن خواجہ نصر الدّین نے اس کو ڈانٹا تو اس نے اپنے اوپر قابو پالیا۔

خواجہ نصر الدّین نے گُل جان کے گرد ایک پھندا باندھ دیا اور کھڑکی کا جنگلا نکال دیا جو انہوں نے پہلے ہی کاٹ ڈالا تھا۔ گُل جان کھڑکی کے باہر پتھر پر بیٹھی تھی۔ وہ بلندی دیکھ کر کانپ گئی۔

"باہر نکلو!" خواجہ نصر الدّین نے حکم دیا اور اس کو پیچھے سے ہلکا سا دھکا دیا۔

گُل جان نے آنکھیں بند کر لیں، چکنے پتھر پر سے پھسل کر ہوا میں لٹک گئی۔ زمین پر پہنچ کر اس کے حواس بجا ہوئے۔

"بھاگو، بھاگو!" اوپر سے آواز آئی۔ خواجہ نصر الدّین کھڑکی سے باہر جھکے ہوئے اپنے ہاتھ ہلا رہے تھے اور رسی اوپر کھینچ رہے تھے۔ گُل جان نے جلدی سے اپنے کو رسّی سے کھولا اور سنسان چوک میں سے ہو کر بھاگی۔

اس کو پتہ نہیں تھا کہ پورے محل میں زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ خواجہ سراؤں کے داروغہ کے ناخوشگوار تجربے نے اس میں بے وقت کا جوش پیدا کر دیا تھا اور وہ آدھی رات کو نئی داشتہ کے کمرے میں نگہبانی کے لیے پہنچ گیا لیکن وہاں تو بستر خالی تھا۔ وہ بھاگتا ہوا گیا اور امیر کو جگا دیا۔ امیر نے ارسلان بیک کو طلب کر لیا۔ ارسلان بیک نے محل کے پہرے داروں کو جگایا۔ مشعلیں روشن ہو گئیں، نیزوں اور سپروں کی جھنکار گونجنے لگی۔

بغداد کے مولانا حسین کی طلبی ہوئی۔ امیر نے چیختے ہوئے شکایت کی:

"مولانا حسین! ہماری ریاست کی اب یہ حالت پہنچ گئی ہے کہ ہمیں، امیر اعظم کو یہ بدمعاش خواجہ نصرالدّین ہمارے محل تک میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا! ایسا تو کبھی سنا بھی نہیں گیا تھا کہ امیر کے حرم سے داشتہ چوری ہو جائے!"

امیر اعظم بختیار نے بولنے کی ہمّت کی۔ ”شاید یہ خواجہ نصر الدّین کی حرکت نہ تھی؟“

”اور کون ہو سکتا ہے؟“ امیر تیز آواز میں چیخا۔ ”صُبح کو ہمیں رپورٹ ملی کہ وہ بخارا واپس آ گیا ہے اور رات میں ہماری داشتہ غائب ہو گئی جو اس کی منگیتر تھی۔ اس کے سوا اور کون یہ کر سکتا تھا؟ اس کو تلاش کرو۔ ہر جگہ پہرے داروں کی تعداد تگنی کر دی جائے۔ اس کو محل سے باہر نکلنے کا وقت نہیں ملا ہے۔ ارسلان بیک، یاد رکھو، تمہارے سر کی خیریت نہیں ہے!“

تلاش شروع ہو گئی۔ پہرے داروں نے محل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مشعلوں نے اپنے لہراتے ہوئے شعلوں سے سارا محل روشن کر دیا۔ خواجہ نصر الدّین ڈھونڈنے والوں میں سب سے پیش پیش تھے۔ انہوں نے قالین اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ سنگ مرمر کے حوضوں میں عصا ڈال کر کھنگالا،

غل مچایا، دوڑ دھوپ کی اور چائے دانیوں اور صراحیوں میں جھانک جھانک کر دیکھا حتیٰ کہ چوہوں کے بل بھی نہ چھوڑے۔

امیر کی خواب گاہ میں جا کر انہوں نے رپورٹ پیش کی۔ "شہنشاہ اعظم، خواجہ نصر الدّین محل سے نکل گیا۔"

"مولانا حسین!" امیر نے غصّے میں جواب دیا۔ "ہمیں تمہاری لاپروائی پر حیرت ہے۔ مان لو وہ کہیں چھپ گیا ہو تو؟ ارے، وہ تو میری خواب گاہ میں بھی گھس سکتا ہے۔ ارے، پہرے داروں کو بلاؤ، پہرے دارو ادھر آؤ!" امیر چلایا۔ وہ خود اپنے ہی تصوّر سے ڈر گیا تھا۔

باہر ایک توپ دغی۔ اس کا مقصد ہاتھ نہ آنے والے خواجہ نصر الدّین کو خوف زدہ کرنا تھا۔ امیر ایک کونے میں گٹھری بن کر پڑ گیا اور چلانے لگا:

"پہرے داروں کو بلاؤ! پہرے داروں کو بلاؤ!"

اس کا ڈر اسی وقت دور ہوا جب ارسلان بیک نے خواب گاہ کے دروازوں پر تیس پہرے دار تعینات کر دیے اور ہر کھڑکی کے پاس دس دس پہرے دار مقرّر کر دیے گئے۔ اب وہ کونے سے باہر نکلا اور فریاد آمیز لہجے میں کہنے لگا:

"مولانا حسین مجھے بتاؤ۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ بدمعاش میری خواب گاہ میں کہیں چھپا ہے؟"

"دروازوں اور کھڑکیوں پر پہرہ لگا دیا گیا ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے جواب دیا۔ "اس کمرے میں ہم دو ہیں۔ خواجہ نصرالدّین کہاں ہو سکتا ہے؟"

"اس کو ہماری داشتہ اغوا کرنے کی سزا بھگتنی پڑے گی!" امیر گرجا۔ اب اس کے خوف کی جگہ غصّہ لے رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو اس طرح جھٹکا جیسے وہ خواجہ نصرالدّین کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ "ارے مولانا حسین۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہمیں بے انتہا غم و غصّہ ہے! ہم اس کے

پاس ایک بار بھی نہیں گئے۔ اس خیال سے ہمارا دل ملتا ہے۔ یہ سب تمہارے حماقت بھرے ستاروں کا قصور ہے، مولانا۔ اگر ہمارا بس چلتا تو اس گستاخی کے لیے ہم تمام ستاروں کا سر یک دم قلم کروا دیتے۔ لیکن اس بار خواجہ نصر الدّین سزا پائے بغیر نہیں جا سکتا۔ ہم ارسلان بیک کو حکم دے چکے ہیں اور مولانا تم بھی اس بد معاش کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کرو! یہ نہ بھولو کہ خواجہ سراؤں کے داروغہ کا معزّز عہدہ تمہیں ملنے کا انحصار اس کام میں کامیابی پر ہے۔ کل تم محل سے جاؤ گے اور خواجہ نصر الدّین کے بغیر واپس نہیں آؤ گے۔"

خواجہ نصر الدّین اپنی شرارت آمیز آنکھیں نچاتے ہوئے زمین تک جھک کر تعظیم بجالائے۔

۳۳

باقی رات خواجہ نصر الدّین امیر کو اپنے منصوبے بتاتے رہے کہ وہ خواجہ نصر الدّین کو کس طرح گرفتار کریں گے۔ یہ منصوبے بڑی چالاکی کے تھے اور امیر ان کو سُن کر بہت خوش ہوتا رہا۔

صُبح کو خواجہ نصر الدّین کو اخراجات کے لیے ایک خریطہ اشرفیوں کا عطا ہوا اور وہ آخری بار اپنے برج کے زینوں پر چڑھے۔ انہوں نے یہ رقم ایک چمڑے کی دہمیانی میں رکھی اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ انہوں نے ایک آہ بھری کیونکہ ان کو یہ جگہ چھوڑنے پر اچانک افسوس ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اپنی بہت سی بے خواب راتیں نہ جانے کیا سوچتے ہوئے

یہاں گزاری تھیں۔ ان سنگین دیواروں کے پیچھے ان کی روح کا کوئی حصّہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے گا۔

انہوں نے زور سے دروازہ بند کیا اور نیچے کی طرف زینوں پر بھاگے۔ وہ آزادی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر ساری دنیا ان کے سامنے ہو گی۔ سڑکیں، پہاڑی درّے اور راستے ان کو دور دراز کی سیاحت کے لیے پکار رہے تھے۔ سر سبز جنگلات ان کے لیے اپنے سائے اور نرم پتیوں کے قالین پھیلائے کھڑے تھے۔ دریا اپنی خنک پانی سے ان کی پیاس بجھانے کے منتظر تھے۔ چڑیاں اپنے بہترین نغموں سے ان کے خیر مقدم کے لیے تیّار تھیں۔ زندہ دل آوارہ گرد خواجہ نصر الدّین کافی دن تک سونے کے پنجرے میں بند رہا تھا۔ دنیا اس کی بڑی کمی محسوس کر رہی تھی۔

جب وہ پھاٹک پر پہنچے تو انہیں ایسا صدمہ ہوا جس سے ان کا دل دہل گیا۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ان کو دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

کھلے پھاٹک میں پہرے داروں سے گھرے ہوئے ان کے دوستوں کی لمبی قطار لگی تھی۔ ان کے ہاتھ بندھے تھے اور سر ڈھلکے ہوئے تھے۔ اس میں بُڈّھا کمہار نیاز، چائے خانے کا مالک علی، آہن گر یوسف اور بہت سے دوسرے لوگ تھے جن جن سے ان کی کبھی ملاقات ہوئی تھی، جن کے ہاتھ سے انہوں نے کبھی پانی پیا تھا یا مٹھی بھر گھاس اپنے گدھے کے لیے لی تھی۔ سب وہاں بندھے ہوئے تھے۔ ارسلان بیک اس اندوہناک جلوس کے پیچھے پیچھے تھے۔

جس وقت تک خواجہ نصر الدّین کے حواس بجا ہوئے، پھاٹک بند ہو چکے تھے اور صحن خالی تھا۔ قیدی کال کوٹھریوں میں جا چکے تھے۔ خواجہ نصر الدّین نے جلدی سے ارسلان بیک کو تلاش کیا۔

”جناب ارسلان بیک، کیا ہوا؟ یہ لوگ کہاں کے ہیں؟ انہوں نے کیا گناہ کیا ہے؟“

"یہ لوگ پاجی خواجہ نصر الدّین کے پناہ دینے والے اور اس کے ساتھ مل کر سازشیں کرنے والے ہیں!" ارسلان بیک نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔ "میرے جاسوسوں نے ان کا پتہ لگایا ہے اور آج ان کو کھلے عام بری طرح موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اگر انہوں نے خواجہ نصر الدّین کا پتہ نہ بتایا۔ لیکن آپ اتنے زرد کیوں ہیں، مولانا؟ آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔۔۔"

"زرد؟" خواجہ نصر الدّین نے حیرت سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ انعام مجھ کو نہیں تم کو ملے گا!"

خواجہ نصر الدّین کو مجبوراً محل میں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ معصوم لوگوں کی جان کا خطرہ تھا۔

دوپہر کو چوک پر فوج تعینات ہوگئی۔ اس نے تین تین کی قطاروں میں چبوترے کے چاروں طرف حلقہ بنالیا۔ مجمع کو نقیبوں نے بتادیا تھا کہ کچھ

لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی اور وہ خاموشی سے منتظر تھا۔ صاف آسمان سے چلچلاتی ہوئی دھوپ آرہی تھی۔

محل کے پھاٹک کھلے اور دستور کے مطابق پہلے آگے آگے دوڑتے ہوئے نقیب آئے، پھر پہرے دار اور ان کے پیچھے سازندے، ہاتھی اور درباری۔ آخر میں امیر کی پالکی آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی آئی۔ سارا مجمع تعظیم کے لیے جھک گیا۔ پالکی چبوترہ تک لائی گئی۔

امیر تخت پر بیٹھ گیا۔ مجرم پھاٹک سے باہر لائے گئے۔ ان کو دیکھ کر مجمع میں ہلکا شور ہوا۔ مجرموں کے رشتے دار اور دوست آگے کی قطاروں میں کھڑے تھے تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکیں۔

جلادوں نے اپنے تیشے، نوکیلے ستون اور رسیاں ٹھیک کرنا شروع کر دیں۔ ان کو پورا دن کام کرنا تھا کیونکہ یکے بعد دیگرے ساٹھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

اس جان لیوا جلوس میں بڈّھے نیاز کا نمبر پہلا تھا۔ اس کے دائیں طرف سولی تھی اور بائیں طرف تختہ اور سامنے ایک نوکیلا ستون زمین سے اوپر ابھرا ہوا تھا۔

وزیر اعظم بختیار نے بڑی سنجیدہ اور پاٹ دار آواز میں اعلان کیا:

"اس اللہ کے نام پر جو رحیم و کریم ہے بخارا کے حکمران، آفتاب جہاں، امیر بخارا نے میزان انصاف میں اپنی رعایا کے ساٹھ افراد کو تولنے کے بعد جو ناپاک امن شکن بانی شر و فساد خواجہ نصر الدّین کو پناہ دینے سے متعلق ہیں مندرجہ ذیل حکم دیا ہے:

"کمہار نیاز کو خاص پناہ دینے والے کی حیثیت سے جس کے گھر میں متذکرہ بالا آوارہ گرد خواجہ نصر الدّین نے بہت دن تک پناہ لی یہ سزا دی جاتی ہے کہ اس کا سر جسم سے جدا کر دیا جائے۔ جہاں تک دوسرے مجرموں کا سوال ہے پہلی سزا تو ان کے لیے یہ ہوگی کہ وہ نیاز کی موت کا نظارہ کریں تاکہ وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک انجام کی توقع کر کے کانپ

سکیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے موت کے طریقے کا الگ الگ اعلان کیا جائے گا۔"

پورے میدان میں ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ بختیار کا ایک ایک لفظ مجمع کی آخری قطاروں تک سنائی دے رہا تھا۔

"اور سب کو یہ معلوم ہونا چاہیے۔" بختیار نے اپنی آواز اور بلند کرتے ہوئے اعلان جاری رکھا۔ "کہ آئندہ بھی جو کوئی خواجہ نصر الدّین کو پناہ دے گا اس کا یہی انجام ہو گا۔ ایک بھی جلّاد کے ہاتھوں نہیں بچے گا۔ بہر حال اگر کوئی بھی مجرم اس ناپاک بدمعاش کا پتہ بتا دے گا تو وہ نہ صرف اپنی جان کی امان پائے گا بلکہ وہ امیر کے انعام و اکرام اور دعاؤں کے ساتھ دوسرے مجرموں کی جان بخشی کا باعث بھی ہو گا۔ کمہار نیاز کیا تو خواجہ نصر الدّین کا پتہ بتا کر خود اپنے کو اور دوسروں کو نجات دِلوائے گا؟

نیاز بڑی دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب بختیار نے اپنا سوال دہرایا تو نیاز نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں ہیں۔“

جلادوں نے بڈّھے کو تختے کی طرف گھسیٹا۔ کوئی مجمع سے چیخا۔ بُڈّھا نیاز جھک گیا، اپنی گردن بڑھا کر اپنا سفید بالوں والا سر تختے پر رکھ دیا۔

اس لمحے خواجہ نصر الدّین درباریوں کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے اور امیر کے سامنے آئے۔

”ولی نعمت!“ انھوں نے زور سے کہا تا کہ پورا مجمع سن سکے۔ ”حکم دیجئے کہ سزا روک دی جائے۔ خواجہ نصر الدّین کو یہاں اور ابھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔“

امیر نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ مجمع میں ہلچل ہوئی۔ امیر کے اشارے پر جلّاد نے تیشہ اپنے قدموں تک نیچا کر لیا۔

"شہنشاہ اعظم!" خواجہ نصر الدّین نے بُلند آواز میں کہا۔ "کیا یہ انصاف ہو گا کہ ان حقیر پناہ دینے والوں کو سولی دی جائے اور بڑا پناہ دینے والا کوئی سزا نہ پائے، وہ جس کے گھر میں خواجہ نصر الدّین اس زمانے میں رہتے تھے اور اب بھی ہیں، جو ان کو کھانا دیتا ہے، ان کو انعام دیتا ہے اور ہر طرح ان کی خاطر مدارات کرتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" امیر نے شان سے کہا۔ "اگر ایسا پناہ دینے والا ہے تو انصاف کے مطابق اس کا سر سب سے پہلے قلم ہونا چاہیے۔ لیکن ہمیں بتاؤ تو وہ کون ہے، مولانا حسین؟"

سارے مجمع میں چاؤں چاؤں ہونے لگی۔ آگے جو لوگ تھے وہ پیچھے کے لوگوں کو بتانے لگے کہ امیر نے کیا کہا۔

"لیکن اگر امیر اعظم اس بڑے پناہ دینے والے کو سولی نہ دینا چاہیں، اگر امیر اس کو زندہ رکھنا چاہیں تو کیا ایسی صورت میں ان حقیر پناہ دینے والوں کو سولی دینا انصاف ہو گا؟" خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔

امیر نے اور زیادہ پریشان ہو کر جواب دیا۔ ”اگر ہم بڑے پناہ دینے والے کو سولی نہ دینا چاہیں تو واقعی ہمیں دوسروں کو آزاد کر دینا چاہیے۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا مولانا حسین کہ ہمیں کون سا سبب بڑے پناہ دینے والے کو سولی دینے سے باز رکھ سکتا ہے۔ ہم کو اس کا نام بتاؤ اور ہم فوراً اس کا سر گردن سے اڑا دیں گے۔“

خواجہ نصر الدّین مجمع کی طرف مُڑے اور انہوں نے کہا:

”آپ نے امیر کے الفاظ سنے؟ بخارا کے حکمران نے فرمایا کہ اگر وہ بڑے پناہ دینے والے کو سولی نہیں دیتے جس کا نام میں ابھی ابھی بتاؤں گا تو ان تمام حقیر پناہ دینے والوں کو جو سولی پر کھڑے ہیں رہا کر دیا جائے گا اور وہ اپنے اپنے گھر والوں سے ملیں گے۔ میں نے سچ عرض کیا ہے نا، عالی جاہ؟“

"تم نے سچ کہا ہے، مولانا حسین۔" امیر نے تصدیق کی۔ "ہم قول دیتے ہیں اس لیے یہی ہو گا۔ لیکن جلدی کرو اور بڑے پناہ دینے والے کو بتاؤ۔"

"آپ سُن رہے ہیں نا؟" خواجہ نصرالدّین نے مجمع سے پوچھا۔ "امیر نے قول دیا ہے۔"

انہوں نے گہری سانس لی۔ انہوں نے دیکھا کہ ہزاروں نگاہیں ان کی طرف لگی ہیں۔

"بڑا پناہ دینے والا۔۔۔" وہ رُک گئے اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ بہت سے لوگوں نے ان کے چہرے پر سخت پریشانی اور کوفت کے آثار دیکھے۔ وہ پیاری دنیا، لوگوں اور اپنے پیارے سورج سے رُخصت ہو رہے تھے۔

"جلدی کرو!" امیر بے چینی سے چلایا۔ "جلدی بتاؤ، مولانا!"

خواجہ نصر الدّین نے پر عزم گونجتی ہوئی آواز میں کہا:

"بڑے پناہ دینے والے۔۔۔ آپ ہیں، اے امیر!"

اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنا عمامہ اُتار کر پھینک دیا اور اپنی مصنوعی داڑھی نوچ ڈالی۔

سارا مجمع ہکّا بکّا رہ گیا، اس میں ایک لہر سی پیدا ہوئی اور پھر مکمل سنّاٹا چھا گیا۔ امیر کی آنکھیں نکل پڑیں، اس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی لیکن کوئی آواز نہیں نکلی۔ درباری اس طرح کھڑے تھے جیسے پتھرا گئے ہوں۔

لیکن یہ خاموشی مختصر تھی۔

"خواجہ نصر الدّین! خواجہ نصر الدّین!" مجمع میں غلغلہ مچ گیا۔

"خواجہ نصر الدّین!" درباریوں نے سرگوشی میں کہا۔

"خواجہ نصر الدّین!" ارسلان بیک حیرت سے بولا۔

آخر کار امیر کے حواس اتنے بجا ہوئے کہ وہ بھی دھیمی آواز میں بڑبڑا سکا :

"خواجہ نصرالدّین!"

"ہاں، بذاتِ خود۔ اچھا تو عالیجاہ حکم دیجئے ان کو کہ یہ آپ کا بڑے پناہ دینے والے کی حیثیت سے سر قلم کر دیں! میں آپ کے محل میں رہتا تھا۔ میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا اور آپ سے انعامات حاصل کیے۔ میں آپ کا تمام امور میں خاص اور قریبی مشیر رہا۔ امیر، آپ پناہ دینے والے ہیں۔ حکم دیجئے کہ وہ آپ کا سر قلم کر دیں!"

خواجہ نصرالدّین پکڑ لیے گئے۔ ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے لیکن انہوں نے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے زور سے کہا۔ "امیر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجرموں کو رہا کر دیں گے! آپ سب نے امیر کو قول دیتے سنا تھا!"

مجمع میں غل غپاڑہ ہونے لگا اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ پہرے داروں کا تہرا حلقہ ان کو روکنے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔ لوگ زیادہ زور زور سے چیخ رہے تھے:

"معتوبوں کو رہا کرو!"

"امیر نے قول دیا تھا!"

"رہا کرو!"

شور و غل بڑھ رہا تھا۔ پہرے داروں کا حلقہ ٹوٹنے لگا۔

بختیار نے جھک کر امیر سے کہا:

"آقائے نامدار، ان لوگوں کو آزاد کر دینا چاہیے ورنہ عام بغاوت ہو جائے گی۔"

امیر نے سر ہلا دیا۔

"امیر اپنے قول پر قائم ہیں!" بختیار نے چلّا کر کہا۔

پہرے داروں نے راستہ دے دیا اور معتوب لوگ فوراً مجمع میں غائب ہو گئے۔

خواجہ نصر الدّین کو محل لے جایا گیا۔ بہت سے لوگ مجمع میں ان کے پیچھے روتے چِلّاتے رہے:

"خدا حافظ خواجہ نصر الدّین! الوداع، پیارے، شریف دل خواجہ نصر الدّین! آپ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے!"

خواجہ اپنا سر اونچا کیے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے چہرے سے نڈر پن کا اظہار ہوتا تھا۔ پھاٹک پر وہ مُڑے، رُخصت ہوتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ مجمع نے ایک زور کا نعرہ لگایا۔

امیر جلدی جلدی اپنی پالکی میں بیٹھ گیا اور شاہی جلوس واپس ہو گیا۔

۳۴

خواجہ نصرالدّین کا فیصلہ کرنے کے لیے مخصوص دیوان طلب کیا گیا۔

جب وہ سخت پہرے میں ہتھکڑیاں پہنے ہوئے داخل ہوئے تو سارے درباریوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ ان کو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ دانا بھی تیوریاں چڑھائے اپنی داڑھیاں سہلا رہے تھے۔ امیر نے بھی مُنہ موڑ کر گہری سانس لی اور اپنا گلا صاف کرنے لگا۔

لیکن خواجہ نصرالدّین بڑی جرأت کے ساتھ نگاہ ملا کر سب کو دیکھ رہے تھے۔ اگر ان کے ہاتھ پیچھے نہ بندھے ہوتے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ

ملزم وہ ہیں بلکہ یہ سب لوگ جو مجرم نظر آتے تھے جو ان کے سامنے بیٹھے تھے۔

بغداد کا دانا اصل مولانا حسین جو آخر کار اپنی قید سے نجات پا چکا تھا اس مجلس میں دوسرے درباریوں کے ساتھ حاضر تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے اس کی طرف دوستانہ انداز میں آنکھ ماری جس پر بغداد کا دانا اپنی جگہ پر کسمسایا اور غصّے میں گہری سانس لی۔

فیصلہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔ خواجہ نصر الدّین کو سزائے موت دی گئی۔ صرف یہ طے کرنا باقی رہ گیا کہ ان کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا جائے۔

''شہنشاہ اعظم۔'' ارسلان بیک نے کہا۔ ''میرے خیال میں مجرم کو نوکیلے ستون پر بٹھا کر مارنا چاہیے تا کہ اس کی زندگی کا خاتمہ سخت کرب کی حالت میں ہو۔''

خواجہ نصر الدّین نے اپنا رونگٹا بھی نہیں ہلایا۔ وہ خوش خوش مُسکرا رہے تھے۔ انہوں نے اپنا چہرہ ایک سورج کی کرن کی طرف کر لیا جو اوپر کی کھلی ہوئی کھڑکی سے ہال میں آ رہی تھی۔

"نہیں۔" امیر نے قطعی طور پر کہا۔ "ترکی کے سلطان اس کافر کو نوکیلے ستون پر بٹھا کر ختم کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ غالباً وہ اس طرح کی موت سے بچنے کی صورت جانتا ہے، نہیں تو بھلا یہ سلطان کے ہاتھ سے زندہ جان کیسے نکل سکتا تھا!"

بختیار نے مشورہ دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

"یہ سچ ہے کہ بہت ہی آسان موت ہو گی۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ سب سے یقینی بھی ہے۔"

"نہیں۔" امیر نے کہا۔ "خلیفہ بغداد نے اس کا سر قلم کروا دیا لیکن وہ ابھی تک زندہ ہے۔"

یکے بعد دیگرے درباری اُٹھ اُٹھ کر اپنی تجویزیں پیش کرنے لگے۔ کوئی کہتا کہ ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے تو کوئی یہ مشورہ دیتا کہ ان کی کھال کھنچوائی جائے۔ اس نے خواجہ نے چہرے پر خوف کی کوئی نشانی نہ دیکھ کر یہ سمجھا کہ ان طریقوں کے ناکافی ہونے کا یہی ثبوت ہے۔

درباری لاچار ہو کر خاموش ہو گئے۔ امیر کے چہرے پر بے صبری اور غصّے کے آثار نظر آنے لگے۔

بغداد کا دانا اُٹھا۔ چونکہ وہ پہلی مرتبہ امیر کے سامنے زبان کھولنے جارہا تھا اس لیے اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے مشورہ کو تول لیا تھا تا کہ اپنے عقل و دانش کی برتری کا مظاہرہ کر سکے۔

"جہاں پناہ! اگر یہ مجرم ابھی تک تمام سزاؤں سے صحیح سلامت بچ نکلتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کو ارواحِ خبیثہ سے، تاریکی کی ایسی بدروحوں سے مدد ملتی ہے جن کا نام امیر کی موجودگی میں لینا گستاخی ہو گی؟"

یہ کہہ کر دانا نے اپنے شانوں کے اوپر دُعا پڑھ کر پھونکی جس کی پیروی خواجہ نصرالدّین کے سوا سب نے کی۔

"مجرم کے بارے میں تمام معلومات پر غور و خوض کرنے اور تولنے کے بعد۔" دانا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہمارے امیر نے اس کو موت کی سزا دینے کے تمام طریقوں کو اس خوف سے مسترد کر دیا ہے کہ ارواحِ خبیثہ پھر مجرم کی مدد کریں گی اور وہ منصفانہ سزا سے بچ جائے گا۔ لیکن سزائے موت کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو مبینہ ملزم پر نہیں آزمایا گیا اور وہ ہے، ڈبو دینا!"

بغداد کے دانا نے فخر سے سر اُٹھا کر سارے مجمع کو دیکھا۔

خواجہ نصرالدّین ہلکے سے چونک پڑے اور امیر نے اُس حرکت کو دیکھ لیا "اچھا! تو یہ تھا اس کا راز۔"

اس دوران خواجہ نصرالدّین سوچ رہے تھے:

"یہ بڑی اچھی علامت ہے کہ اِن لوگوں نے ارواحِ خبیثہ کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی اُمّید نے بالکل سانس نہیں توڑ دی ہے۔"

"میں نے جو کچھ سنا اور پڑھا ہے اس سے مجھے علم ہے۔" دانا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کہ بخارا میں ایک مقدّس تالاب ہے جس کو شیخ احمد کا تالاب کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ارواحِ خبیثہ اس تالاب کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتیں۔ اس لیے جہاں پناہ، اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجرم کو کافی دیر تک اس مقدس پانی میں ڈبوئے رکھا جائے۔ اس کے بعد وہ مر جائے گا۔"

"یہ مشورہ انعام کے قابل ہے!" امیر نے کہا۔

خواجہ نصر الدّین نے مولانا حسین سے مخاطب ہو کر ملامت آمیز لہجے میں کہا:

"مولانا حسین! جب تم میرے بس میں تھے تو کیا میں نے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا؟ اس کے بعد انسان کیسے کسی کے احسان کا اعتبار کر سکتا ہے!"

یہ طے کیا گیا کہ خواجہ نصر الدّین کو غروبِ آفتاب کے بعد شیخ احمد کے مقدس تالاب میں سرِ عام ڈبو دیا جائے گا۔ اس خیال سے کہ وہ راستے میں بھاگ نہ سکیں ان کو ایک چمڑے کے تھیلے میں تالاب تک لے جایا جائے گا اور اسی میں ان کو ڈبو دیا جائے گا۔

۔۔۔سارے دن بڑھئیوں کے بسولے تالاب کے کنارے گونجتے رہے جہاں ایک پلیٹ فارم بنایا جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امیر کو وہاں پلیٹ فارم کی کیوں ضرورت ہے لیکن ان کے لیے چارہ ہی کیا تھا جب ہر بڑھئی کے سر پر ایک پہرے دار سوار تھا؟ وہ خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ ان کے چہرے افسردہ اور ملول تھے۔ جب کام ختم ہو گیا تو ان کو جو معمولی

اجرت دی جا رہی تھی وہ اس سے انکار کر کے سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔

پلیٹ فارم اور تالاب کا وہ کنارہ جس پر پلیٹ فارم تھا قالینوں سے ڈھک دیے گئے۔ سامنے کا کنارہ عام لوگوں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

جاسوسوں نے مخبری کی کہ سارے شہر میں بڑا ہنگامہ ہے۔ احتیاط کے لیے ارسلان بیک نے تالاب کے چاروں طرف بے شمار سپاہی تعینات کر دیے اور توپیں لگا دیں۔ اس ڈر سے کہ مبادا لوگ خواجہ نصر الدّین کو راستے میں نہ چھڑا لیں ارسلان بیک نے چار بورے چیتھڑوں سے بھروا لیے۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ ان چاروں بوروں کو عام سڑکوں سے علانیہ تالاب تک بھیجے گا اور جس بورے میں خواجہ نصر الدّین ہوں گے اس کو ویران گلیوں سے لایا جائے گا۔ اس نے اپنے پُر فن منصوبے میں یہ اضافہ کیا کہ نقلی بوروں پر تو آٹھ آٹھ پہرے دار رکھے اور اصلی کے ساتھ صرف تین۔

"میں تمہیں تالاب سے ہرکارہ بھیجوں گا۔" ارسلان بیک نے پہرے داروں سے کہا۔ "اور تم نقلی بورے فوراً یکے بعد دیگرے روانہ کر دینا اور پانچواں جس میں مجرم ہو گا ذرا بعد میں اس طرح بھیجنا کہ لوگوں کی توجّہ اس طرف نہ جائے، اس وقت جبکہ پھاٹک کا مجمع نقلی بوروں کے پیچھے ہو لے، سمجھے نا؟ یاد رکھو کہ یہ تمہارے سر دھڑ کا سوال ہے۔"

شام کو نقّاروں کی گونج نے بازار ختم ہونے کا اعلان کیا۔ ہر طرف سے لوگوں کا سیلاب اُمڈ کر تالاب کی طرف چلا۔ جلد ہی امیر بھی اپنے ماہی مراتب کے ساتھ پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم پر اور اس کے چاروں طرف مشعلیں جلا دی گئیں۔ ان کی لوئیں ہوا میں پھن پھنا اور لہرا رہی تھیں اور پانی پر خونیں شعاعیں ڈال رہی تھیں۔ سامنے والا کنارہ تاریکی میں غلطاں تھا۔ پلیٹ فارم سے مجمع تو نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے چلنے پھرنے کی ہلچل تو سنائی دے رہی تھی جو رات کی ہوا کے جھونکوں میں غیر واضح اور بے چین آوازوں کا اضافہ کر رہی تھی۔

بختیار نے پاٹ دار آواز میں خواجہ نصر الدّین کی سزائے موت کے لیے امیر کا فرمان پڑھا۔ اس لمحے ہوا بھی ساکن ہو گئی اور ایسی مکمل خاموشی چھا گئی کہ تقدس مآب امیر کا دل بھی کانپ اٹھا۔ پھر ہوا نے آہ بھری اور اس کے ساتھ ہزاروں سینوں سے بھی آہ نکلی۔

"ارسلان بیک۔" امیر نے گھبرا کر کہا۔ "دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

"عالی جاہ! میں نے ہرکارہ روانہ کر دیا ہے۔"

اچانک اندھیرے سے غل غپاڑے اور ہتھیاروں کی جھنکار کی آواز آئی۔ کہیں لڑائی چھڑ گئی تھی۔ امیر اچھل پڑا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک منٹ بعد پلیٹ فارم کے سامنے روشنی کے حلقے میں آٹھ پہرے دار خالی ہاتھ آئے۔

"مجرم کہاں ہے؟" امیر گرجا۔ "انہوں نے پہرے داروں سے چھین لیا! وہ بھاگ نکلا! یہ سب تیری وجہ سے ہوا، ارسلان بیک!"

"عالی جاہ!" ارسلان بیک نے جواب دیا۔ "آپ کا ناچیز غلام یہ سب پہلے سے جانتا تھا۔ بورا تو پرانے چیتھڑوں سے بھرا تھا۔"

سامنے والے کنارے سے پھر لڑائی کی آواز آرہی تھی۔ ارسلان بیک نے جلدی جلدی امیر کو اطمینان دلایا:

"آقائے نامدار! ان کو بورا لے جانے دیجئے۔ یہ بھی پرانے چیتھڑوں سے بھرا تھا۔"

پہلا بورا تو پہرے داروں سے چائے خانے کے مالک علی اور اس کے دوستوں نے چھینا تھا اور دوسرا یوسف کی قیادت میں آہن گروں نے۔ پھر کمہاروں نے تیسرا بورا چھینا۔ لیکن اس میں صرف چیتھڑے بھرے تھے۔ چوتھے بورے کو پہرے دار بلا روک ٹوک لے گئے۔ پہرے داروں نے اس کو مشعلوں سے روشن پانی پر سارے مجمع کے سامنے اُلٹ دیا۔ وہ چیتھڑوں سے بھرا تھا۔

پریشان اور متحیر مجمع خاموش کھڑا تھا۔ یہ تھا ارسلان بیک کا منصوبہ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تذبذب کا نتیجہ لاچاری ہوتا ہے۔

اب پانچویں بورے سے نبٹنے کا وقت آگیا تھا۔ اس دوران میں ان پہرے داروں کو جو اسے لا رہے تھے راستے میں دیر ہو گئی تھی اور وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔

۳۵

جب پہرے داروں نے خواجہ نصر الدّین کو کال کوٹھری سے نکالا تو انہوں نے کہا:

"وہ تم مجھ کو یہاں سے اپنی پیٹھ پر لے جاؤ گے؟ افسوس کہ میرا گدھا یہاں نہیں ہے ورنہ وہ تو ہنستے ہنستے دم توڑ دیتا۔"

"بند کرو اپنی زبان! تو خود جلدی روئے گا!" پہرے داروں نے ڈانٹ بتائی۔ وہ اس کو معاف نہیں کر سکتے تھے کہ خواجہ نے خود کو اپنے آپ امیر کے حوالے کر کے ان کو انعام سے محروم کر دیا تھا۔

انہوں نے تنگ بورے کو پھیلا کر اس میں خواجہ نصر الدّین کو ٹھونسنا شروع کر دیا۔

"ارے شیطان کے بچّو!" خواجہ نصر الدّین جو تہرے ہو چکے تھے چلّائے "تم کو اس سے بڑا بورا نہیں ملا؟"

"چپ رہ!" پہرے داروں نے ہانپتے اور پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "زیادہ دیر نہ لگے گی۔ دیکھ حرام زادے، زیادہ پھیلنے کی کوشش نہ کر، نہیں تو ہم تیرے گھٹنے تیرے پیٹ میں اُتار دیں گے!"

اب ہاتھا پائی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے محل کے سارے ملازم جمع ہو گئے اور بڑی کشمکش کے بعد پہرے دار خواجہ نصر الدّین کو بورے میں ٹھونس کر اس کو رسّی سے باندھ سکے۔ بورے میں بڑی امس، تاریکی اور بدبُو تھی۔ خواجہ نصر الدّین کے دل پر ایک سیاہ غبار چھا گیا۔

فرار کا کوئی راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے قسمت اور ہمہ گیر طاقت رکھنے والے موقع سے اپیل کی۔

"اے قسمت جس نے ماں کی طرح مجھے پالا ہے اور اے ہمہ گیر طاقت رکھنے والے موقع جس نے ابھی تک مجھے باپ کی طرح بچایا ہے تم کہاں ہو؟ تم خواجہ نصر الدّین کی مدد کو جلدی سے کیوں نہیں آتے؟ اے قسمت! اے ہمہ گیر طاقت رکھنے والے موقع!"

اس دوران میں پہرے دار تالاب کا آدھا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ وہ باری باری بورے کو لے جا رہے تھے۔ دو سو قدم کے بعد بدلی کر لیتے تھے۔ خواجہ نصر الدّین رنج و غم کے مختصر وقفوں کو گن رہے تھے اور پتہ چلا رہے تھے کہ کتنا فاصلہ ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ قسمت اور موقع اس کا کبھی ساتھ نہیں دیتے جو عمل کرنے کی بجائے صرف رونا پیٹنا اور فریاد کرتا رہتا ہے۔ وہی آدمی منزل تک پہنچتا ہے جو آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اگر اس کے پیر کمزور ہوں اور کام

نہ دیں تو اسے چاروں ہاتھوں پیروں پر آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ تو پھر ضرور اس کو رات میں دور شعلہ ور الاؤ اور صحیح راستے پر چلنے والا کارواں نظر آئے گا اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اس کو فاضل اونٹ بھی مل جائے گا۔ جبکہ وہ آدمی جو سڑک کے کنارے بیٹھ کر یاس سے ہار مان لے گا، اس کے لیے سنگ دل پتھروں میں کوئی ہمدردی نہ پیدا ہو گی وہ چاہے جتنا روئے اور فریاد کرے۔ وہ ریگستان میں پیاسا مر جائے گا، اس کی لاش بدبودار لکڑ بگھوں کی خوراک بن جائے گی اور اس کی ہڈّیاں تپتی ہوئی ریت میں دفن ہو جائیں گی۔ کتنے ہی آدمی وقت آنے سے پہلے مر گئے کیونکہ ان میں زندہ رہنے کا عزم مضبوط نہ تھا! خواجہ نصرالدّین کسی حقیقی انسان کے لیے ایسی موت باعث شرم سمجھتے تھے۔

"نہیں۔" وہ دانت بھینچ کر اپنے آپ سے بار بار کہہ رہے تھے۔ "نہیں، آج مجھے نہیں مرنا چاہیے! میں مرنا نہیں چاہتا!"

لیکن وہ کر کیا سکتے تھے۔ وہ تہرے گڑ مڑ ائے اور بورے میں اس طرح ٹھنسے ہوئے تھے کہ ہلنا بھی ناممکن تھا۔ ان کے گھٹنے اور کہنیاں جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ صرف ان کی زبان آزاد تھی۔

"ارے سور ماؤ!" انہوں نے اپنے بورے کے اندر سے کہا۔ "ذرا رکو، میں مرنے سے پہلے دُعا کرنا چاہتا ہوں تا کہ اللہ مجھ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔"

پہرے داروں نے بورا زمین پر رکھ دیا۔

"اچھا چل دُعا کر۔ لیکن ہم تجھ کو بورے سے باہر نہیں نکالیں گے۔ بورے کے اندر ہی دُعا کر۔

"ہم کہاں ہیں ؟" خواجہ نصر الدّین نے پوچھا۔ "مجھے جاننا چاہیے کیونکہ تمہیں میرا مُنہ قریب ترین مسجد کی طرف کرنا پڑے گا۔"

"ہم قرشی دروازے کے قریب ہیں۔ یہاں تو چاروں طرف مسجدیں ہی مسجدیں ہیں۔ جلدی سے دُعا کر۔ ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

"شکریہ، پاکباز سورماؤ۔" خواجہ نصر الدّین نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

ان کو کیا توقع تھی؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے سوچا۔ "میں چند منٹ کی مہلت حاصل کر لوں اور پھر دیکھا جائے گا۔ شاید کچھ ہو ہی جائے۔۔۔"

انہوں نے زور زور سے دُعا شروع کی لیکن ساتھ ہی پہرے داروں کی باتیں بھی سنتے گئے۔

"ہم کیسے یہ نہ سمجھ پائے کہ نیا نجومی خواجہ نصر الدّین ہے؟" پہرے دار افسوس کر رہے تھے۔ "اگر ہم اس کو پہچان کر پکڑ لیتے تو امیر سے ہمیں بڑا انعام ملتا۔"

وہ ہمیشہ کی طرح سوچ رہے تھے۔

"دُعا جلدی ختم کر۔" ایک پہرے دار نے بورے پر لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ "سنتا ہے نا؟ اب زیادہ دیر نہیں انتظار کر سکتے۔"

"بس ایک منٹ اور، بہادر سورماؤ! مجھے اللہ سے بس ایک اور التجا کرنا ہے۔ اے پروردگار، رحیم و کریم! میری یہ دُعا قبول کر لے کہ جو آدمی میرے دفن کیئے ہوئے دس ہزار تانگے پائے وہ ان میں سے ایک ہزار مسجد لے جا کر ملا کو دے اور اس سے کہے کہ وہ میرے لیے پورے سال دُعا کرے۔"

دس ہزار تانگوں کا نام سنتے ہی پہرے دار خاموش ہو گئے۔ حالانکہ خواجہ نصر الدّین بورے سے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن وہ ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ ان کے چہروں کا کیا رنگ تھا، وہ کس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر کہنیاں مار رہے تھے۔

"اب مجھے اٹھاؤ۔" خواجہ نصر الدّین نے بڑے عجز سے کہا۔ "میں اپنی روح خدا کے حوالے کرتا ہوں۔"

پہرے دار تذبذب میں پڑ گئے۔

"ہم ذرا دیر اور آرام کر لیں۔" ایک پہرے دار نے چالاکی سے کہا۔ "ارے، خواجہ نصر الدّین یہ نہ سمجھنا کہ ہم سنگ دل اور برے لوگ ہیں۔ فرض سے مجبور ہیں۔ اس لیے تمہارے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ اگر ہم امیر کی تنخواہ کے بغیر اپنے گھروں میں رہ سکتے تو ہمیں تم کو چھوڑ دینے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔۔۔"

"ارے، کیا کہہ رہے ہو؟" دوسرے پہرے دار نے پریشان ہو کر چپکے سے کہا۔ "اگر ہم اس کو چھوڑ دیں تو امیر ہمارے سر قلم کروا دیں گے۔"

"چپ رہو۔" پہلے پہرے دار نے اس کو سرگوشی میں ڈانٹا۔ "ہم تو اس کی رقم ہتھیانا چاہتے ہیں۔"

خواجہ نصر الدّین ان کی کھسر پھُسر تو نہیں سن سکے لیکن یہ تو سمجھ ہی گئے کہ کس کے بارے میں یہ سب ہو رہا ہے۔ "مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، سورماؤ۔" خواجہ نصر الدّین نے ریاکاری سے آہ بھر کر کہا۔ "میں کسی کو کیا بُرا سمجھوں گا، میں خود بڑا گنہگار ہوں۔ اگر اللہ نے عقبیٰ میں میرے گناہ معاف کر دیے تو میں اس کے تخت کے نیچے تم لوگوں کی بخشائش کی دعائیں کروں گا۔ تم کہتے ہو کہ اگر امیر کی تنخواہ کا سوال نہ ہوتا تو تم مجھے بورے سے نکال دیتے۔ سوچو تو کیا کہہ رہے ہو! تم امیر کے حکم کی خلاف ورزی کرو گے جو بڑا گناہ ہے! نہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے اپنی روح کو گناہوں سے آلودہ کرو۔ بورا اٹھاؤ اور مجھے تالاب تک لے جاؤ۔ امیر اور اللہ کی مرضی پوری ہونے دو!"

پہرے داروں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں خواجہ نصر الدّین کو اس اچانک اور ناوقت توبہ کے لیے کوس رہے تھے۔

اب تیسرا پہرے دار جو ابھی تک خاموش تھا اور کوئی اچھی ترکیب سوچ رہا تھا آخر کار بولا:

"موت کے وقت کسی آدمی کو اپنے گناہوں اور غلطیوں پر توبہ کرتے دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف آنکھ ماری۔ "لیکن میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے مدّتوں ہوئے توبہ کر لی ہے اور جب سے پاکیزہ زندگی گزار رہا ہوں۔ ایسی توبہ جس کے ساتھ کوئی عمل نہ ہو اللہ کو خوش نہیں کر سکتی۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی جبکہ دوسرے دو پہرے دار اپنے مُنہ پر ہاتھ رکھے ہوئے اپنی ہنسی روک رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ پہرے دار بڑا جواری اور عیاش ہے۔ "اسی لیے میں اپنی توبہ کو اچھے اور پاک کاموں سے مضبوط کرتا رہتا ہوں۔ میں اپنے گاؤں میں ایک بڑی مسجد بنوا رہا ہوں جس کے لیے میں اور میرا خاندان بھوکا تک رہتا ہے۔"

اب ایک پہرے دار سے ضبط نہ ہو سکا اور ہنستی سے بے اختیار ہو کر وہ تھوڑی دور چلا گیا۔

"میں ایک ایک پیسہ بچاتا ہوں۔" پہرے دار نے اپنی بات جاری رکھی "پھر بھی مسجد کی تعمیر اتنی سست رفتاری سے ہو رہی ہے کہ میرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ چند ہی دن ہوئے میں نے اپنی گائے بیچ دی ہے اور ممکن ہے کہ مجھے اپنا آخری جوڑی جوتا بیچنا پڑے۔ میں ننگے پیر رہنے کے لیے تیّار ہوں اگر میں اس کام کی تکمیل کر سکوں جو میں نے شروع کیا ہے۔"

خواجہ نصر الدّین نے بورے کے اندر سے سسکی بھری۔ پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کو کامیابی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے چالاک ساتھی کو کہنی ماری کہ جلدی کرے۔

"کاش کہ مجھے کوئی ایسا مل جاتا جو اس مسجد کی تکمیل کے لیے آٹھ دس ہزار تانگے دے دیتا!" اس نے کہا۔ "میں اس سے قسم کھا کر یہ وعدہ کرتا

کہ پانچ سال یا دس سال تک بھی اس کا نام خوشبویات کے مرغولوں میں لپٹا مسجد کی محرابوں سے نکلتا اور تخت خداوندی کی طرف بلند ہوتا!"

دوسرا پہرے دار بولا:

"ارے میرے پاکباز ساتھی! میرے پاس دس ہزار تانگے تو نہیں ہیں لیکن کیا تم میری ساری پونجی قبول کروگے جو پانچ سو تانگے ہے۔ یہ میری حقیر پیش کش مسترد نہ کرو کیونکہ میں بھی اس پاک کام میں حصّہ لینا چاہتا ہوں۔"

"اور میں بھی۔" تیسرے نے اپنی ہنسی کو دبا کر ہکلاتے ہوئے اور کانپتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس تین سو تانگے ہیں۔۔۔"

"اے پاکباز انسان، اے مومن!" خواجہ نصر الدّین رونی آواز میں چلّائے۔ "کاش کہ میں تمہاری قبا کا دامن چوم سکتا! میں بڑا گنہگار ہوں لیکن میرے ساتھ عنایت کرو اور میرا تحفہ مسترد نہ کرو۔ میرے پاس

دس ہزار تانگے ہیں ۔ جب میں دھوکہ دے کر امیر کی خدمت میں مقبول ہو گیا تو انہوں نے اکثر مجھے اشرفیوں اور چاندی کے سکوں کی ٹھیلیاں عطا کیں۔ میں نے دس ہزار تانگے بچا کر ان کو چھپا دیا۔ ارادہ یہ تھا کہ بھاگتے وقت ان کو نکال لوں گا۔ چونکہ میں قرشی دروازے سے بھاگنا چاہتا تھا اس لیے میں نے قرشی قبرستان میں ایک پرانی لوحِ مزار کے نیچے اُن کو دفن کر دیا تھا۔"

"قرشی قبرستان میں!" سب پہرے دار چلّائے۔ "تب تو یہ رقم کہیں قریب ہی ہے۔"

"ہاں، اب ہم قبرستان کے شمالی سِرے پر ہیں اور اگر کوئی۔۔۔"

"ہم مشرقی سِرے پر ہیں۔ تمہاری رقم کہاں۔۔۔ کہاں دفن ہے؟"

"وہ قبرستان کے مغربی سِرے پر دفن ہے۔" خواجہ نصرالدّین نے کہا۔ "لیکن ایمان دار پہرے دارو! پہلے یہ قسم کھاؤ کہ واقعی دس سال تک مسجد میں میرے نام پر روز فاتحہ پڑھا جائے گا۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔" وہ پہرے دار چلّایا جو بہت بے چین ہو رہا تھا۔ "میں خدا اور اس کے پیغمبر کی قسم کھاتا ہوں! اب جلدی بتاؤ کہ رقم کہاں گڑی ہے؟"

خواجہ نصرالدّین نے تھوڑا سا توقّف کیا۔ "اگر انہوں نے مجھ کو پہلے تالاب پر لے جانے اور رقم کل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا تو کیا ہو گا؟"

انہوں نے سوچا۔ "نہیں، یہ نہیں ہو گا۔ ان پر تو حرص اور بے صبری کا دیو سوار ہے۔ پھر ان کو ایک دوسرے پر بھی تو اعتبار نہیں ہے۔ اچھا تو کون سی جگہ بتانا چاہیے جہاں وہ امکانی طور پر زیادہ سے زیادہ دیر تک کھودتے رہیں؟"

پہرے دار بورے پر جھکے کھڑے تھے۔ خواجہ نصر الدّین ان کے ہانپنے کی آواز سن رہے تھے جیسے وہ کہیں سے دوڑ کر آ رہے ہوں۔

"قبرستان کے مغربی سرے پر تین پرانے مقبرے ایک مثلث کی صورت میں ہیں۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "ان میں سے ہر ایک کے نیچے میں نے تین ہزار تین سو تینتیس اور ایک تہائی تانگہ گاڑے ہیں۔"

"مثلث میں۔" پہرے داروں نے اس طرح ایک ساتھ دہرایا جیسے کسی عالم سے کوئی آیت حفظ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ "ہر ایک کے نیچے تین ہزار تین سو تینتیس اور ایک تہائی تانگہ۔۔۔"

انہوں نے یہ طے کیا کہ دو تو رقم تلاش کرنے جائیں اور تیسرا پہرے پر رہے گا۔ اس بات پر شاید خواجہ نصر الدّین نا اُمّید ہو جاتے اگر اُن کو انسانی افعال کی پیش بینی کا تجربہ نہ ہوتا۔ ان کو یقین تھا کہ تیسرا پہرے دار بھی زیادہ دیر تک پہرے پر نہیں رہے گا اور انہوں نے غلطی نہیں

کی تھی۔ تنہائی میں پہرے دار بے چینی سے آہیں بھرنے، کھانسنے اور ٹہلنے لگا۔ اس کے اسلحہ بج رہے تھے۔ ان آوازوں سے خواجہ نصرالدّین اس کے خیالات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ پہرے دار اپنے حصّے کے تین ہزار تین سو تینتیس اور ایک تہائی تانگوں کے لیے پریشانی میں مبتلا تھا۔ خواجہ نصرالدّین صبر سے انتظار کر رہے تھے۔

"ان کو بڑی دیر لگ رہی ہے۔" پہرے دار نے کہا۔

"شاید وہ رقم کو کسی دوسری جگہ دفن کر رہے ہوں اور کل تم سب مل کر اس کو لے جاؤ گے۔" خواجہ نصرالدّین نے کہا۔

یہ الفاظ کام کر گئے۔ پہرے دار کی سانس زور سے چلنے لگی اور پھر اس نے جماہی لینے کی بناوٹ کی۔

"میں مرنے سے پہلے تزکیۂ نفس کے لیے کوئی کہانی سُننا چاہتا ہوں۔"
خواجہ نصر الدّین اپنے بورے سے بولے۔ "شاید تمہیں کوئی یاد ہو، مہربان پہرے دار؟"

"نہیں!" پہرے دار نے غصّے سے کہا۔ "میں کوئی ایسی کہانی نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ میں تھک گیا ہوں۔ میں جا کر گھاس پر لیٹتا ہوں۔"

لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ سخت اور پتھریلی زمین پر اس کے قدموں کی آواز دور تک گونجتی ہے۔ پہلے تو وہ آہستہ چلا، پھر خواجہ نصر الدّین نے اس کے تیز چلنے کی آواز سُنی۔ اب پہریدار دوڑنے لگا۔

اب عمل کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن خواجہ نصر الدّین اِدھر اُدھر بے سُود لڑھک رہے تھے۔ رسّی کسی طرح نہیں ٹوٹ رہی تھی۔

"راہ گیر!" خواجہ نصر الدّین نے دُعا کی۔ "اے قسمت، کوئی راہ گیر بھیج دے!"

اور قسمت نے ایک راہ گیر بھیج دیا۔

قسمت اور مناسب موقع ہمیشہ اس کی مدد کرتے ہیں جو مکمل عزم رکھتا ہے اور آخر تک ہاتھ پاؤں مارتا ہے (ہم یہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں لیکن دہرانے سے حقائق کی اہمیت نہیں کم ہوتی)۔ خواجہ نصر الدّین پوری طاقت سے اپنی زندگی بچانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور قسمت مدد سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

راہ گیر آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ خواجہ نصر الدّین نے اس کے قدموں کی آواز سے بھانپ لیا کہ لنگڑا تھا اور معمّر بھی کیونکہ وہ ہانپ رہا تھا۔

بورا سڑک کے بیچوں بیچ پڑا تھا۔ راہ گیر رُک گیا۔ اس نے بڑی دیر تک بورے کو دیکھا اور اس میں دو تین بار چھڑی گڑوئی۔

"بورے میں کیا ہو سکتا ہے؟ یہ کہاں سے آیا؟" چچیاتے ہوئے لہجے میں راہ گیر نے کہا۔

مرحبا! خواجہ نصر الدّین نے جعفر سُود خور کی آواز پہچان لی۔ اب ان کو اپنے بچ نکلنے کے بارے میں کوئی شُبہ نہیں رہا۔ بس، پہرے دار ذرا جلدی نہ لوٹیں۔

وہ اس طرح آہستہ سے کھانسے کہ سُود خور گھبرائے نہیں۔

"اچھا، اس کے اندر آدمی ہے!" جعفر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں، واقعی آدمی ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے اپنی آواز بدلتے ہوئے سکون سے کہا۔ "یہ کوئی عجیب بات ہے؟"

"عجیب بات؟ تم بورے میں کیوں گھسے؟"

"یہ میرا معاملہ ہے، اپنے راستے جاؤ اور اپنے سوالوں سے مجھے پریشان نہ کرو۔"

خواجہ نصر الدّین سمجھ گئے کہ اب سُود خور کو اشتیاق پیدا ہو گیا ہے اور وہ جائے گا نہیں۔

"یہ واقعی غیر معمولی بات ہے۔" سُود خور نے کہا۔ "کہ آدمی بورے میں بند ہو۔ کیا تم کو کسی نے زبردستی اس میں ٹھونسا ہے؟"

"زبردستی؟" خواجہ نصر الدّین نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اس بورے میں زبردستی ٹھونسے جانے کے چھ سو تانگے دیتا؟"

"چھ سو تانگے! تم نے یہ رقم کیوں دی؟"

"راہ گیر! میں تم کو سارا قصّہ بتا دوں گا بشرطیکہ تم اس کو سُننے کے بعد اپنی راہ لگو اور مجھے زیادہ نہ چھیڑو۔ یہ بورا ایک عرب کا ہے جو ہمارے شہر بخارا میں رہتا ہے۔ اس بورے میں تمام بیماریوں اور جسمانی نقائص کو اچھا کرنے کی صفت ہے۔ اس کا مالک صرف بڑی رقم پر اس کو مُستعار دیتا ہے اور وہ بھی سب کو نہیں۔ میں لنگڑا، کبڑا اور کانا تھا۔ میں شادی کرنا چاہتا تھا، میرے ہونے والے سسر نے یہ نہیں چاہا کہ میری دلہن کی نظر ان نقائص پر پڑے اس لیے وہ مجھے اس عرب کے پاس لے گئے جس نے مجھ کو یہ بورا چھ سو تانگے کے عوض میں چار گھنٹے کے لیے کرائے پر دیا ہے۔

''چونکہ یہ بورا صرف قبرستانوں کے قریب ہی اپنی معجز نما مسیحائی دکھاتا ہے اس لیے میں غروبِ آفتاب کے بعد قرشی کے اس پرانے قبرستان آیا ہوں۔ میرے سسر نے جو میرے ساتھ آئے تھے رسّی سے بورے کو باندھ دیا اور چلے گئے کیونکہ کسی دوسرے کی موجودگی میں علاج ناممکن ہے۔ بورے کے مالک عرب نے مجھے متنبّہ کر دیا ہے کہ جیسے ہی میں تنہا ہوں گا تین جن خوب شور مچاتے اور تانبے کے پر کھڑکھڑاتے نمودار ہوں گے۔ وہ انسانوں کی آواز میں مجھ سے پوچھیں گے کہ قبرستان کے کس حصّے میں دس ہزار تانگے دفن ہیں ۔ اس کے جواب میں مجھے یہ پُراسرار منتر پڑھنا چاہیے، جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے۔ عقاب کی جگہ اُلّو بیٹھا ہے۔ ارے جنو، تم وہ ڈھونڈ رہے ہو جو میں نے چھپایا ہی نہیں تھا۔ اس لیے میرے گدھے کی دم چوم لو!''

"سب کچھ عرب کے کہنے کے مطابق ہوا۔ جنوں نے آکر مجھ سے پوچھا کہ دس ہزار تانگے کہاں دفن ہیں۔ میرا جواب سن کر وہ بھڑک اُٹھے اور انہوں نے مجھے خوب پیٹا لیکن میں عرب کی ہدایت کو یاد رکھتے ہوئے برابر یہی چلاتا رہا، جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے۔۔۔۔ میرے گدھے کی دم چوم لو! پھر جن بورے کو اُٹھا کر لے چلے۔۔۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں۔ دو گھنٹے بعد جب میں ہوش میں آیا تو میں اسی جگہ پر تھا اور بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ میرا کوبڑ غائب ہو گیا ہے، میرا پیر سیدھا ہے اور میری آنکھ سے دکھائی دینے لگا ہے۔ اس کا یقین مجھے بورے کے ایک سوراخ سے جھانک کر ہوا جو شاید پہلے کسی نے بورے میں بنایا ہو گا۔ اب میں صرف اس کے اندر اس لیے بیٹھا ہوں کہ اتنی رقم دینے کے بعد اس کو ضائع کیوں کروں۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے کسی اور آدمی سے سمجھوتہ کر لیا ہوتا جس میں بھی یہ نقائص ہوتے۔ تب ہم بورے کے کرائے کی رقم آدھی آدھی

بانٹ لیتے۔ ہم دونوں دو دو گھنٹے بورے میں رہتے اور اس طرح ہمیں اپنے علاج کے تین تین سو تانگے فی کس پڑتے۔ لیکن کچھ نہیں ہو سکتا۔ رقم ضائع ہو جانے دو۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ میں خدا خدا کر کے اچھا ہو گیا۔

"راہ گیر، اب تمہیں سارا قصّہ معلوم ہو گیا ہے۔ اب اپنا قول پورا کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میں شفا پانے کے بعد کمزوری محسوس کر رہا ہوں اور میرے لیے بولنا مشکل ہے۔ تم سے پہلے نو آدمی مجھ سے یہی سوالات کر چکے ہیں اور میں بار بار یہ باتیں دہرانے سے عاجز آ چکا ہوں۔"

سُود خور بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ خواجہ نصر الدّین کے بیان کے درمیان بار بار حیرت کے الفاظ کہہ اٹھتا تھا۔

"بورے میں بیٹھنے والے، سُن۔" سُود خور نے کہا۔ "ہم دونوں اپنی ملاقات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ تجھ کو اس بات کا افسوس ہے کہ تُو نے بورے کے کرائے میں کسی اپنے ایسے مریض کو حصّہ دار کیوں نہ بنایا

لیکن ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ اتّفاق سے میں ایک ایسا ہی آدمی ہوں جس کی تجھے ضرورت ہے۔ میں کوبڑا، لنگڑا اور کانا ہوں۔ میں دو گھنٹے بورے میں رہنے کے لیے خوشی سے تجھ کو تین سو تانگے دے سکتا ہوں۔"

"تم مجھے چڑھا رہے ہو!" خواجہ نصر الدّین نے جواب دیا۔ "ایسا حیرت انگیز اتّفاق ناممکن ہے! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ موقع دیا۔ میں راضی ہوں، اے راہگیر، لیکن میں تم کو بتائے دیتا ہوں کہ میں نے رقم پیشگی ادا کی ہے اور تمہیں بھی پیشگی ہی دینا ہوگا۔ میں ادھار نہیں رکھتا۔"

"میں پیشگی دوں گا۔" سُود خور نے بورے کو کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن وقت ضائع نہ کرنا چاہیے کیونکہ جو منٹ ابھی گزر رہے ہیں وہ میرے ہیں۔"

خواجہ نصر الدّین نے بورے سے باہر نکلتے ہوئے اپنا چہرہ آستین سے چھپا لیا۔ لیکن سُود خور نے تو خواجہ پر نگاہ تک نہ ڈالی۔ وہ جلدی جلدی رقم گِن

رہا تھا۔ اس کو ہر منٹ گزرنے کا قلق تھا۔ وہ بہت مشکل سے کراہ کراہ کر بورے کے اندر گھسا اور اپنا سر بھی اندر کر لیا۔

خواجہ نصر الدّین نے رسّی باندھ دی اور پھر ذرا دور جا کر ایک درخت کے سائے میں چھپ گئے۔ انہوں نے ابھی یہ کیا ہی تھا کہ قبرستان کی طرف سے پہرے داروں کی آوازیں زور زور سے برا بھلا کہتی ہوئی آنے لگیں۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے اندر سے پہلے اُن کے لمبے سائے دکھائی دیے اور پھر وہ خود نمودار ہوئے۔ ان کی پیتل کی ڈھالیں چاندنی میں چمک رہی تھیں
۔

۳۶

"اے دھوکے باز کہیں کے!" پہرے داروں نے بورے پر لاتیں رسید کرتے ہوئے کہا، ان کے ہتھیار اسی طرح کھڑ کھڑا رہے تھے جیسے تانبے کے پر کھڑ کھڑاتے۔ "ہم نے سارا قبرستان چھان مارا لیکن کچھ نہیں ملا۔ اے حرامزادے بتا، وہ دس ہزار تانگے کہاں ہیں؟"

سُود خور تو اپنا سبق اچھی طرح رٹے بیٹھا تھا۔

"جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے۔" وہ بورے کے اندر سے بولا۔ ""عقاب کی جگہ اُلّو بیٹھا ہے۔ ارے

جنو، تم وہ ڈھونڈ رہے ہو جو تم نے چھپایا ہی نہیں تھا۔ اس لیے میرے گدھے کی دم چوم لو!"

یہ الفاظ سن کر پہرے داروں کو بڑا غصّہ آیا:

"تو نے ہم کو دھوکہ دیا، کتّے کے پلّے! اور اب ہمیں کو احمق بناتا ہے! دیکھو، دیکھو بورا گرد میں لت پت ہے۔ اس نے سڑک پر لوٹ لگا کر اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش کی ہوگی جب ہم قبرستان میں کھود رہے تھے اور ہمارے ہاتھ لہو لہان ہو رہے تھے۔ ارے لومڑی کے بچّے، تجھے اس دھوکے بازی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا!"

انہوں نے بورے کو مکوں سے خوب پیٹا اور باری باری لوہے کے نعل لگے جوتوں سے خاطر کی۔ اس دوران سُود خور خواجہ نصر الدّین کی ہدایت پر سختی سے قائم رہا اور برابر یہی چلّاتا رہا۔ "جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے!" اس سے پہرے داروں کو اور بھی غصّہ آ گیا۔ وہ تو اس پاجی کو خود ہی ختم کر دیتے لیکن انہیں افسوس

تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بورا اُٹھایا اور مقدس تالاب کی طرف روانہ ہو گئے۔

خواجہ نصر الدّین اپنی پناہ گاہ سے نکلے، نہر میں مُنہ ہاتھ دھوئے اور اپنی قبا اتار دی تاکہ ان کے چوڑے چکلے سینے میں رات کی ہوا لگے۔ وہ ناقابلِ بیان ہلکا پن اور مسرّت محسوس کر رہے تھے کیونکہ موت کی سیاہ سانس ان کو جلائے بغیر گزر گئی تھی۔ انہوں نے ایک امان کی جگہ ڈھونڈلی، اپنی قبا بچھائی اور ایک پتھر کو تکیہ بنایا۔ وہ دم گھٹنے والے کسے ہوئے بورے کی قید میں بہت ہی بے حال ہو گئے تھے اور ان کو آرام کی ضرورت تھی۔ گھنے درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ آسمان پر تاروں کے سنہرے جھرمٹ تیر رہے تھے۔ نہر میں پانی قلقل کرتا بہہ رہا تھا۔ اب یہ سب پہلے کے مقابلے میں خواجہ نصر الدّین کو دس گنا عزیز تھا۔

"ہاں، دنیا میں اتنی زیادہ نیکی موجود ہے کہ اگر میرے لیے جنّت میں جگہ کی قطعی ضمانت بھی ہو جائے تو میں مرنے پر راضی نہیں ہوں گا۔ ایک

ہی درخت کے نیچے ایک ہی طرح کی حوروں میں تا ابد بیٹھے بیٹھے تو وہاں آدمی کا دم گھٹ جاتا ہو گا۔"

یہ تھے ان کے خیالات۔ وہ گرم زمین پر ستاروں کے شامیانے تلے لیٹے تھے اور کبھی نہ سونے والی، ہمیشہ رواں دواں رہنے والی زندگی کی آواز سُن رہے تھے۔ ان کا دل سینے میں دھڑک رہا تھا۔ قبرستان سے ایک اُلّو کے بولنے کی آواز آئی، کوئی چھوٹا سا جانور چپکے چپکے جھاڑیوں میں چل پھر رہا تھا۔ شاید کوئی ساھی ہو گی۔ کملائی ہوئی گھاس کی تیز مہک اُٹھ رہی تھی، ساری رات پُراسرار حرکتوں، عجیب طرح کی سرسراہٹ، رینگنے اور ٹوٹنے کی آوازوں سے بھری ہوئی تھی۔

دنیا زندہ تھی، سانس لے رہی تھی، وسیع دنیا جو سب کے لیے برابر کھلی تھی۔ اس کی بے پناہ وسعتیں چیونٹی ہو کہ چڑیا یا آدمی سب کے لیے یکساں مہمان نواز تھی اور معاوضے میں صرف یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ اس خیر مقدم اور اعتماد کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ میزبان اس مہمان کو

ذلیل کر کے نکال دیتا ہے جو دعوت کے موقع پر عام گھما گھمی سے فائدہ اٹھا کر دوسرے مہمانوں کی جیب صاف کر دیتا ہے۔ ایسا ہی چور یہ لعنتی سُود خور تھا جو مسرت سے بھرپور دنیا سے نکالا جا رہا تھا۔

خواجہ نصر الدّین کو اس کے لیے ذرا بھی افسوس نہ تھا کیونکہ اس کے خاتمے سے ہزاروں انسانوں کی قسمت بن جانے والی تھی۔ خواجہ نصر الدّین کو افسوس یہ تھا کہ سُود خور اس دنیا میں آخری شیطان نہ تھا۔ کاش کہ ایک بورے میں تمام امراء اور عمائدین کو، ملاؤں کو اور سُود خوروں کو بند کر کے ایک ساتھ شیخ احمد کے مقدس تالاب میں ڈبویا جا سکتا! تب ان کی گندی سانس درختوں کے پر بہار پھولوں کو نہ کملا سکتی، اتنے پیسے کی جھن جھن ان کے ریاکارانہ وعظ اور ان کی تلواروں کی جھنکار چڑیوں کی چہچہاہٹ پر نہ غالب آ سکتی اور آدمی دنیا کے حسن سے لطف اندوز ہونے اور اپنا انتہائی اہم فرض ادا کرنے یعنی ہر وقت اور ہر چیز سے خوش رہنے کے لیے آزاد ہوتا!

اس دوران میں پہرے داروں نے تاخیر کا ازالہ کرنے کے لیے تیز تیز چلنا شروع کیا اور آخر کار دوڑنے لگے۔ سُود خور جو بورے میں ہلنے جلنے سے چور ہوا جارہا تھا اس غیر معمولی سفر کے خاتمے کا صبر کے ساتھ انتظار رہا تھا۔ وہ اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ اور پہرے داروں کے پیروں تلے پتھروں کی آواز سن کر حیرت کر رہا تا کہ یہ طاقتور جن دوڑنے اور زمین پر اپنے تانبے کے پر اس طرح رگڑنے کی بجائے جیسا کہ جوان مرغ مرغی کا پیچھا کرتے وقت کرتے ہیں آخر ہوا میں بلند ہو کر اُڑتے کیوں نہیں ہیں؟

آخر کار دور سے ایک عجیب گرجدار آواز سنائی دی جیسے کوئی پہاڑی چشمہ گرجتا ہوا بہہ رہا ہو۔ اس سے پہلے تو سُود خور نے سوچا کہ جن اس کو کسی پہاڑ پر لائے ہیں، شاید اپنے مسکن خان تنگری میں۔ لیکن جلدی اس کو آوازیں سنائی دینے لگیں اور اس نے اندازہ لگایا کہ آدمیوں کا بڑا مجمع

ہے۔ آواز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بازار کی طرح ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ لیکن آخر کار بخارا میں رات کو کاروبار کب سے شروع ہو گیا؟

اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ اُوپر اٹھایا جا رہا ہے۔ اوہ، آخر کار جنوں نے ہوا میں اُڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ پہرے دار بورے کو زینوں کے اُوپر اٹھا کر پلیٹ فارم تک لا رہے تھے۔ اُوپر پہنچ کر انہوں نے بورا پٹخ دیا۔ وہ پٹڑوں پر گِرا جو اُس کے وزن سے ہلنے اور کھڑکھڑانے لگے۔ سُود خور زور سے کراہا۔

"ارے جنو!" وہ چلایا۔ "اگر تم بورے کو اس طرح پھینکو گے تو مجھے اچھا کرنے کی بجائے اپاہج بنا دو گے!"

اس کا جواب ایک زوردار لات سے ملا۔

"حرامزادے، تیرا علاج جلد ہی احمد کے تالاب میں ہو گا!"

سُود خور اچانک بدحواس ہو گیا۔ اس معاملے کا احمد کے مقدس تالاب سے کیا تعلّق؟ اس کی پریشانی حیرت میں بدل گئی جب اس نے قریب ہی اپنے پرانے دوست، محل کے پہرے داروں اور فوج کے کمان دار ارسلان بیک کی آواز سُنی۔ وہ قسم کھا سکتا تھا کہ یہ ارسلان بیک ہی تھا۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ یہ ارسلان بیک اچانک کہاں سے کود پڑا؟ وہ جنوں کو راستے میں تاخیر کرنے کے لیے گالیاں کیوں دے رہا ہے اور جن اس کی بات کا جواب دیتے وقت خوف اور عاجزی سے کانپ کیوں رہے ہیں؟ یہ تو ناممکن ہے کہ ارسلان بیک جنوں کا بھی سردار ہو۔ وہ کیا کرے؟ خاموش رہے یا ارسلان بیک کو پکارے؟ چونکہ سُود خور کو اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

اس دوران میں مجمع کا شور و غل اور بڑھ گیا تھا۔ عام ہنگامے میں ایک لفظ سب سے زیادہ اور اکثر سنائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زمین،

فضا اور ہوا سبھی اس لفظ سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کی ہلکی بھنبھناہٹ ہوتی، پھر شور اور گرج دور تک گونجتی چلی جاتی۔ سُود خور سانس روکے سب کچھ سن رہا تھا۔ آخر کار اس نے سنا۔

"خواجہ نصر الدّین!" مجمع میں ہزاروں لوگ چلا رہے تھے۔ "خواجہ نصر الدّین! خواجہ نصر الدّین!"

اچانک خاموشی چھا گئی اور سخت سنّاٹے میں سُود خور نے شعلہ ور مشعلوں کے پھنکنے، ہوا کی سرسراہٹ اور پانی کی کھلبلاہٹ سُنی۔ اس کی ٹیڑھی ریڑھ میں کپکپی سی دوڑ گئی اور وہ انتہائی ڈر گیا۔ خوف کی سرد سانس نے اس کو بالکل جما دیا۔

پھر ایک اور آواز سنائی دی اور سُود خور یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وزیر اعظم بختیار کی آواز ہے:

”خدا کے نام پر جو رحیم و کریم ہے اور آفتاب جہاں امیر بخارا کے حکم سے، مجرم، مرتد، امن شکن اور منافق خواجہ نصر الدّین کو ایک بورے میں بند کر کے ڈبو کر ختم کر دیا جائے گا۔“

بورے پر ہاتھ پڑے اور انہوں نے بورے کو اُٹھالیا۔ اب سُود خور کو اپنی مہلک حالت کا پتہ چلا۔

”ٹھہرو! ٹھہرو!“ وہ چلّایا۔ ”ارے تم کیا کر رہے ہو؟ ٹھہرو! میں خواجہ نصر الدّین نہیں ہوں۔ میں تو جعفر سُود خور ہوں! مجھے چھوڑ دو! میں جعفر ہوں، میں خواجہ نصر الدّین نہیں ہوں! مجھے کہاں لے جا رہے ہوں؟ میں کہہ رہا ہوں تم سے کہ میں جعفر سُود خور ہوں!“

امیر اور اس کا عملہ سُود خور کی فریاد خاموشی سے سُنتا رہا۔ بغداد کے دانا مولانا حسین نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"یہ مجرم تو انتہائی بے حیا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے بغداد کے دانا مولانا حسین کا بہروپ بھرا اور اب ہم کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ جعفر سُود خور ہے!"

"وہ خیال کرتا ہے کہ یہاں ایسے ہی احمق ہیں جو اس کی بات مان لیں گے۔" ارسلان بیک نے اضافہ کیا۔ "دیکھئے، کس طرح اس نے اپنی آواز بدلی ہے۔"

"مجھے چھوڑ دو! میں خواجہ نصر الدّین نہیں ہوں، میں جعفر ہوں!" سُود خور نے فریاد کی جب دو پہرے دار پلیٹ فارم کے کنارے آ کر بورے کو جھلانے لگے تاکہ اسے کالے پانی میں پھینک دیں۔ "میں خواجہ نصر الدّین نہیں ہوں! میں تو۔۔۔"

اسی لمحے ارسلان بیک نے اشارہ کیا اور بورے نے ہوا میں بلند ہو کر کئی قلابازیاں کھائیں۔ پھر زبردست بھچاکے کے ساتھ وہ پانی میں ِگرا جس سے ایک فوّارہ سا بُلند ہوا جو مشعلوں کی سُرخ روشنی میں چمکا اور پھر گہرے

پانی نے جعفر سُود خور کے گنہگار جسم اور گنہگار روح کو اپنے آغوش میں لے لیا۔

مجمع سے ایک زبردست آہ بلند ہو کر رات میں پیوست ہو گئی۔ چند لمحے تک ایک بھیانک خاموشی رہی اور پھر اچانک ایک زور دار اور دل میں اُتر جانے والی چیخ نے اُس کو چکنا چور کر دیا۔ یہ تھی گُل جان جو چیخ پڑی تھی اور اپنے بڈّھے باپ کے بازوؤں میں تڑپ رہی تھی۔

چائے خانے کے مالک علی نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور آہن گر یوسف اس طرح کانپنے لگا جیسے اس کو لرزے کا دورہ پڑا ہو۔

۳۷

سزائے موت کے بعد امیر معہ اپنے ماہی مراتب کے محل واپس گیا۔

اس ڈر سے کہ کہیں مرنے سے پہلے مجرم کو بچانہ لیا جائے ارسلان بیک نے تالاب کے چاروں طرف پہرہ لگادیا اور حکم دے دیا کہ کسی کو قریب نہ آنے دیا جائے۔ مجمع پہرے داروں کے ریلے پر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر ایک بڑی ماتمی اور خاموش بھیڑ کی صورت میں اکٹھا ہو گیا۔ ارسلان بیک نے ان کو منتشر کرنے کی کوشش کی لیکن لوگ دوسری طرف ہٹ جاتے یا تاریکی میں چھپ جاتے اور پھر ذرا دیر بعد اسی جگہ واپس آ جاتے۔

محل میں بڑی چہل پہل تھی۔ امیر اپنے دشمن پر فتح کا جشن منا رہا تھا۔ ہر طرف سونا چاندی چمک رہا تھا، کیتلیاں اُبل رہی تھیں، انگیٹھیوں سے دھواں نکل رہا تھا اور طنبوروں کے نغمے بکھر رہے تھے، نفیریاں بج رہی تھیں اور نقّاروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جشن کے سلسلے میں اتنی روشنی تھی کہ اُس کی سرخی سے سارے محل میں آگ سی لگی معلوم ہوتی تھی۔

امیر نے بڑی فیاضی سے انعامات تقسیم کیے۔ اس دن بہتوں پر نظر عنایت ہوئی۔ شاعروں کی آوازیں قصیدے پڑھتے پڑھتے بیٹھ گئیں اور چاندی اور سونے کے سکے جھک کر اُٹھاتے اُٹھاتے کمریں رہ گئیں۔

"رقعہ نویس کو بلاؤ۔" امیر نے حکم دیا۔

رقعہ نویس دوڑتا ہوا آیا اور جلدی جلدی اپنے کلک کے قلم سے لکھنے لگا۔

"بخارا کے عظیم اور صاحب شان و شوکت، آفتاب کو شرمانے والے حکمران، بخارا کے سپہ سالار اور پیشوائے دین، امیر بخارا کی طرف سے عظیم اور صاحبِ شان و شوکت حکمران، خیوا کے سپہ سالار اور پیشوائے دین سلامتی اور خیر سگالی کے پھول قبول فرمائیں۔ ہم آپ کو، اپنے عزیز اور شاہ بھائی کو ایک خبر بھیج رہے ہیں جس سے آپ کا دل خوشی سے بھر جائے گا۔

"آج کے دن، ۱۷ صفر کو، ہم نے، بخارا کے امیر اعظم نے، خواجہ نصر الدّین کو سرِ بازار سزائے موت دی۔ یہ مجرم ساری دنیا میں اپنی ناپاک اور مرتدانہ سرگرمیوں کے لیے مشہور تھا، خدا کی لعنت ہو اس پر۔ ہم نے اس کو ایک بورے میں بند کر کے ڈبو دیا۔ یہ واقعہ مابدولت کی موجودگی میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا اس لیے ہم اپنے شاہانہ الفاظ کے ذریعے شہادت پیش کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا بدمعاش، امن و

امان شکن، مرتد اور منافق اب زندوں میں نہیں ہے اور اب آپ کو، ہمارے عزیز بھائی کو اپنی کفر کی باتوں سے پریشان نہیں کرے گا۔"

اسی طرح کے خطوط بغداد کے خلیفہ، ترکی کے سلطان، ایران کے شاہ، قوقند کے خان اور افغانستان کے امیر اور بہت سے نزدیک و دور کے بادشاہوں کو لکھوائے گئے۔ وزیر اعظم بختیار نے خطوں کو لپیٹ کر ان پر مہر لگائی اور ہر کاروں کو یہ حکم دے کر حوالے کیا کہ وہ فوراً اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جائیں ۔ اس رات بخارا کے سب کے سب گیارہ پھاٹک زور سے چرچراتے چیختے کھلے اور ہر طرف کی شاہراہوں پر ہر کارے چل پڑے۔ ان کے گھوڑوں کے سموں کے نیچے پتھر کھڑ کھڑا رہے تھے اور چنگاریاں اُڑ رہی تھیں ۔ وہ خیوا، تہران، استنبول، بغداد، کابل اور بہت سے دوسرے شہروں کو جا رہے تھے۔

۔۔۔ تالاب کے سنّاٹے میں، سزائے موت کے چار گھنٹے بعد، ارسلان بیگ نے تالاب سے پہرہ ہٹا لیا۔

"وہ چاہے شیطان ہی کیوں نہ ہو، پانی کے اندر چار گھنٹے رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔" ارسلان بیک نے کہا۔ "اس کو نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو چاہے وہ اُس مُردار کی لاش لے جاسکتا ہے۔"

اندھیرے میں پہرے داروں کے غائب ہوتے ہی مجمع شور مچاتا ہوا تالاب کے کنارے کی طرف بڑھا۔ پہلے سے تیّار کی ہوئی مشعلیں جو جھاڑیوں میں رکھی تھیں جلائی گئیں۔ عورتوں نے خواجہ نصرالدّین کے انجام پر رونا دھونا شروع کر دیا۔

"ہمیں ان کی تجہیز و تکفین ایک سچّے مومن کی طرح کرنی چاہیے۔" بُڈّھے نیاز نے کہا۔ گُل جان ساکت و صامت اپنے باپ کے سہارے کھڑی تھی۔

چائے خانے کا مالک علی اور آہن گر یوسف آنکڑے دار ڈنڈا لیے ہوئے پانی میں کود ے۔ وہ بہت دیر تک تلاش کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے بورا پکڑ لیا اور اس کو گھسیٹ کر کنارے تک لائے۔ وہ سطح پر آیا۔ سیاہ،

مشعلوں میں چمکتا ہوا بورا جو پانی کی گھاس سے اور بھی پھول گیا تھا۔ عورتوں نے اور زور سے رونا شروع کیا جس سے محل میں جشن کی آواز ڈوب گئی۔

درجنوں لوگوں نے بورے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" یوسف نے اپنی مشعل سے راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

ایک چھتنارے درخت کے نیچے بورا رکھا گیا۔ لوگ خاموشی سے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

یوسف نے ایک چاقو نکالا اور احتیاط سے بورے کو لمبائی میں کاٹا، غور سے مردے کا چہرہ دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں اور زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

علی یوسف کی مدد کے لیے لپکا تو وہ بھی اسی طرح متحیر کھڑا رہ گیا۔ اس نے اکڑوں بیٹھ کر دیکھا، اس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی اور وہ چت گر پڑا۔ اس کی موٹی توند آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

"کیا معاملہ ہے؟" مجمع میں چاؤں چاؤں ہوئی۔ "آؤ دیکھیں، ہمیں دیکھنے دو!"

گُل جان روتی ہوئی لاش پر جھک گئی لیکن کسی نے اس کی طرف مشعل بڑھادی اور وہ خوف و حیرت سے جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

اب آدمی مشعلیں لیے ہوئے چاروں طرف سے جمع ہو گئے۔ تالاب کے کنارے کافی روشنی ہو گئی تھی۔ بہت سی آوازوں کی مشترکہ زبردست چیخ نے رات کی خاموشی کو چکنا چور کر دیا:

"جعفر!"

"یہ تو سُود خور جعفر ہے!"

"یہ خواجہ نصر الدّین تو نہیں ہیں!"

ذرا دیر گھبراہٹ اور انتشار کے بعد ہر ایک نے اچانک غل مچانا شروع کر دیا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے، دھکیلتے، ایک دوسرے کے کاندھوں پر لٹکتے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ گُل جان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ بُڈّھا نیاز اس کو تالاب کے کنارے سے دور لے گیا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ وہ رو اور ہنس رہی تھی۔ وہ شک و شُبہ اور یقین کے درمیان معلّق تھی اور ایک بار پھر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جعفر! جعفر!" مسرت آمیز آوازیں گونج رہی تھیں جنہوں نے دور سے آتی ہوئی محل کی رنگ رلیوں کی آوازوں کو بالکل ڈبو دیا تھا۔ "یہ تو جعفر سُود خور ہے! وہی ہے یہ۔ یہ رہا اس کا رسیدوں کا تھیلا۔"

کچھ دیر بعد کسی کو ہوش آیا اور اس نے مجمع سے عام سوال کیا:

"تو پھر خواجہ نصر الدّین کہاں ہیں؟"

اب یہ سوال سارے مجمع نے دھرایا اور شور ہوا:

"تو پھر خواجہ نصر الدّین کہاں ہیں؟ ہمارے خواجہ نصر الدّین کہاں ہیں؟"

"یہاں ہیں!" ایک جانی پہچانی پر سکون آواز آئی۔ اور سب اس طرف مُڑ گئے۔ خواجہ نصر الدّین کو زندہ دیکھ کر وہ حیرت میں رہ گئے۔ ان کے ساتھ کوئی پہرے دار نہ تھا۔ وہ ان کی طرف اطمینان سے جماہیاں اور انگڑائیاں لیتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ خواجہ قبرستان کے قریب سو گئے تھے اسی لیے اتنی دیر سے یہاں پہنچے تھے۔

"میں یہاں ہوں۔" انہوں نے دہرایا۔ "جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے یہاں آ جائے۔ بخارا کے محترم باشندو، آپ یہاں تالاب پر کیوں جمع ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

"کیوں؟ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟" سینکڑوں آوازوں نے کہا۔ "خواجہ نصر الدّین، ہم یہاں آئے تھے آپ کو آخری بار الوداع کہنے، آپ کے لیے ماتم کرنے اور آپ کو دفن کرنے۔"

"مجھ کو؟" انہوں نے پوچھا۔ "میرے لیے ماتم کرنے؟ بخارا کے شریف باشندو آپ خواجہ نصر الدّین کو نہیں جانتے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا مرنے کا ارادہ ہے! میں تو صرف آرام کرنے کے لیے قبرستان کے قریب لیٹ گیا تھا اور آپ سمجھنے لگے کہ میں مر گیا!"

ابھی وہ اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ چائے خانے کا مالک علی اور آہن گر یوسف خوشی سے چیخیں مار کر ان سے اس طرح لپٹ گئے کہ بس جان بچانا مشکل ہو گئی۔ نیاز نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ جلد ہی دھکم پیل میں پیچھے رہ گیا۔ خواجہ نصر الدّین ایک بڑے مجمع میں گھرے تھے جہاں ہر شخص ان سے گلے ملنا اور ان کو خوش آمدید کہنا چاہتا تھا اور وہ ہر ایک سے گلے ملتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے گُل جان کی بے چین

اور غصّے سے بھری ہوئی آواز آرہی تھی جو بھیڑ میں اُن تک پہنچنے کی بے سُود کوشش کر رہی تھی۔ اور آخر کار جب وہ ایک دوسرے سے دوچار ہوئے توگُل جان نے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ خواجہ نصر الدّین نے اس کی نقاب اُٹھائی اور سارے مجمع کے سامنے اس کو چوم لیا اور وہاں پر موجود کسی بھی آدمی کو، ان لوگوں کو بھی جو رسم و رواج کے بڑے حامی تھے یہ بات بُری نہیں معلوم ہوئی۔

خواجہ نصر الدّین نے ہاتھ اُٹھا کر لوگوں سے خاموش رہنے اور اپنی طرف متوجّہ ہونے کے لیے کہا:

"آپ میرا ماتم کرنے آئے تھے، بخارا کے شریف باشندو! آپ نہیں جانتے کہ میں امر ہوں؟"

ہوں میں خواجہ نصر الدّین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

وہ سنسناتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں کھڑے تھے۔ مجمع نے دھن اٹھائی جو رات کی تاریکی میں لپٹے ہوئے بخارا میں پر مسرت لہر کی طرح پھیل گئی۔

ہوں میں خواجہ نصر الدّین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

اس خوشی کا محل کی رنگ رلیوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔

"ہمیں بتایئے۔" کسی نے چلّا کر پوچھا۔ "کہ آپ نے اپنے بجائے جعفر سُود خور کو ڈبونے کا کام کیسے کیا؟"

"آہ!" خواجہ نصر الدّین کو اچانک یاد آ گیا۔ "یوسف، تم کو میری قسم یاد ہے نا؟"

"ہاں، ضرور۔" یوسف نے جواب دیا۔ "اور آپ نے اسے پورا کیا، خواجہ نصر الدّین!"

"وہ کہاں ہے؟" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "سُود خور کہاں ہے؟ تمہیں اس کا تھیلا مل گیا؟"

"نہیں، ہم نے اس کو چھوا نہیں۔"

"ارے!" خواجہ نصر الدّین نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "بخارا کے باشندو! آپ کے خیالات بہت شریفانہ ہیں لیکن سمجھ میں ذرا خامی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اگر یہ تھیلا سُود خور کے وارثوں کو مل گیا تو وہ آپ سے قرض کا ایک ایک پیسہ وصول کر لیں گے؟ لائیے یہ تھیلا مجھے دیجیے۔"

درجنوں آدمی دھکم پیل کرتے اور غُل مچاتے اُن کا حکم پورا کرنے دوڑے۔ انہوں نے بھیگا تھیلا لا کر خواجہ نصر الدّین کو دے دیا۔

انہوں نے ایک پرونوٹ اٹکل پچو نکال لیا۔

"محمد زین ساز!" انہوں نے زور سے پکارا۔ "محمد زین ساز کون ہے؟"

"میں۔" ایک دھیمی کانپتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ مجمع سے ایک پستہ قد بُڈّھا نکلا جس کے چھدری داڑھی تھی۔ وہ ایک انتہائی پھٹی پرانی رنگین قبا پہنے تھا۔

"محمد زین ساز اس پرونوٹ کے مطابق تم کو کل پانچ سو تانگے ادا کرنا ہیں۔ لیکن میں، خواجہ نصرالدّین تمہارا قرض منسوخ کرتا ہوں۔ یہ رقم تم اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرو اور اپنے لیے ایک نئی قبا خرید لو۔ تمہاری قبا تو بس کپاس کے تیّار کھیت کا منظر پیش کرتی ہے، ہر جگہ روئی نکلی ہوئی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے پرونوٹ کے پرزے پرزے کر دیے۔

خواجہ نصرالدّین نے یہی گت سب پرونوٹوں کی بنائی۔

جب آخری پرونوٹ پرزے پرزے ہو چکا تو خواجہ نصرالدّین نے تھیلا تالاب میں پھینک دیا۔

"اب اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تالاب کی تہہ میں دفن ہو جانے دو!" انہوں نے زور سے کہا۔ "اب اس کو کوئی اپنے کندھے سے نہ لٹکا سکے گا۔ بخارا کے شریف باشندو! انسان کے لیے ایسا تھیلا لے کر چلنے سے زیادہ کوئی ذلّت نہیں ہو سکتی۔ آپ کے لیے چاہے جو کچھ کیوں نہ ہو جائے، چاہے آپ دولت مند ہو جائیں، جس کی اُمّید ہمارے آفتاب جیسے امیر اور اس کے نگراں وزیروں کی زندگی میں نہیں ہے، لیکن اگر ایسا کبھی ہو اور آپ میں سے کوئی دولت مند ہو جائے تو ایسا تھیلا لے کر کبھی نہ چلنا۔ ورنہ وہ اپنے کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو چودہ پیڑھیوں تک ابدی ذلّت میں مبتلا کر دے گا! اسے یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس دنیا میں خواجہ نصر الدّین کا بھی وجود ہے جس کا ہاتھ بہت سخت ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے جعفر سُود خور کو کیا سزا دی ہے۔ اب میں آپ سے رُخصت ہوں گا، بخارا کے شریف باشندو۔ مجھے ایک طویل سفر درپیش ہے۔ گُل جان تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"میں تمہارے ساتھ جہاں کہو گے چلوں گی۔" گُل جان نے جواب دیا۔

بخارا کے باشندوں نے خواجہ نصر الدّین کو شاندار طور پر الوداع کہا۔ کارواں سرائے کے مالک ان کی دلہن کے لیے روئی جیسا سفید گدھا لائے۔ اس کی کھال پر ایک بھی سیاہ داغ نہ تھا اور وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے بھورے بھائی، خواجہ نصر الدّین کی آوارہ گردیوں کے پرانے اور وفادار رفیق کے برابر کھڑا چمک رہا تھا۔ بھورے گدھے کو اپنے شاندار رفیق پر ذرا بھی رشک نہیں تھا اور وہ اطمینان سے مزیدار گھاس کھا رہا تھا اور اپنے تھوتھن سے سفید گدھے کو دھکا بھی دیتا جاتا تھا جیسے وہ دکھانا چاہتا ہو کہ رنگ میں اس کی ناقابل تردید برتری کے باوجود سفید گدھا خواجہ نصر الدّین کی خدمت میں اس کا پاسنگ نہیں ہو سکتا۔

آہن گر اپنی بھٹی وغیرہ وہیں لائے اور دونوں گدھوں کے نعلیں لگائیں۔ زین سازوں نے دو زینیں بطور تحفہ پیش کیں۔ ایک مخمل سے سجی ہوئی خواجہ نصر الدّین کے لیے تھی اور دوسری چاندی سے مرصع گُل جان

کے لیے۔ چائے خانے کے مالک دو چائے دان اور دو چینی کے بہت نفیس پیالے لائے۔ اسلحہ سازوں نے خواجہ نصر الدّین کو مشہور گورا فولاد کی تلوار دی تاکہ وہ اپنے آپ کو راہزنوں سے بچا سکیں۔ قالین بنانے والے ان کے لیے زین پوش لائے، کمند سازوں نے گھوڑے کے بالوں کی بنی ہوئی کمند دی۔ یہ کمند جب کسی سونے والے مسافر کے گرد بچھا دی جاتی ہے تو وہ زہریلے سانپوں سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ سانپ چبھنے والے بالوں کے اوپر نہیں رینگتے۔

بنکروں، ٹھٹھیروں، درزیوں اور موچیوں، غرض سب نے تحفے دیے۔ ملاؤں، عمائدین اور صاحب جائیداد لوگوں کے علاوہ سارے شہر بخارا نے خواجہ نصر الدّین کے سفر کے لیے نئے ساز و سامان مہیا کیا۔

کمہار الگ افسردہ کھڑے تھے۔ ان کے پاس تحفے کے لیے کچھ نہ تھا۔ آدمی مٹّی کی صراحی کا کیا کرے گا جب کہ ٹھٹھیروں نے ان کو پیتل کی صراحی دی تھی؟

اچانک سب سے بڈّھے کمہار نے جس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی کہا "کون کہتا ہے کہ ہم کمہاروں نے خواجہ نصر الدّین کو کچھ نہیں دیا ہے۔ کیا ان کی دلہن، یہ حسین دوشیزہ، کمہاروں کی مشہور اور لائق برادری کی نہیں ہے؟"

کمہاروں نے خوش ہو کر زور کا نعرۂ مسرّت بُلند کیا۔ پھر انہوں نے گُل جان کو اچھی طرح نصیحت کی کہ وہ خواجہ نصر الدّین کی وفادار اور پُرخلوص رفیقۂ حیات بنے اور اپنی برادری کے لوگوں کی شہرت اور عزّت کو بٹہ نہ لگائے۔

"صُبح صادق کا وقت ہونے والا ہے۔" خواجہ نصر الدّین نے کہا۔ "جلد ہی شہر کے پھاٹک کھُل جائیں گے۔ مجھے اور میری دلہن کو چپکے سے نکل جانا چاہیے۔ اگر آپ سب مجھے رُخصت کرنے آئے تو پہرے داروں کو خیال ہو گا کہ شاید بخارا کے سارے باشندے کہیں اور آباد ہونے جا رہے ہیں اور وہ پھاٹک بند کر لیں گے، کسی کو بھی باہر نہ جانے دیں گے۔

اس لیے آپ اپنے اپنے گھروں کو جائیے۔ میری دُعا ہے کہ آپ سکھ چین کی نیند سوئیں، آپ پر مصیبت کا منحوس سایہ کبھی نہ پڑے اور کامیابیاں آپ کے ہمراہ رہیں! خواجہ نصر الدّین اب آپ سے رُخصت ہوتا ہے۔ کتنی مدّت کے لیے؟ یہ میں خود نہیں جانتا۔"

مشرق میں ایک چھوٹی، مشکل سے دکھائی دینے والی روشنی کی ہلکی پٹّی نمودار ہو رہی تھی۔ تالاب سے ہلکا سا کہرا اُٹھ رہا تھا۔ مجمع منتشر ہونے لگا۔ لوگ مشعلیں بجھا رہے تھے اور زور زور سے کہہ رہے:

"سفر بخیر، خواجہ نصر الدّین! اپنے وطن کو نہ بھولیے گا!"

آہن گر یوسف اور چائے خانے کے مالک علی سے رُخصت کا منظر خاص طور پر متاثر کن تھا۔ موٹا علی اپنے آنسو نہ روک سکا، وہ اس کے گول سُرخ رخساروں پر بہہ نکلے۔

خواجہ نصر الدّین پھاٹک کھلنے کے وقت تک نیاز کے گھر میں ٹھہرے رہے۔ جیسے ہی مؤذن کی پُر سوز آواز شہر میں گونجی خواجہ نصر الدّین اور گُل جان اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ نیاز ان کے ساتھ قریب کے موڑ تک گیا۔ اس کے آگے خواجہ نصر الدّین نے اس کو نہیں آنے دیا اور بُڈّھا آنکھوں میں آنسو بھرے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ موڑ پر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ صُبح کی ٹھنڈی ہوا چلی اور اس نے سڑک پر سارے نشانات مٹا دیے۔

نیاز جلدی سے گھر واپس ہوا اور چھت پر چڑھ گیا۔ وہاں سے بہت دور تک شہر کی فصیلوں کے پار دکھائی دیتا تھا اور وہ بڑی دیر تک اپنی بوڑھی آنکھوں پر زور دے کر، بے اختیار آنسوؤں کو پونچھ کر بادامی رنگ کی دھوپ سے جھلسی ہوئی پہاڑیوں کی طرف دیکھتا رہا جن کے درمیان سڑک کا بھورا فیتہ دور لہراتا ہوا چلا گیا تھا۔ وہ اتنی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ

آخر میں پریشان ہو گیا۔ کیا خواجہ نصر الدّین اور گُل جان پہرے داروں کے ہاتھ آ گئے؟

لیکن آخر کار اس کو دور فاصلے پر دو دھبّے دکھائی دیے، ایک سفید اور دوسرا بھورا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتے اور چھوٹے ہوتے گئے۔ جلد ہی بھورا دھبّہ پہاڑیوں میں مل جُل کر غائب ہو گیا لیکن سفید دھبّہ کافی دیر تک رہا۔ وہ گہرائیوں اور خموں میں غائب ہو جاتا اور پھر نمودار ہوتا۔ پھر وہ بھی گرمی کے بڑھتے ہوئے دُھند میں غائب ہو گیا۔

دن چڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ گرمی بھی بڑھ رہی تھی۔ بُڈّھا گرمی سے بے نیاز غمگین خیالات میں ڈوبا ہوا چھت پر بیٹھا رہا۔ اس کا سفید سر ہل رہا تھا اور گلا رندھا جا رہا تھا۔ اس کو خواجہ نصر الدّین اور اپنی بیٹی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ان کی خوشی و سلامتی کا خواہاں تھا لیکن اس کو اپنے اوپر افسوس آ رہا تھا۔ اب اس کا گھر خالی ہو گیا تھا اور اب اپنے زندہ دلانہ گیتوں اور قہقہوں سے اس کی زندگی میں خوشی لانے والا کوئی نہیں رہا

تھا۔ گرم ہوا چلنے لگی، انگور کی بیلوں میں سر سراہٹ شروع ہو گئی اور گرد اُڑنے لگی۔ ہوا کے پروں نے چھت پر سوکھتے ہوئے برتنوں کو چھوا اور وہ باریک اور فریاد آمیز آواز میں بج اُٹھے جیسے وہ گھر سے جانے والوں کے لیے غمگین ہوں۔

نیاز اپنے پیچھے ایک دھیمی سی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا کہ تین بھائی جو پڑوس میں رہتے تھے ایک دوسرے کے پیچھے زینوں پر چڑھ رہے تھے۔ وہ خوب تندرست خوبصورت نوجوان تھے اور سبھی کمہار تھے۔ وہ قریب آکر احترام کے ساتھ جھکے۔

"محترم نیاز۔" سب سے بڑا بھائی بولا۔ "آپ کی بیٹی خواجہ نصرالدّین کے ساتھ رُخصت ہو گئی لیکن رنجیدہ اور پریشان نہ ہوں کیونکہ دنیا کا یہی قانون ہے۔ جب ہرنی ہرن کے بغیر نہیں، گائے بیل کے بغیر اور بطخ بلا نر کے نہیں رہ سکتی تو کیا کوئی دوشیزہ بلا کسی سچے اور پُر خلوص رفیق کے رہ

سکتی ہے؟ کیا اللہ نے دنیا کی تمام چیزوں میں جنسی تفریق نہیں کی ہے حتیٰ
کہ کپاس کے پودوں کی شاخوں تک میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔

"بہر حال، ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو بڑھاپے میں رنج پہنچے اس لیے ہم
تینوں نے آپ سے یہ کہنے کا فیصلہ کیا ہے کہ جس کا رشتہ خواجہ نصرالدّین
سے ہوا وہ بخارا کے تمام باشندوں کا رشتہ دار بن گیا اور اب آپ ہمارے
رشتہ دار ہو گئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے سال ہم نے اپنے باپ اور
آپ کے دوست محترم و معظم عثمان علی کو کس رنج و غم کے ساتھ سپرد
خاک کیا تھا اور اب ہمارے آتش دان کے قریب ایک جگہ بزرگ
خاندان کے لیے خالی ہے اور ہم اب اس روزمرّہ کی خوشی سے محروم ہو
گئے ہیں کہ کسی سفید داڑھی کی زیارت کر سکیں جس کے بغیر بچّے کی چیخ
پکار کی طرح گھر خالی خالی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آدمی کی روح کو اسی
وقت سکون ملتا ہے جب وہ ایسے صاحبِ ریش آدمی کے پاس ہوتا ہے

جس نے اس کو جنم دیا ہے اور اس کے یہاں پالنے میں وہ جھولتا ہے جس کو خود اس نے جنم دیا ہے۔

"اس لیے ، محترم نیاز! ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارے آنسوؤں کو دیکھیں اور ہماری درخواست سے انکار نہ کریں۔ ہمارے گھر آیئے اور آتش دان کے قریب وہ جگہ لیجیے جو بزرگ خاندان کے لیے مخصوص ہے۔ ہم تینوں کے باپ بنئے اور ہمارے بچّوں کے دادا۔"

ان بھائیوں نے اتنا اصرار کیا کہ نیاز کو انکار کرتے نہ بنا۔ وہ ان کے گھر گیا اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس طرح اس کو بڑھاپے میں ایسی ایماندارانہ اور پاکیزہ زندگی نصیب ہوئی جو ایک مسلمان کے لیے اس دنیا میں ممکن ہے۔ وہ اب ایک بڑے خاندان کا بزرگ بن کر جس میں چودہ ناتی پوتے تھے۔ نیاز بابا ہو گیا تھا۔ وہ انگور اور شہتوت کے رس سے بھرے گلابی گالوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اس دن سے

اس کے کان خاموشی سے کبھی نہیں اُکتائے۔ کبھی کبھی وہ شور و غل سے گھبرا جاتا تو اپنے پرانے گھر آرام کے لیے چلا جاتا اور ان دونوں کو افسردگی سے یاد کرتا جو اس کے دل کے اتنے قریب تھے اور اب کہیں دور دراز کسی انجانی جگہ چلے گئے تھے۔

بازار کے دن وہ بازار جاتا اور کاروانوں میں جو دنیا کے تمام کونوں سے بخارا آتے تھے پوچھتا کہ کیا سڑک پر کہیں ان کی ملاقات دو مسافروں سے ہوئی۔ مرد ایک بھورے گدھے پر تھا اور عورت بے داغ سفید گدھے پر؟ ساربان اپنی سورج سے سنولائی ہوئی پیشانی پر بل ڈال کر سر ہلاتے کہ ان کی ملاقات ایسے لوگوں سے نہیں ہوئی۔

خواجہ نصر الدّین حسبِ معمول بلا کسی پتے نشان کے غائب ہو گئے تھے تاکہ وہ پھر کہیں ایسی جگہ نمودار ہوں جہاں ان کی توقع بالکل نہ کی جاتی ہو۔

باب آخر

(جو ایک نئی کتاب کی ابتدا کا کام کر سکتا ہے)

”میں نے سات سفر کیے

اور ہر سفر کے بارے میں

ایک ایسی غیر معمولی داستان

ہے جو ذہن کو بے چین

کر دیتی ہے۔“

(الف لیلہ)

اور وہ پھر نمودار ہوئے، ایسی جگہ جہاں سب سے کم توقع کی جاتی تھی۔ وہ استنبول میں دکھائی دیے۔

یہ واقعہ امیر بخارا کا خط ترکی کے سلطان کو ملنے کے تین دن بعد ہوا۔ سینکڑوں نقیبوں نے عظیم سلطنت کے شہروں اور گاؤں میں خواجہ نصر الدّین کی موت کا اعلان کیا۔ ملاؤں نے خوش ہو کر مسجدوں میں صُبح شام دن میں دو بار امیر کا خط پڑھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ سلطان نے محل کے باغ میں جشن کیا۔ وہ پوپلر کے درختوں کے خنک سائے میں بیٹھا تھا، فوّاروں کی ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف وزرا، عقلا، شعرا اور شاہی عملے کا مجمع تھا، سب لالچ سے شاہی داد و دہش کے متوقع تھے۔ حبشی غلام ان لوگوں کے درمیان بھاپ اُٹھتی ہوئی کشتیاں، حُقّے اور صراحیاں لیے ہوئے آ جا رہے تھے۔ سلطان بہت خوش تھا اور برابر ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

"آج گرمی کے باوجود فضا میں خوشگوار لطافت اور مہک کیوں ہے؟" اس نے عقلا اور شعرا سے چالاکی سے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا۔

"کون اس سوال کا معقول جواب دے سکتا ہے؟" اور انہوں نے لالچ کے ساتھ اس تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے جو سلطان کے ہاتھ میں تھی جواب دیا۔

"شہنشاہ معظم کی سانس نے فضا میں سرایت کر کے یہ لطافت پھیلا دی ہے اور مہک کی وجہ یہ ہے کہ آخر کار خواجہ نصر الدّین کی ناپاک روح کا تعفّن ختم ہو گیا ہے جو دنیا کو زہر آلود کر رہا تھا۔"

تھوڑی دور پر محل کے پہرے داروں کا کمان دار، استنبول کے امن و امان کا محافظ کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے۔ وہ اپنے ہم پیشہ بخارا کے ارسلان بیک سے اتنا مختلف ضرور تھا کہ وہ اس سے زیادہ ظالم اور غیر معمولی طور پر دُبلا پتلا تھا۔ اس کی یہ دونوں باتیں اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہو گئی تھیں کہ استنبول کے شہریوں نے ان کو بہت

دن پہلے ہی تاڑ لیا تھا اور وہ محل کے حمام کے خدمتگاروں سے ہر ہفتے پوچھتے رہتے تھے کہ کمان دار کا وزن گھٹا یا بڑھا ہے۔ اگر خبر خراب ہوتی تو محل کے قریب رہنے والے بلا کسی سخت ضرورت کے گھروں کے باہر آئندہ حمام کے دن تک نہ نکلتے۔ تو اب یہ ہیبت ناک ہستی ذرا دور پر استادہ تھی۔ اس کے سر پر عمامہ تھا اور وہ اس طرح اس کی لمبی اور سوکھی گردن پر ابھرا ہوا تھا جیسے بانس پر لٹکا ہو (استنبول کے بہت سے شہری اس تشبیہ کو سُن کر پُراسرار طریقے پر آہ بھرتے)۔

سب کچھ مزے میں چل رہا تھا، جشن زوروں پر تھا اور کسی انتشار کا گمان تک نہ تھا۔ کسی نے اس بات کی طرف توجّہ نہیں کی کہ محل کا داروغہ اپنی حسبِ معمول پھُرتی کے ساتھ چپکے سے درباریوں کے مجمع سے نکلا اور محل کے پہرے داروں کے کمان دار کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ کمان دار چونک پڑا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ جلدی سے داروغہ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

چند منٹ میں وہ واپس آ گیا۔ وہ زرد ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ درباریوں کو ہٹاتا ہوا وہ سلطان کے پاس پہنچا اور دہرا ہو کر تعظیم بجالایا:

"سلطان معظّم۔۔۔!"

"ہاں، کیا ہے؟" سلطان نے ناگواری کے انداز میں پوچھا۔ "کیا تم آج کے دن بھی جیل اور سزاؤں کی خبریں اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتے؟ اچھا، بولو!"

"مقدس و معظّم سلطان، میری زبان سے الفاظ نہیں نکلتے۔۔۔"

سلطان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔ کمان دار نے چپکے سے کہا:

"وہ استنبول میں ہے!"

"کون؟" سلطان نے درشت آواز میں پوچھا، حالانکہ وہ فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ کس سے مطلب ہے۔

"خواجہ نصر الدّین!"

کمان دار نے یہ نام بہت دھیمے سے لیا تھا لیکن درباریوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ سارے محل میں مُنہ ہی مُنہ میں یہ بات پھیل گئی:

"خواجہ نصر الدّین استنبول میں! خواجہ نصر الدّین استنبول میں!"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" سلطان نے پوچھا۔ اس کی آواز اچانک بھرّا گئی تھی۔ "تم سے کس نے کہا؟ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ امیرِ بخارا نے اپنے خط میں شاہانہ الفاظ سے اس کا یقین دلایا ہے کہ خواجہ نصر الدّین اب زندہ نہیں ہے؟"

کمان دار نے محل کے داروغہ کو اشارہ کیا جو سلطان کے پاس ایک آدمی کو لے گیا جس کی ناک چپٹی تھی، چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور ناچتی ہوئی زرد آنکھیں تھیں۔

"سلطان معظم!" کمان دار نے وضاحت کی۔ "یہ آدمی امیرِ بخارا کے دربار میں بہت دنوں تک جاسوس کی خدمات سر انجام دے چکا ہے اور خواجہ نصر الدّین کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جب یہ شخص استنبول آیا تو میں نے اس کو جاسوس کی حیثیت سے نوکر رکھ لیا اور وہ اس وقت بھی اپنے اس منصب پر ہے۔"

"تم نے اس کو دیکھا؟" سلطان نے بات کاٹتے ہوئے جاسوس سے پوچھا۔ "کیا تم نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

جاسوس نے ہاں میں جواب دیا۔

"شاید تم سے غلطی ہوئی ہو؟"

جاسوس نے نفی میں جواب دیا۔ وہ غلطی نہیں کر سکتا۔ خواجہ نصر الدّین کے ساتھ ایک عورت سفید گدھے پر سوار تھی۔

"تم نے اس کو اسی جگہ کیوں نہ گرفتار کر لیا؟" سلطان چلّایا۔ "تم نے اس کو پہرے داروں کے حوالے کیوں نہیں کر دیا؟"

"جہاں پناہ!" گھٹنوں کے بل گر کر گڑ گڑاتے ہوئے جاسوس نے جواب دیا۔ "بخارا میں ایک بار میں خواجہ نصر الدّین کے ہاتھ آ گیا اور پھر یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ میری جان بچ گئی۔ آج صُبح کو جب میں نے اس کو استنبول کی سڑکوں پر دیکھا تو خوف سے میری آنکھوں پر اندھیرا چھا گیا اور جب میں اپنے ہوش میں آیا تو وہ جا چکا تھا۔"

"تو یہ ہیں تیرے جاسوس!" تعظیم سے جھکے ہوئے کمان دار کی طرف دیکھتے ہوئے لال بھبوکا سلطان نے کہا۔ "کسی مجرم کو دیکھتے ہی ان کے حواس جاتے رہتے ہیں!"

اس نے چیچک رو جاسوس کو حقارت سے لات مار کر الگ کر دیا اور خود خلوت خانے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے حبشی غلاموں کی ایک لمبی قطار تھی۔

وزرا، عمائدین، شعرا اور عقلا سب آپس میں چاؤں چاؤں کرتے باہر جا رہے تھے۔ چند منٹ میں کمان دار کے سوا ایک نفس بھی باغ میں نہیں رہ گیا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتا رہا اور پھر ایک سنگِ مرمر کے فوّارے کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھا پانی کی ہلکی بلبلاہٹ اور ہنسی سنتا رہا۔ اچانک سکڑ کر وہ اتنا دبلا ہو گیا تھا کہ اگر استنبول کے لوگ اس کو دیکھتے تو اپنے جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

اس دوران میں چیچک رو جاسوس بے تحاشا سڑکوں پر بھاگتا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک عرب جہاز روانگی کے لیے تیّار کھڑا تھا۔ جہاز کے کپتان کو قطعی یقین ہو گیا کہ وہ کوئی قیدی ہے جو بھاگ رہا ہے اس لیے اس نے ایک بڑی رقم طلب کی۔ جاسوس بلا طے توڑ کیے عرشے پر

آیا اور پھر ایک تاریک اندھیرے کونے میں گڑمڑا کر پڑ گیا۔ بعد کو جب استنبول کے چھریرے اور سڈول مینار نیلے دُھند میں غائب ہو گئے اور تازہ ہوا بادبانوں میں بھرنے لگی تو وہ اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا، پورے جہاز کا چکّر لگایا، ہر چہرے کو غور سے دیکھا اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ خواجہ نصر الدّین جہاز پر نہیں ہیں تو اسے اطمینان ہوا۔

اس دن سے اس چیچک رو جاسوس کی زندگی متواتر خوف وہراس میں بسر ہونے لگی۔ جس شہر بھی وہ گیا خواہ وہ بغداد ہو یا قاہرہ، تہران یا دمشق، کسی جگہ بھی تین مہینے سے زیادہ نہ ٹھہر سکا کیونکہ خواجہ نصر الدّین اس شہر میں ضرور نظر آتے اور جاسوس ان کی مُڈ بھیڑ کے ڈر سے اور آگے بھاگتا۔ یہاں خواجہ نصر الدّین کا مقابلہ اس زبردست طوفان سے کرنا غلط نہ ہو گا جو اپنے آگے آگے اس مُرجھائی ہوئی زرد پتّی کو اُڑائے اُڑائے پھرتا ہے جس کو وہ گھاس سے، دراڑوں اور خولوں سے نکال لیتا ہے۔ اس

طرح چیچک رو جاسوس کو ان تمام برائیوں کی سزا ملی جو اس نے دوسرے لوگوں کے ساتھ کی تھیں۔

دوسرے ہی دن سے استنبول میں غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعات شروع ہو گئے۔۔۔ لیکن جو باتیں کسی نے ذاتی طور پر نہ دیکھی ہوں ان کی بابت کچھ نہ کہنا چاہیے اور جو ملک خود اس نے نہ دیکھے ہوں اس کی بابت نہ لکھنا چاہیے۔ اس لیے ان الفاظ کے ساتھ ہم اپنی کہانی کا آخری باب مکمل کرتے ہیں، جو استنبول، بغداد، تہران، دمشق اور بہت سے دوسرے مشہور شہروں میں خواجہ نصر الدّین کے مزید کارناموں کے بارے میں نئی کتاب کے ابتدائی باب کا کام دے سکتا ہے۔

ختم شد